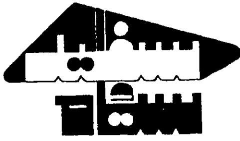
سب رنگ

ڈائجسٹ





ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر کے تجربات

زندگی کی لکیر ———— سراج احمد چشتی

دلچسپ اور عبرت انگیز واقعہ

ایک خزانے کے اغوا کی دلچسپ روداد
جس کی سُراغ رسی دُنیا کے ایک ذہین ترین شخص نے کی

خزانے کا اغوا ———— حسن ضمیر

سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

انکا ———— جمیل احمد خان

ممکن ہے ایسا واقعہ آپ نے پہلے نہ پڑھا ہو



منتخب کارٹون، اقتباسات، دلچسپ واقعات
اور لطائف، مختلف صفحات پر۔

اس ماہ کی خاص کہانی ———— مُحمّد اسلم شاہد



شمارہ: ۱ — فی پرچہ: ۲ روپے
جلد: ۴ — زرِ سالانہ: ۱۲ روپے

سرِورق طباعت ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ۔ ایس آئی ٹی ای۔ کراچی

پبلشر شکیل عادل زادہ
نے قاسم نورانی کے اہتمام میں "پاکستان ہیرالڈ پریس" ضیاء الدین روڈ
کراچی سے چھپوا کر ۵ سی، ۴/۱۳ ناظم آباد کراچی سے شائع کیا

پتا: ۴۷ — ۴۸ پریس چیمبرز، آئی۔ آئی چندریگر روڈ، کراچی
فون: ۲۲۵۸۴۴-۴
ذیلی دفتر: لطیف ہاؤس، کرشن پورہ، پشاور

اندھا سوداگر

ALL EYES ARE FOCUSSED ON THE MAN WITH NO EYES...



THE MAN THEY CALLED

"BLINDMAN"

پلازہ لاہور

TONY ANTHONY

RINGO STARR

بمبینو کراچی

COLORSCOPE

Zahid

انقلاب

ابھی دور ہے اس لیے کہ شعورِ انقلاب ابھی دور ہے۔ جو لوگ انقلاب کے لیے کام کر رہے ہیں وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر رہے۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کی سرشوریوں کے پھل ان کی نسلیں کھائیں گی۔ ابھی ہمارے علاقوں کے انسانوں نے خود کو شناخت نہیں کیا ہے تاہم ایک فضا انقلاب کی ہموار ہو رہی ہے، جب انسان خود کو شناخت کرنے لگیں تو انقلاب قریب آ جاتا ہے۔

یوں حکومتوں کی تبدیلیاں انقلاب کی پیش خیمہ نہیں ہوتیں، انقلاب تو ایک معاشرتی ردّوبدل اور ہمہ سمت ہمہ جہت تبدیلی کا نام ہے، حکومتیں آئے دن تبدیل ہوتی رہتی ہیں مگر انقلاب شاذ و نادر ہی برپا ہوتا ہے۔

اگر ہم اس خوش اعتقادی میں مبتلا ہیں کہ کچھ اور لوگ آ جائیں گے تو ہماری رسوائیاں ختم ہو جائیں گی تو یہ ایک فریب ہے۔ یہاں انقلاب کی تشریح و تعبیر بہت غلط انداز میں کی گئی ہے، کچھ اور لوگ آ جائیں گے تو بھی ہماری حرماں نصیبیوں اور محرومیوں میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ وہ کچھ اور لوگ جن کی ہمیں طلب ہے، ان کے چہرے اور ہوتے ہیں، یہ تو وہی سرخ و سپید، تر و تازہ اور شاداب چہرے ہیں جنھوں نے سونے کے پالنے میں آنکھیں کھولیں اور غلاموں کے خون سے جن کی قبائے خوں رنگ تیار ہوئی۔ یہ چند خوب صورت، خوش لباس اور خوش ذوق لوگ کسی نہ کسی نام، حلیے اور زمانے میں ہم پر اپنی ذہنی و مادی نسلی و تہذیبی برتری کا تسلط جمائے رہے اور ہم نے جن کے سایۂ عاطفت میں صدیاں گزار دیں، بے رنگ مضمحل مجہول اور اعصاب شکن صدیاں۔ انھوں نے ہم سے کہا کہ کیوں اپنے آبا و اجداد کی پاک روحوں کو اذیت میں مبتلا کرتے ہو؟ انھوں نے ہمیں ہماری قدیم تہذیب کی عظمت و شوکت کے حوالے دیے اور ہم سے کہا کہ نوشتۂ تقدیر ناقابلِ تنسیخ ہے۔ ہم ایک پُرجلال ماضی کے امین ہیں، انھوں نے ہمیں ماضی میں رکھا۔ ان کے ہاں بیان کی قدرت تھی، انھیں دلیلیں دینے اور بات کہنے کا فن آتا تھا۔ ہماری سماعت ان کی خوش گفتاری کی عادی ہو گئی۔ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع یوں بھی نہیں ملا کہ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ہم سے کہہ دیا گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خالقِ تقدیر کی طرف سے لکھ دیا گیا ہے، صبر و قناعت کا مآل آسمانوں میں ملتا ہے۔ خود انھوں نے زمین پر جنتیں آباد کر لیں۔

اور جب کچھ سوچنے اور بولنے کا موقع آیا تو زبانیں ہمارے قابو میں نہ رہیں، ہمارے اعصاب شرارتیں کرنے لگے۔ ہم سے بے اعتدالیاں سرزد ہونے لگیں۔ یہ اٹکھیلیاں ایک ترقی پذیر سماج کو راس نہیں آتیں، ہم بھول گئے کہ ہمیں خود اپنے لیے کیا کچھ کرنا ہے، اب ہمیں خود اپنی رہنمائی کرنی ہے، ان سے وفا کی امید بیکار ہے جنھوں نے ایک زمانے تک ہمیں نشانۂ ستم بنایا۔ ہماری اس آوارہ گردی اور غل غپاڑے میں پھر وہی زمانہ ساز لوگ ہمیں بہکانے اور ورغلانے آ گئے۔ انھوں نے نئے عہد کی بو سونگھ کر پینترا بدل لیا ہے لیکن یہ تو وہی لوگ ہیں، ان کے چہرے بدلے ہوتے ہیں، ان کے اندر کے آدمی وہی ہیں، وہی جاگیردار، پیشہ ور سیاست داں، بار ایٹ لا، خاندانی رہنما۔ وہ ہماری زبان میں گفتگو کرنے لگے ہیں، لیکن لہجے کی تبدیلی سے کیا ہوتا ہے؟

انقلاب ابھی دور ہے لیکن اور دور ہو جائے گا اگر ہم نے یہ بار خود نہیں اٹھایا اور یہ ذمے داری خود قبول نہیں کی۔ حکومتیں تبدیل کرنے، تلوّن مزاجی اور تنوع پسندی کے ان مظاہروں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ لوگ چلے جائیں گے تو کچھ اور لوگ آ جائیں گے، یہ شور و غوغا، ہنگامہ آرائی، فتنہ و فساد، خوں ریزی ان لوگوں کی ایما پر ہے جو مسند سے محروم ہو گئے ہیں، یہ لوگ مسند پر جلوہ افروز لوگوں کی خیانتوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ہمیں بھی اس میں ملوث کر کے کسی طور اپنا مقصد حل کرنا چاہتے ہیں، ان کی طلب اقتدار ہے، یہ حرص و طمع کے بندے ہیں، ہمارا کام یہ نہیں ہے، اس طرح تو ہم اپنے آپ کو، اپنے مقصد کو اور اپنے ملک کو کمزور کر رہے ہیں، ہم کب تک مخصوص افراد و گروہ کے مقاصد کے معمول بنتے رہیں گے، یہ سیاہ بھیڑیں انقلاب کی منزل میں سدِّ راہ ہیں، انقلاب تو خود ہماری صفوں سے پیدا ہوگا۔ انقلاب اس وقت برپا ہوگا جب ہم اس سرزمین کے بیکس اور نادار لوگوں کو قدامت اور ماضی پرستی کے اندھیروں سے نکالنے کا کام کریں گے۔ ہم شدید محنت کریں گے، شدت سے سوچیں گے۔ اجتماع کا احترام ہمارا ایمان ہوگا۔ پہلے تو ہمیں خود سے جنگ کرنی ہو گی۔ وہ لوگ موجود ہیں جو انقلاب کے سلسلے میں مخلص ہیں لیکن ہماری آنکھوں پر دھند چھائی ہوئی ہے، یہ غنودگی اور غفلت جتنی دیر قائم رہے گی، ہمارا نوشتۂ تقدیر اتنا ہی سیاہ رہے گا۔



کیوی کلینزر





کیوی میٹل پالش (لیکوئڈ)

چمک اور حفاظت کے لئے



کیوی میٹل پالش (پیسٹ)

دُنیا کی مقبول ترین



کیوی وائٹ کلینزر (پیسٹ)



کیوی
مصنوعات



کیوی شو کریم



کیوی وائٹ (لیکوئڈ)

پرویز انڈسٹریل کارپوریشن لمیٹڈ
بہ اشتراک
کیوی پالش کمپنی (پروپرائٹری) لمیٹڈ
مُحمّدی ہاؤس میکلوڈ روڈ کراچی
فون: ۲۲۰۴۰۲ - ۲۲۰۵۰۲



کیوی شو کریم (پیسٹ)



کیوی پلیٹ پاؤڈر



کیوی ویکس



کیوی کار پالش

PI-3/66



ذاتی صفحہ

کچھ دیر کے لیے مجھے محسوس کیجیے۔

لفظوں میں کیا رکھا ہے، یہ تو فنکاری کی بات ہے۔ اظہار میں تمکنت ہو، جذبے میں سرکشی ہو، بیان میں زور ہو، لہجہ بلیغ، انداز والہانہ ہو تو کیا ہوتا ہے۔ اس کا اثر عارضی ہوتا ہے۔ اصل شرط تو گداز ہے۔ اصل معاملہ تو ان لہروں کا ہے جو احساس منتقل کرسکتی ہیں۔ یہ ترسیل شکوہِ لفظی سے ممکن نہیں۔ عشق کاری گری نہیں۔ درونِ جسم کی خلشیں، درونِ ذہن کا کرب تاثر پیدا کرتا ہے۔ آنکھیں بولتی ہیں، بین السطور میں جو نہیں لکھا وہ پڑھ لیا جاتا ہے۔ بس عشق کرنے والوں کے لیے یہی ایک مژدہ جاں ہے کہ وہ اظہار کی قید و بند سے آزاد ہوتے ہیں۔ انھیں لفظوں کی شان دار عمارت تعمیر کرنا نہیں آتی۔ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے چہروں پر درد رقم ہوتا ہے۔ وہ اظہار کے لیے الفاظ منتخب نہیں کرتے، لفظ خود بخود نہ جانے کہاں سے ان کے پاس چلے آتے ہیں اور پیرایۂ اظہار میں ڈھل جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری دیوانگی عشق کے ارفع و اعلا مقام تک پہنچتی ہے یا نہیں لیکن جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ اثر مرتب کرتی ہیں، جس کا اظہار کیا جاتا ہے، وہ رگِ جاں میں کسک پیدا کرتا ہے۔ جو محنت کی جاتی ہے اسے مستحسن نظروں سے دیکھا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میری دیوانگی رائیگاں نہیں گئی۔ میں منتقل ہو رہا ہوں، میری سچائیاں منتقل ہو رہی ہیں، میں اسے اپنے عشق کی سند سمجھتا ہوں۔

یہ میرا سب رنگ ہے اور میں ہوں۔ میرے پیچھے تین سال، اور یوں بہت سال ہیں اور یہ جو آپ مجھے برت رہے ہیں۔ آپ کی نظرِ انتخاب کے لیے بہت سے حسین لوگ موجود ہیں مگر آپ میری بدنیتی اور کم مائگی کے باوجود مجھے منتخب کرتے ہیں تو آپ ایک شخص کو اس کی محنتوں کا صلہ دیتے ہیں، اسے سرفراز کرتے ہیں۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مجھے میری کاوشوں کا ثمر مل گیا، سو اب مجھے سو جانا چاہیے۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ میں آپ کے لیے تڑپتا رہتا ہوں آپ میرے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ اس کرب میں ایک عجیب لطف، لذت اور میٹھی میٹھی چبھن محسوس ہوتی ہے اور پھر ہوتا یہ ہے کہ میں یہ یکجائی، یہ کیفیت، یہ رشتۂ رنگیں قائم رکھنے کے لیے آپ ہی کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ آپ کا حصول بہت مشکل چیز ہے۔ آپ کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ آپ بڑے ہرجائی ہیں لیکن میں آپ کی سرشت بدلنے کی تمام تر مساعی جاری رکھوں گا۔ تین سال تک میں آپ کو قریب لانے اور آپ کے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہا ہوں۔ تین سال تک میں آپ پر اور آپ مجھ پر چھائے رہے ہیں۔ اب یہ چوتھے سال کا آغاز ہے۔ دیکھیے اور کیا بہار آتی ہے۔

چوتھے سال کا آغاز ہے۔ اب سب رنگ اشاعت کے اعتبار سے ملک کے ایک بڑے روزنامے کے بعد دوسرا بڑا پرچہ ہے۔ گزشتہ اور موجود شمارے کے درمیان اشاعت میں چھ ہزار کا اضافہ ہوا ہے، جو ایک ریکارڈ ہے۔ اشاعت میں اضافے کے ساتھ ساتھ میری الجھنوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ گزشتہ دو تین مہینے مجھ پر خاصے بھاری گزرے۔ یاروں نے خوب آزمائش کی لیکن میرے رفیقوں انوار صدیقی، شعور انوار حسن ہاشمی اور الیاس سیتاپوری نے مجھ ناتواں کو کھڑے کیے رکھا۔ انوار صدیقی اپنے خسر کے اچانک انتقال کے صدمے سے دوچار تھے اس کے باوجود انھوں نے ادارتی کام میں تمام تر انہماک اور اشتیاق سے میرا ہاتھ بٹایا۔ اقبال مہدی نے شدید بخار کے عالم میں لکیروں کے قالب میں آپ کے لیے حسین چہرے اور دلکش بدن ڈھالے۔ میری ساری جماعت نے مجھے تنہا نہیں رہنے دیا۔ یوسف، افضال، معروف، صابر صاحب، جاوید، اسلم شاہد۔ سب نے تین سال کے عرصے میں ہر موقع پر مجھ سے اپنی گہری وابستگی کا بے پناہ ثبوت دیا۔ یہاں کسی کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ جب کام ہوتا ہے تو یہ سب اپنے گھروں اور عزیزوں سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں اور پھر میری محبوبہ، میرا سب رنگ میرا بانکا سج بن کر آپ کی خدمت میں پہنچتا ہے۔

نئے سال کے لیے کچھ کہنا بیکار ہے۔ ارادہ بہت کچھ کرنے کا ہے، کاغذ کی وہی صورت ہے۔ ملک کے اس سب سے بڑے ماہنامے کو ۳۶ ریم کاغذ کا کوٹا ملتا ہے۔ آپ یہ بات سن کر محظوظ ہوں گے کہ صرف طباعت کے دوران ویسٹیج کا کاغذ پچاس ریم سے زائد ہو جاتا ہے مگر اس صورتِ حال پر آہ وزاری کرنا بے سود ہے۔ کوئی اور بات کیجیے۔

ہاں۔ سب رنگ کے لیے کہانیاں بھیجنے والے حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مسودے ارسال کرتے وقت سب رنگ کے مزاج اور اس کے خانے کا ضرور خیال رکھیں۔ "خانہ" میں معیار کی جگہ استعمال کرتا ہوں۔ یہ کسرِ نفسی نہیں بلکہ معیار کا صحیح متبادل ہے۔ یہ خانے عام انداز سے ہٹے ہوئے کچھ منفرد قسم کے ہیں، اس میں مشکل سے چیزیں فٹ آتی ہیں اور آجاتی ہیں تو انھیں بصد شوق شائع کر دیا جاتا ہے۔ میرے لیے خوبصورت، منفرد کہانیاں لکھیں۔ ایسی کہانیاں جو کہیں شائع نہ ہو سکیں، وہ لکھیں۔ کم لکھنا اور اچھا لکھنا بہتر ہے۔ بہتر ہوگا کہ انتخاب میں پہلے ہی سے عرق ریزی کر لی جائے تاکہ آپ زحمت سے بچے رہیں۔

اس شمارے میں طویل کہانیوں کی اوسط زیادہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں آپ پسند کریں گے کیونکہ ان کے انتخاب میں پوری احتیاط برتی گئی ہے۔

ایک صاحب نے شرط لگائی ہے کہ آخری کاپی آج رات بارہ بجے سے پہلے نہیں جا سکتی۔ میں یہ شرط جیتنا چاہتا ہوں۔ شرط جیتنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ افسوس ہے آپ شیرینی میں شریک نہ ہو سکیں گے لیکن میں نے آپ سے یوں بھی بہت شیریں باتیں کر لی ہیں۔ میں رخصت ہوتا ہوں۔

اب دوسرے صفحات میں آپ بالواسطہ مجھے پڑھیے۔

سومنات کے شکاری

محمود غزنوی کے عہد کی ایک تاثر انگیز سرگزشت

تخت نشینی کے پچیس سال کے اندر ہی محمود غزنوی کی فتوحات کا سلسلہ ہندوستان کے مشرقی حصوں میں کالنجر، ایران کے مغرب میں ہمدان تک، ایشیائے کوچک میں سمرقند تک اور جنوبی حصوں میں کرمان، مکران اور منصورہ تک پھیل چکا تھا۔ اس وقت تک محمود پہلا مسلمان حکمراں تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اس نے ہندوستان کی متحدہ فوجی قوتوں کو اپنی قلیل فوج سے پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ہندوستان میں کالنجر اور گوالیار کی تسخیر کے بعد جب وہ غزنی واپس پہنچا تو اسے اپنے مخبروں سے معلوم ہوا کہ سمندر کے قریب ہندوؤں کی مشہور تیرتھ یاترا سومنات ابھی تک اس کی منتظر ہے۔ ہندوستان کے جن مقدس شہروں اور عبادت گاہوں نے ضربِ محمودی کا مزہ چکھا تھا سومنات والوں کو اس پر کوئی افسوس نہیں تھا بلکہ وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے یہ کہتے تھے کہ اب تک محمود نے جن بتوں کو توڑا تھا، سومنات ان سے ناراض تھا اور اس خفگی کی وجہ سے سومنات نے تباہ و برباد ہونے والے ان بتوں کی کوئی مدد نہ کی تھی، ورنہ سومنات کے برہمنوں کے بقول ان کے سومنات میں اتنی قدرت ضرور موجود تھی کہ وہ ایک پل میں محمود اور اس کے طاقتور لشکر کو تباہ و برباد کر دے۔ سومنات کے پجاری یہ بھی کہتے تھے کہ سومنات دنیا کے تمام بتوں کا بادشاہ ہے اور دوسرے تمام بت یا تو سومنات کے دربان ہیں یا اس کے حاجب اور خدمت گار۔ اس بت کے نام پر اس کے عقیدت مندوں اور پرستاروں نے شہر کا نام بھی سومنات رکھ دیا تھا۔ محمود سومنات کے برہمنوں کی شیخیاں اور تعلّیاں سنتا تو برہم ہو جاتا اور انھیں مزہ چکھانے کے منصوبے بنانے لگتا۔ وہ سومنات کے برہمنوں کے غرور کو خاک میں ملا دینا چاہتا تھا۔ جب اس نے غزنی اور کاٹھیاواڑ کی درمیانی راہوں کے مسافروں سے معلومات حاصل کیں تو سندھ اور راجپوتانے کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے ریگستان کے علم نے کسی حد تک اسے مذبذب کر دیا کیونکہ اسے عبور کیے بغیر سومنات تک پہنچنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا لیکن فتح مندی کے نشے میں سرشار اور کامرانیوں کی بارگاہ میں بار بار باریاب ہونے والا محمود ہمت ہارنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس نے اس مہم کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی اور اپنی ابتدائی کارروائیوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بارہ آدمیوں کا انتخاب کیا، ان درجن بھر آدمیوں میں مختلف پیشوں اور فنون کے ماہرین شامل تھے۔ ان میں کچھ انجینئر تھے جو سومنات کے قلعے کا جائزہ لے کر کچھ خاص رازوں سے محمود کو مطلع کرتے، کچھ فوجی طاقت کا اندازہ لگانے والے ماہر تھے، کچھ عوام میں گھل مل کر انھیں ورغلانے اور پریشان کرنے کے فن میں مہارت رکھنے والے تھے۔ انھی میں علی مردان بھی شامل تھا۔ یہ اٹھائیس تیس سالہ صحت مند جوان اپنے چہرے مہرے سے خاص ہندوستانی لگتا تھا، متھرا میں بارہ تیرہ سال گزارنے کی وجہ سے یہ سنسکرت اور کئی دوسری مقامی زبانوں میں قابلِ رشک عبور رکھتا تھا۔ محمود نے اسے اہالیانِ سومنات اور مندر کے اندرونی حالات کی تفصیلات فراہم کرنے پر متعین کیا تھا۔ یہ پہلے تو متھرا پہنچا اور یہاں کچھ دن رہ کر کاٹھیاواڑ روانہ ہو گیا۔

چند دنوں بعد وہ ایسے باغات اور کھیتوں کے درمیان سے گزرنے لگا جن کے گرد تھوہڑ کی باڑھیں کھڑی ہوئی تھیں اور جب وہ انھیں پیچھے چھوڑتا ہوا آبادی میں داخل ہوا تو چونے، اینٹوں اور پتھروں کے مکانات

اس کہانی کے تاریخی پس منظر کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:
کتاب الہند (البیرونی)۔ تاریخِ فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ)۔ خلاصۃ التواریخ (سبحان رائے بٹالوی) سلطان محمود غزنوی (مولوی محمد حبیب بی اے آکسن)۔ سلطان محمود (نصیر احمد جامعی)۔ آئینۂ حقیقت نما (اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

الیاس سیتاپوری



اور کھیرپل کی چھتوں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا کہ اب سومنات زیادہ دُور نہیں ہے۔ مندروں کے سنہرے کلس سے ٹکرانے والی سُورج کی شعاعیں نظروں میں خیرگی پیدا کر رہی تھیں اور مخروطی مندروں میں بے شمار نقش ونگار اور مختلف وضع کی اُبھرواں مورتیاں اپنے کاریگروں اور فن کاروں کی عظمت اور کمالِ فن کا دیکھنے والے کے دلوں پر نقش بٹھا رہی تھیں۔ علی مردان ان کے حُسن میں گم ہوگیا۔ اس نواح میں آنے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

دریائے سرستی کے کنارے کھڑے ہوئے ایک عظیم الشان مندر نے اسے بطورِ خاص متاثر کیا۔ اس وقت وہ ہندو یاتری کے لباس میں تھا، وہ مندر کے دروازے پر رُک گیا اور ایک زرد رُو پروہت سے اس کی بابت دریافت کرنے لگا، پوچھا۔ "مقدس پروہت! یہ کون سی جگہ ہے اور اس مندر سے کیسی عظمتیں وابستہ ہیں؟"

پروہت نے علی مردان کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا اور جواب دیا۔ "تم شاید شمالی ہند سے آرہے ہو!" پھر اسے اندر لے جاتا ہوا بولا۔ "اس جگہ کو ستبھالکا کہتے ہیں۔ زمانہ گزرا کہ یہیں ایک پیپل کے نیچے سری کرشن جی آرام فرما رہے تھے کہ کسی شکاری کے تیر نے ان کی ایڑی کو چھید دیا تھا اور پھر تیر کا زہر جب کرشن جی کے پورے جسم میں پھیل گیا تو اسی سرستی کے کنارے جہاں آج یہ مندر کھڑا ہے، کرشن جی بیکنٹھ کو سدھار گئے تھے۔ یہ مندر ان کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا!"

پروہت علی مردان کو دیر تک مندر کی زیارت کراتا رہا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ سومنات کی زیارت کو جارہا ہے تو پروہت نے یہ مہربانی کی کہ سومنات کے بڑے پروہت کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ سومنات میں داخل ہوتے ہوتے وہ علی مردان سے ست پال ہوچکا تھا۔ سومنات کے مہان پروہت بھیم دیو نے اس خوبرو نوجوان کی شاندار پذیرائی کی اور مندر ہی کے احاطے میں بنے ہوئے حجروں میں سے ایک حجرہ اسے رہنے کے لیے عطا کر دیا۔ سومنات کا مہان پروہت بھیم دیو، نووارد یاتری ست پال سے دیر تک شمالی ہند کی مقدس تیرتھ گاہوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ قنوج اور متھرا پر محمود غزنوی کی لائی ہوئی مصیبتوں اور بربادیوں کا تفصیلی حال سُننا چاہتا تھا۔ علی مردان دل میں لطف لے لے کر لیکن بظاہر غم واندوہ کے لہجے میں محمودی تباہ کاریوں کی پُراثر داستانیں سُناتا رہا۔ پروہت بہت متاثر ہوا، بولا۔

"ٹھیک ہے جو کچھ محمود نے کیا، وہ چھوٹے دیوتاؤں اور بُتوں کے خلاف کیا ہے لیکن اگر شامتِ اعمال سے وہ کبھی سومنات کی طرف آنکلا تو سومنات جی اسے اچھی طرح مزہ چکھا دیں گے!"

علی مردان نے فکر مند لہجے میں جواب دیا۔ "پروہت جی! میرا یہ سفر محض یاترا کی غرض سے ہرگز نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے وہاں یہ سُنا تھا کہ اب محمود کا رُخ سومنات کی طرف ہونے والا ہے، اس خبر کے سنتے ہی میں وہاں سے چل پڑا تاکہ اس خطرے سے آپ سب کو بھی خبردار کر دیا جائے!"

پروہت نے قہقہہ بلند کیا، جس سے علی مردان نے صاف یہ اندازہ لگایا کہ پروہت کے قہقہے کے پیچھے محمود کا خوف بھی کارفرما ہے۔ پروہت نے ایک خاص ادا سے کہا۔ "ست پال جی! تم مت گھبراؤ! اپنے سومنات جی تو محمود اور اس کی فوج کا انتظار ہی کر رہے ہیں، جیسے ہی وہ ہمارے قلعے کی فصیلوں کے نیچے آئے گا، سومنات جی اسے اپنی عظمت کا سبق سکھا دیں گے!"

وسیع وعریض مندر کی حدود میں، دو سو من وزنی سونے کی زنجیر پھیلی ہوئی تھی جس میں بے شمار چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں، صبح شام جب پوجاپاٹ کے لیے لوگوں کو بُلانے کی خاطر انھیں ہلایا جاتا تو گھنٹیوں کا بھاری بھرکم اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور بلند ہوتا، تمام پجاری اور پروہت پوجاپاٹ کے لیے ایک ہی وقت میں مندر میں داخل ہوجاتے اور سومنات جی کی پرستش شروع ہوجاتی۔

یہاں پانچ سو گانے والیاں اور تین سو مرد سازندے ہر وقت گانے بجانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یاتریوں، پروہتوں اور دُوسرے اعلا ذاتی ہندوؤں کے سر اور داڑھیوں کو مونڈنے کے لیے ہر وقت تین سو حجام بھی موجود رہتے تھے۔ پروہت بھیم دیو نے پہلے تو علی مردان کے سر اور داڑھی کے بال منڈوائے اور جب اسے یہ یقین ہوگیا کہ اب ست پال پوری طرح یاتری بن چکا ہے تو اس نے نووارد یاتری سے زیادہ قربت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

مندر کے انھی حجروں میں بہت سی دیوداسیاں بھی رہتی تھیں، ان میں بعض تو راجکماریاں تھیں جنھیں ان کے والدین نے سومنات جی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مستقلاً مندر کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ نا تمام اور ناقص لباسوں میں کچھ چھپے کچھ کھلے جسم اتنے متناسب، سڈول اور حسن کے شاہکار تھے کہ بڑے بڑے پجاری بھی انھیں حریص نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ساری دُنیا کا حسن سومنات کی حدود میں یکجا ہوچکا ہے اور

باقی دُنیا کو اس سے محروم کر دیا گیا ہے۔

چھتیں مرصع ستونوں کی اس کشادہ عمارت کے جس حصّے میں سومنات کا بُت نصب تھا وہ ایک تاریک حجرہ تھا۔ وہاں قندیلوں میں تیل یا موم کی شمعوں کی جگہ جواہر و الماس جڑ دیے گئے تھے اور انھی کی جگمگاہٹ سے یہ تاریک حجرہ روشن رہتا تھا۔ جب پہلی بار علی مردان اس حجرے میں داخل ہوا تو اس کا دل خوف اور دہشت سے زور زور سے دھڑک رہا تھا، بہت سے وسوسے اس کا خون خشک کیے دے رہے تھے۔ وہ ہندو نہ ہونے کے سبب، ان کی بہت ساری رسوم سے ناواقف ہو سکتا تھا اور ہر ہر لمحے اس کا امکان موجود تھا کہ وہ مشتبہ قرار پا جائے۔

اس نے دیکھا تقریباً ایک ہزار برہمن سومنات کی پوجا پاٹ میں مشغول ہیں۔ گانے والیاں نہایت سُریلی آوازوں میں بھجن گا رہی تھیں اور سازندوں نے اپنے سازوں کے زیر و بم سے مندر کے ماحول کو طلسمی اور سحر زدہ سا بنا کے رکھ دیا تھا۔ اس نے اس سحر کن ماحول میں ایک ایسی دوشیزہ کو سومنات کے آگے سربسجود گڑگڑاتے دیکھا جو وہاں کی دوسری عورتوں کے مقابلے میں زیادہ حسین، زیادہ سنجیدہ، زیادہ الگ تھلگ اور زیادہ غمگین نظر آتی تھی، وہ جب سومنات کے آگے گھٹنوں کے بل گر کر گڑگڑائی تو اس کی مناجات اور لہجے میں بہت زیادہ سوز محسوس ہوا۔ علی مردان نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اس کے قریب پہنچ کر، سومنات کے روبرو مؤدب کھڑا ہو گیا۔ اس وقت سوگوار اور غم زدہ دوشیزہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی اور ہذیانی انداز میں زور زور سے گڑگڑا رہی تھی۔

"اے میرے چاند کے آقا۔ اے عظیم سومنات۔ گناہ میرے تعاقب میں ہیں اور میں ان سے بھاگتی ہوں۔ اے سومنات مجھے حوصلہ دے کہ میں چاندنی کی طرح پاک و صاف رہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ گزشتہ جنم میں مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوئے ہیں، لیکن میرے دیوتا یہ جنم تو تیرے سپرد کر دیا گیا ہے، تجھے سب معلوم ہے۔ تو نے میرے گناہوں کے پنکھ کاٹ کر مجھے بے بس کر دیا ہے لیکن مجھ پر دیوانگی کا کیسا دورہ پڑتا ہے۔ میرا شباب بھی مجھ سے چھین لے۔ میرے خون میں سردی گھول دے اور میرے جسم کو بدنما بنا دے۔ شباب کا رس جو میرے جسم میں خون کے ساتھ دوڑ رہا ہے اسے زائل کر دے۔ میں جب تیری ایما پر اس کے لیے نہیں پیدا کی گئی ہوں تو تُو نے مجھے ان جذبات و احساسات سے کیوں نوازا ہے۔ تنہا رہنے کے لیے مجھے پیدا کیا گیا ہے تو تنہائی کا احساس بھی چھین لے۔ میرے بدن میں شامل وِش (زہر) میرے جذبات کا قاتل ہے ۔۔۔ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ مجھ پر رحم کر سومنات! مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈال۔ میرے وِش کو چوس کر مجھے بے ضرر عورت بنا دے یا پھر میرے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرنے والے محرکات فنا کر دے۔ میں صرف تیری رہنا چاہتی ہوں۔"

علی مردان نے دیکھا، لڑکی زار و قطار رو رہی تھی۔ سر اُٹھانے پر اس کی نظر علی مردان سے چار ہوئی۔ وہ اس کے قریب ہو گیا اور ہمت کر کے پوچھ لیا۔ "کیا میں تمھاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟ کیا تم اپنے دُکھ بتانا گوارا کرو گی؟"

لڑکی نے مغائرانہ، اجنبیوں کی طرح علی مردان کو دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر مندر کے باہر جانے لگی۔

علی مردان ہمت کر کے آگے بڑھا اور تقریباً راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، پوچھا۔ "کیا تم نے میری بات نہیں سنی۔ میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔"

لڑکی نے لاپروائی سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

علی مردان نے جواب دیا۔ "میں کرشن جی کی جنم بھومی متھرا سے سومنات کی یاترا کو آیا ہوں۔ میرا نام ست پال ہے۔ تم بہت زیادہ دُکھی نظر آتی ہو۔ اگر تمھارا دُکھ میں کسی طرح بانٹ سکوں تو حاضر ہوں کسی تکلف کے بغیر بتا دو۔ مجھ سے جو ہو سکا اس میں کوتاہی نہیں برتی جائے گی۔"

لڑکی نے علی مردان کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ اس کی پیشکش اور ہمدردانہ کلمات فضول سمجھ رہی ہے۔ بولی۔ "تم ابھی مجھ سے واقف نہیں ہو، میری راہ چھوڑ دو اور سومنات جی کی یاترا کر کے گھر واپس جاؤ۔ میرے دُکھ کا علاج تمھارے بس کا نہیں ہے!"

علی مردان کچھ کہنے ہی کو تھا کہ سامنے کچھ دُور سے سومنات کا مہان پروہت بھیم دیو آتا دکھائی دیا، وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا بے چینی سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کی دھوتی کا کاندھے پر پڑا ہوا پلّو تیز روی کی ہوا سے لہرا رہا تھا۔ اس نے قریب آتے آتے علی مردان کو آواز دی۔ "ست پال! چند لمحے ٹھہرنا تو!"

علی مردان نے بھیم دیو کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ہڈیوں کی قوت رخصت ہو چکی ہے اور بے حس اور سُن پیر حرکت کرنے کی قوت سے محروم ہو چکے ہیں۔

بھیم دیو سے نظریں چرا کے اس نے ایک بار پھر لڑکی پر نظر ڈالی لیکن اب وہاں کچھ بھی نہ تھا، لڑکی جا چکی تھی، اس کی جگہ خلا اور خلا کے اُس پار مندر کی دیوار پر برہما کی اُبھرواں مورتی اس کا منہ چڑا رہی تھی، برہما جس کے چار منہ تھے، جو نیلوفر کے پھول میں کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں گھڑا تھا۔

بھیم دیو نے اسے رحم آمیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "چندرا وتی سے بات کر رہے تھے؟"

علی مردان لڑکی کے نام سے واقف نہیں تھا، بولا۔ "میں اس کا نام نہیں جانتا، شاید چندرا وتی ہی ہو وہ لڑکی!"

بھیم دیو نے نصیحت کی۔ "تم یاتری ہو، تمھیں یہاں کی ناریوں سے دل نہیں لگانا چاہیے اور خاص کر چندرا وتی سے تو بالکل نہیں، چندرا وتی ناگن ہے جو اپنے چاہنے والوں کو ڈس لیا کرتی ہے۔ اس کے حسن پر مت جاؤ اس کے خون میں دوڑنے والے وش (زہر) سے ڈرو!"

علی مردان شرمندہ تھا اس لیے بھیم دیو کی پیچیدہ اور چیستانی باتوں کا مفہوم بھی نہ دریافت کر سکا لیکن جب وہ بھیم دیو سے الگ ہو کر مندر سے باہر نکلا تو اس نے کئی پجاریوں کو افسوس کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ پجاری بھی علی مردان اور چندرا وتی کو باتیں کرتے دیکھ چکے تھے۔ وہ آپس میں جو باتیں کر رہے تھے ان کا مفہوم بھی وہی تھا جو بھیم دیو کی باتوں میں مرموز تھا۔

حسین چندرا وتی اس کے لیے معمہ بن گئی، اس کی متجسس طبیعت کو چین نہیں آیا۔



اس بات کو پانچ دن گزر چکے تھے۔ وہ پراسرار اور حسین چندرا وتی کی تلاش میں کئی بار سومنات کے روبرو حاضری دے چکا تھا، لیکن وہ دوبارہ نہیں دکھائی دی تھی۔ اس نے دیوداسیوں اور خوش الحان گانے والیوں کے حجروں کے آس پاس کے بھی چکر لگائے لیکن وہاں بھی چندرا وتی کا چاند جیسا روشن اور بیوہ جیسا سوگوار چہرہ نظر نہ آیا۔

سونے کی زنجیر میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کے شور سے مندر اور اس کے آس پاس کی فضا میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ علی مردان اپنے حجرے کے کھلے ہوئے دروازے میں سے پجاریوں کے سمندر کو مندر کی سمت جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ان پجاریوں میں مختصر ساریوں میں ملبوس دیوداسیاں اور رقص و موسیقی کے لباسوں میں ڈھنپی ہوئی رقاصائیں اور مغنیائیں بھی پریوں کی طرح اڑی چلی جا رہی تھیں۔ اُسے حسن اور نزاکت کے ان مہ پاروں کو دیکھ کر کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس نور کی طرح بہتے ہوئے حسن کا جواب شاید کہیں اور نہ مل سکے اور غزنی میں تو اس کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

اس ہجوم میں اس نے چندرا وتی کو بھیم دیو کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ حجرے سے باہر آ گیا اور گردن جھکا کے آہستہ آہستہ ان دونوں کے پیچھے چلنے لگا۔ بھیم دیو کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتا چندرا وتی سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ چندرا وتی ننگے پیر تھی۔ بائیں طرف دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا اور سبزے پر جگہ جگہ گیندے، گلاب، جوہی اور نواڑ کے پھول کھلے ہوئے تھے، انھی میں مقدس تلسی بھی موجود تھی۔ چلتے چلتے یکایک چندرا وتی "سی" کر کے بیٹھ گئی اور پیر کی ایڑی ٹٹولنے لگی۔

بھیم دیو نے جھک کر پوچھا۔ "کیا ہوا چندرا وتی؟ کیا کانٹا چبھ گیا؟"

چندرا وتی نے انگلیوں کے ناخونوں سے ایڑی میں چبھے ہوئے کانٹے کو کریدتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں وشال (مقدس) پُرہت جی!"

اچانک ان دونوں کی نظریں علی مردان پر پڑ گئیں۔ بھیم دیو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم بھی ہمارے ساتھ ہی چل رہے ہو؟" پھر اسے حکم دیا۔ "ذرا چندرا وتی کا کانٹا تو نکالنا۔"

علی مردان زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور ناخونوں کی مدد سے کانٹے کو باہر نکال لیا، ایڑی کے ننھے سے سوراخ سے خون نکل کر بوند کی شکل میں جمع ہو گیا تھا۔ چندرا وتی نے اپنی ایڑی کو کئی بار زمین پر رگڑا اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔

بھیم دیو نے دونوں کا تعارف کرایا، چندرا وتی سے کہنے لگا۔ "چندرا وتی! یہ ست پال ہے جو متھرا سے سومنات جی کی یاترا کو یہاں آیا ہوا ہے!" پھر چندرا وتی کی طرف اشارہ کرتا ہوا علی مردان سے کہنے لگا۔ "اور یہ چندرا وتی ہے دیوتاؤں کی حفاظت کے لیے اس کا وجود امرت اور دشمنوں کے لیے زہر ہلاہل ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو نئے دوستوں کی طرح دیکھا۔ چندرا وتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی لیکن اس مسکراہٹ میں بھی یاسیت کا سوز شامل تھا۔ جواب میں علی مردان بھی ہنس دیا لیکن اس ہنسی میں اشتیاق اور کچھ جاننے کا جذبہ پایا جاتا تھا۔

سومنات کے سامنے پجاریوں کے اجتماع میں علی مردان اور چندرا وتی کا وجود دریا میں قطرے کی طرح نظر آتا تھا۔ بھیم دیو انھیں چھوڑ کر سومنات کے قریب چلا گیا۔ وہاں زور زور سے اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ کسی کسی لمحے گھنٹی کا شور بھی بلند ہو جاتا۔ چندرا وتی اور علی مردان بھی قریب قریب دو زانو بیٹھے اشلوک سن رہے تھے۔ کسی کسی لمحے دونوں کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔ ایک بار جب چندرا وتی سجدے میں جا رہی تھی اس کا ہاتھ علی مردان سے ٹکرا گیا۔ چندرا وتی نے معذرت کی تو علی مردان نے جواب دیا۔ "معذرت کی کوئی ضرورت نہیں چندرا وتی! مجھے تم کچھ دیر باتیں کرنے کا موقع دو!"

چندراوتی نے بیٹھتے ہوئے پوچھا: "وشال پروہت نے تمھارا کیا نام بتایا تھا؟"

"ست پال!" علی مردان نے جواب دیا۔

"ست پال جی!" چندراوتی بولی "تم یاتری ہو یاترا کر کے اپنے گھر واپس جاؤ، مجھ ابھاگن کو مت کریدو، مجھ میں اگنی بھری ہوئی ہے تم مجھ سے ہمدردی کروگے تو میرے اندر کی اگنی تمھیں جلا کر بھسم کر دے گی، خود کو یہیں روک دو. آگے مت بڑھو۔"

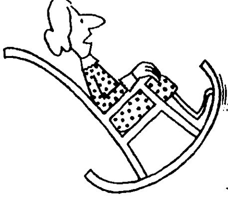
علی مردان نے جواب دیا "اگر کسی غم زدہ عورت کی ہمدردی میں مجھے کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے گا تو مجھے اس کا کوئی دکھ نہ ہوگا، تم مجھے بہت دکھی دکھائی دیتی ہو، مجھے اپنے غم میں شریک کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہو تم مجھ سے اتنی بیگانگی کی بات نہ کرو۔"

چندراوتی نے دکھ سے کہا: "دل کا بوجھ کسی طرح بھی ہلکا نہیں ہو سکتا یوں تم مجھ سے مل سکتے ہو!"

چندراوتی کے مثبت رویے نے علی مردان کی ہمت افزائی کی۔ اس نے چندراوتی سے اس کا پتہ معلوم کیا، اسے حیرت تھی کہ چندراوتی تو اس کے قریب ہی رہتی تھی اور وہ اسے دور دور تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے چندراوتی سے وعدہ کیا کہ وہ رات کو اس سے ضرور ملے گا مگر وہ اس رات نہ جا سکا پھر اگلی رات بھی۔ وہ یہ راتیں جاگ کر گزارتا رہا اور اس کے اعصاب پر چندراوتی مسلط ہو گئی۔ آخر تیسری رات اس نے ہمت کی اور اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر لیا کہ وہ کھل کر چندراوتی سے اپنے دل کی بیتابیوں کا اظہار کر سکے۔

اسی رات حجرے کا دروازہ بند کر کے اس نے محمود غزنوی کے لیے تفصیلی رُوداد مرتب کی۔ یہ روداد بڑی دلچسپ تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"سومنات کے لوگ اپنے حال میں مگن اور اپنے بت سومنات جی کی ماورائی طاقت پر گہرا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پوری دنیا کے بتوں میں سومنات سب کا آقا ہے اور تمام مذاہب ان کے مذہب سے کمتر ہیں۔ سومنات کے لیے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان سے ایک دلچسپ اور خیالی حکایت ترتیب پاتی ہے اور کچھ بے سروپا اور شرمناک باتوں پر مشتمل کہانیوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ چاند کی شادی پرجاپتی (برہما) کی بیٹیوں سے ہوئی تھی۔ چاند اُن میں سے روہنی نامی بیوی کو زیادہ چاہتا تھا۔ برہما کی خواہش تھی کہ چاند اپنی سبھی بیویوں سے یکساں محبت کرے لیکن چاند، برہما کی اس خواہش کو پورا نہ کر سکا اس پر برہمانے چاند کو بددعا دی اور نتیجے میں چاند کوڑھی ہو گیا۔ چاند نے توبہ



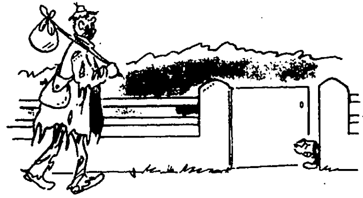
استغفار کا سہارا لیا لیکن مجبوری یہ تھی کہ برہما کی بددعا کا کوئی علاج ممکن ہی نہ تھا برہما چاند کی توبہ سے متاثر ہوا اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ چاند کو مہینے میں پندرہ دن کے لیے روپوش کر دیا کریں گے۔ اس طرح چاند کی ذلت اور مکروہ چہرے پر مہینے میں پندرہ دن پردہ پڑا رہے گا۔ اس کے بعد برہمانے چاند کو حکم دیا کہ وہ اپنے گناہ کے کفّارے میں مہادیو کے لنگ کی شبیہہ تیار کرے۔ چاند نے برہما کے حکم پر مہادیو کا لنگ تیار کر کے مندر میں نصب کرا دیا۔ مہادیو کے اسی لنگ کو لوگ سومنات کہتے ہیں۔ یہاں کی زبان میں سوم چاند کو اور ناتھ آقا یا مالک کو کہتے ہیں جس کا مطلب ہوا چاند کا آقا۔ مہادیو کا یہ لنگ تقریباً پانچ گز لمبا ہے دو گز زمین کے اندر اور تین گز زمین کے اوپر۔ پورے مندر میں جواہر اور الماس کا ایک ذخیرہ ہے جو ادھر ادھر قندیلوں، دیواروں اور مورتیوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں سونے کی زنجیر اتنی لمبی ہے کہ اس نے مندر کی پوری عمارت کو اپنے احاطے میں لے رکھا ہے۔ اس کا وزن دو سو من بتایا جاتا ہے اور اس میں لٹکی ہوئی گھنٹیاں بھی سونے ہی کی ہیں جن کے وزن کا کسی کو کوئی علم نہیں۔

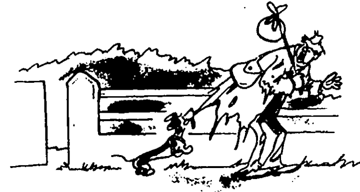
سومنات کے علاوہ مندر میں بے شمار چھوٹے بڑے اور بت بھی موجود ہیں اور یہ سبھی سونے چاندی کے ہیں۔

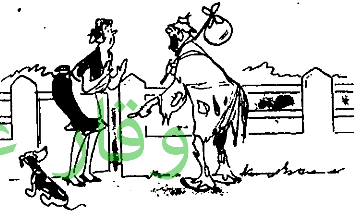
سومنات کے لوگ سلطان سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں کیونکہ انھیں یقین ہے کہ اگر سلطان سومنات تک تشریف لائیں گے تو سومنات جی انھیں ان کے لشکر سمیت تباہ و برباد کریں گے!"

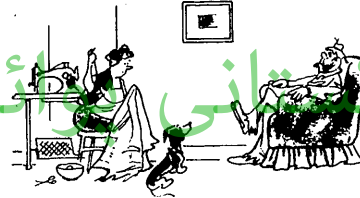
علی مردان کو یہ تفصیلات کسی بھی ذریعے سے غزنی بھجنا تھیں اسے معلوم تھا کہ اس جیسے کچھ اور لوگ بھی سومنات میں مختلف جگہ موجود ہیں اب اسے اپنے ساتھیوں کی تلاش تھی۔

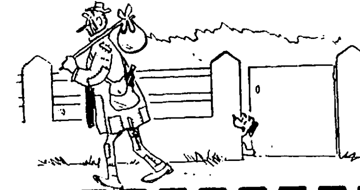
اس کے بعد وہ چندراوتی سے ملنے چلا گیا۔ مندر کے احاطے میں جگہ جگہ شمعیں روشن تھیں، چاند غائب تھا اور ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس نے











آسمان کی طرف دیکھا اور مریخ کے محلِّ وقوع سے اندازہ لگایا کہ شام کو رخصت اور رات کو آئے ہوئے چار ساعتیں گزر چکی ہیں۔ چندراوتی کے پاس رات کے اس حصے میں جاتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا، وہ سوچتا کہ کہیں چندراوتی سو نہ گئی ہو۔ پھر یہ وسوسہ پیدا ہوتا کہ اتنی رات گئے آمد کہیں چندراوتی کے نازک دل پر گراں نہ گزرے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چندراوتی کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے اور جو لوگ بھی اس کے ساتھ رہتے ہیں، اس ناوقت آمد کو شاید پسند نہ کریں۔ ان الجھنوں اور فکروں میں گھرا ہوا جب وہ چندراوتی کے دروازے پر پہنچا تو تلسی کے درختوں سے پھوٹنے والی بھینی بھینی خوشبو نے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر دی۔ اس خوشبو میں ہلکی سی صندل کی خوشبو بھی شامل تھی۔ شیشم کے دروازے کی جھری سے اندر جلنے والے چراغ کی روشنی پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی تھی۔ اس نے چوروں کے انداز میں اندر جھانک کر دیکھا، وہاں ننگے فرش پر کوئی لیٹا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی کوئی بیٹھا ہوا انہماک سے لیٹے ہوئے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا داہنا ہاتھ اٹھا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔

لیٹا ہوا شخص جب اُٹھ کر بیٹھ گیا تو علی مردان نے پہچان لیا۔ یہ چندراوتی تھی۔ وہ دروازے پر نظریں جمائے مزید دستک کی منتظر تھی۔ علی مردان نے آہستہ سے پھر دستک دی تو چندراوتی اُٹھ کھڑی ہوئی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے علی مردان کو کھڑا دیکھ کر کچھ حیران سی رہ گئی، ذرا دیر ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی پھر اداس ہنسی ہنس کر بولی۔ "تم نہیں مانے آخر تم آ گئے! حالانکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آ جاؤ گے!"

علی مردان نے دھیرے سے جواب دیا۔ "چندراوتی! تم مجھے اگر نرکھ سے بھی آواز دو گی تو بھاگ کر تمھارے پاس آ جاؤں گا۔ تم یقیناً کوئی جادوگر ہو۔ تم نے ایک ہی وار میں میرا کام تمام کر دیا ہے۔"

چندراوتی کھلکھلا کر ہنس دی، بولی "ابھی ملاقات کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا اور تم مجھے نرکھ بھیجنے لگے!"

علی مردان شرمندہ سا ہو گیا، موضوع بدل کر بولا۔ "یہ اندر کون ہے؟"

چندراوتی نے مڑ کر اندر موجود شخص کی طرف دیکھا اور لاپروائی سے جواب دیا۔ "تمھارا ہی جیسا میرا ایک ہمدرد جو خود کو میرا سیوک پجاری اور معلوم نہیں کیا کیا کہتا ہے!"

علی مردان کی جان میں جان آئی، بولا۔ "میں غلط وقت پر تو نہیں آیا؟"

چندراوتی نے شوخی سے جواب دیا۔ "یہاں وقت کو غلط اور صحیح میں تقسیم نہیں کیا جاتا، جب بھی میں اندر موجود ملوں اور تم آ جاؤ، وہ صحیح وقت ہوگا۔" پھر واپس ہوتی ہوئی بولی۔ "اندر آ جاؤ۔"

علی مردان حجرے میں داخل ہو گیا۔ حجرے میں موجود شخص ایک لمحے کے لیے علی مردان کی طرف مڑا، علی مردان نے اسے رواروی میں اور اس نے علی مردان کو گہری نظروں سے دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں علی مردان نے لیا

محسوس کیا جیسے اس کے سامنے کوئی زرد رو مردہ بیٹھا ہے۔ اجنبی نے اپنے چہرے کو دھوتی میں چھپالیا۔ حجرے میں ایک ہی پتیل پائی تھی جس پر اجنبی بیٹھا تھا۔ چندراوتی نے علی مردان کو اسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ست پال جی! تم بھی اسی پر بیٹھ جاؤ۔"

ابھی علی مردان بیٹھا بھی ـــــ نہ تھا کہ زرد رو اجنبی اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی نحیف آواز میں بولا۔ "اچھا تو میں چلتا ہوں چندراوتی، پھر کبھی آؤں گا۔"

علی مردان کو ایسا لگا، جیسے وہ اس آواز سے متعارف ہے۔ اس نے اجنبی کو غور سے دیکھنا چاہا لیکن دھوتی کی اوٹ اور دیے کی کمزور روشنی کی وجہ سے وہ اسے اچھی طرح دیکھ نہ سکا۔

چندراوتی اسے دروازے تک چھوڑنے گئی۔ جب وہ چلا گیا تو چندراوتی نے حجرے کو اندر سے بند کرلیا اور علی مردان کے روبرو آکر بیٹھ گئی، مسکراتی ہوئی بولی۔ "ست پال جی! میرے انداز اطوار سے تو تم یہی سمجھنے پر مجبور ہو گے کہ شاید میں کوئی ویشیا (طوائف) ہوں لیکن ایسا نہیں ہے!" پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ بولی "ویشیا بھی مجھ سے اچھی ہی ہو گی، کم از کم اسے خود پر اختیار اور بے ضرر ہونے کا اعتبار تو ہو گا!"

علی مردان ابھی تک اجنبی ہی کی بابت سوچ رہا تھا۔ بولا "یہ اجنبی کون تھا چندراوتی؟"

چندراوتی نے رکھائی سے جواب دیا۔ "تمھیں یہ سوال نہیں کرنا چاہیے، تم تو وہ باتیں کرو، جس کے لیے آئے ہو!"

علی مردان خفیف ہو گیا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس قسم کی باتیں کرے۔

پھر چندراوتی ہی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ بولی "ست پال جی! تم سومنات جی کی یاترا کو آئے ہو، تمھارا ایک کنبہ ہو گا، ماں ہو گی، بہن بھائی ہوں گے اور شاید بیوی بھی ـــــ"

علی مردان نے بات کاٹ دی، بولا "ابھی میں نے شادی نہیں کی۔"

چندراوتی نے کہا۔ "اور شاید شادی نہ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہو گے!"

علی مردان نے جواب دیا۔ "ایسی بات بھی نہیں، لیکن ابھی کچھ دن یاترائیں گزارنے ہیں اس کے بعد گرہست کی زندگی گزارنے پر غور کروں گا۔"

چندراوتی پلک جھپکائے بغیر اس کی صورت دیکھنے لگی۔ علی مردان نے بھی اسے اچھی طرح دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس مجسمۂ حسن و شباب کو اب تک کسی نے چھوا تک نہ ہو۔ چہرے پر سُرخی ایسی جیسے تازہ دہکتے ہوئے دو انگارے۔ شباب میں زور آوری اس بلا کی جیسے سرکش منہ زور جانور جو خود اپنے قابو میں نہ ہو۔ سیاہ زلفوں میں دمکتا ہوا چہرہ مست و پُرکیف کالے بادلوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کی طرح دہر دہر کر رہا تھا۔ ساری شانے سے سرک کر آگے ڈھیر ہو گئی تھی اور تنگ و چست چولی میں شکنیں سی پڑ گئی تھیں۔ ٹھوڑی کے نیچے شفاف گردن اور گردن کے نیچے ہنسلی کی ہڈیاں آنکڑے کی طرح نمودار ہو کر شانوں کے نیچے کہیں روپوش ہو گئی تھیں۔ دونوں ہاتھ، انگلیوں سے بازوؤں تک اتنے سڈول اور خوبصورت تھے کہ بس انھیں دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ لمبوتری ہتھیلی میں سے لمبی لمبی مخروطی انگلیاں یوں نمودار ہوئی تھیں جیسے کسی شاداب اور چکنی ناگ پھنی میں سے پانچ ننھی منی خوبصورت شاخیں پھوٹ نکلی ہوں۔ علی مردان اس سرتاپا کیف و خمار میں گم ہو گیا۔ شوخ اور چنچل چندراوتی اندر چھپی ہوئی یاسیت اور محرومیت کے باوجود علی مردان کے انہماک سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے علی مردان کا انہماک توڑ دیا، بولی۔ "تم کہاں کھو گئے۔ تم تو کچھ باتیں کرنے آئے تھے۔ رات اور زیادہ بھیگ جائے گی اور اگر ایسے میں وشال پروہت کا بلاوا آگیا تو میں خود ہی یہاں سے چلی جاؤں گی!"

اس آواز سے علی مردان یکایک ہوش میں آگیا۔ بے اختیارانہ کہنے لگا "چندراوتی! تم کہو گی کہ یہ کیسا یاتری ہے جو دو ایک ملاقاتوں ہی میں اس قسم کی نازیبا باتیں کرنے لگا ہے، لیکن میں بھی مجبور ہوں، سچ بات تو یہ ہے چندراوتی

کہ جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے، ہوش و حواس گم ہو گئے ہیں، تمھارے حسن اور شباب کا نشہ رگ رگ میں اتر چکا ہے اور یہ جانے بغیر کہ تم کون ہو، کیا ہو، تمھیں چاہنے کا مجھے حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں، میں نے تم سے انتہائی توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے اس والہانہ اظہار کے بعد میرے ساتھ تمھارا کیا سلوک ہوگا، اگر عشق اسی کیفیت کا نام ہے کہ انسان اپنے مطلوب پر نفع نقصان سوچے بغیر اپنا سب کچھ نچھاور کر دے تو میں اس بات کا برملا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے تم سے وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ چندراوتی میں نے اس طوفان کو روکنے کی بہت کوشش کی، مگر ۔۔۔۔۔"

چندراوتی بغور انہماک سے علی مردان کی بات سنتی رہی، ان طویل مکالموں کا اس کے پاس ایک ہی جواب تھا، اس نے غیر جذباتی آواز میں کہا "تم مرد لوگ جب کسی سے قریب ہونا چاہتے ہو تو یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ تم نے جسے پسند کیا ہے وہ بھی تمھیں پسند کرتا ہے کہ نہیں۔ تم لوگوں کے لیے تو شاید بس اتنی ہی بات کافی ہوتی ہے کہ خود تم اپنے مطلوب کو بے پناہ چاہنے لگے ہو!" پھر بالکل دھیرے سے کہنے لگی۔ "اگر تم لوگوں نے مجھے زیادہ پریشان کیا تو میں خود کہیں روپوش ہو جاؤں گی اور پھر کسی کو اپنی منحوس صورت تک نہ دکھاؤں گی!"

اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنکھیں پہلے ہی خشک ہو رہی تھیں، اب اور زیادہ ویران نظر آنے لگیں۔ علی مردان پشیمان ہو گیا کہ اس نے ناحق چندراوتی سے اس قسم کی باتیں کر ڈالیں۔ معذرت کرتا ہوا بولا۔

"اگر میں واقعی غلطی اور بے احتیاطی سے کچھ زیادہ دور نکل گیا ہوں تو اس کی معافی چاہتا ہوں!"

پھر افسوس کی نظروں سے چندراوتی کو دیکھنے لگا۔

چندراوتی نے غضب کر دیا، علی مردان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی ہتھیلی دیکھنے لگی، بولی۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں تمھارا دل دکھاؤں میں تو ان لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کر رہی تھی جو خواہ مخواہ مجھے چاہنے لگے ہیں میں ان سب سے کیسے محبت کر سکتی ہوں۔" یہ کہتے کہتے جیسے وہ ایک بار پھر بہکنے لگی، وہ کہتی رہی۔ "اور ان سب پر ہی کیا موقوف ہے میں کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتی، میں مجبور ہوں بالکل مجبور بت پال جی! میری طرف دیکھو، میں اتنی بدنصیب ہوں کہ میں جس سے محبت کروں گی اس کو آہستہ آہستہ ڈس کر ٹھکانے لگا دوں گی۔"

علی مردان نے عاجز آ کر پوچھا۔ "تم یہ بار بار کیا کہتی رہتی ہو؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا!"

چندراوتی نے جواب دیا۔ "میں ایک ناگن ہوں، مجھ میں زہر بھرا ہوا ہے، تمھیں بس اتنی ہی بات یاد رکھنی چاہیے!"

وہ برابر علی مردان کے ہاتھ کو سہلائے جا رہی تھی اور اسے سچ مچ ہی محسوس ہونے لگا، جیسے اس پر نشہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ مدہوش ہونے لگا۔ اس نے بے اختیاری سے چندراوتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی ہتھیلی، انگلیوں اور ہتھیلی کی پشت کو والہانہ چومنے لگا، چندراوتی کسی تامل اور گریز کے بغیر ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ لیکن جب علی مردان نے اس کو آغوش میں گرا لینے اور اس کے لب و رخسار چومنے کی جسارت کرنا چاہی تو چندراوتی تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی، بولی۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، کیا تم مرنا چاہتے ہو؟ میرے ہونٹوں میں زہر ہے، میرے منہ کا لعاب زہر ہلاہل ہے، تم انھیں چومتے ہی زہر کی تھیلی اپنے ہونٹوں سے لگا لینے کی غلطی کر بیٹھو گے!"

علی مردان سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور چندراوتی ساری کا آنچل سر پر ڈال کر ذرا دور ہٹ گئی۔



اس رات کے بعد چندراوتی سے راہ و رسم بڑھ گئی۔ مندر میں سومنات کے روبرو، چلتے پھرتے احاطے کی راہوں میں، دونوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے۔ پھر علی مردان چندراوتی سے باقاعدہ ملاقاتیں کرنے لگا۔ لیکن چندراوتی ہمیشہ سرد مہری سے پیش آتی۔ یہاں علی مردان جس مقصد سے آیا تھا وہ پس پشت چلا گیا۔ اس کی جگہ چندراوتی لائق پرستش مورتی کی طرح خواب و خیال میں رچ بس گئی تھی۔ سومنات کا جائزہ لکھا ہوا تیار تھا لیکن بھیجنے کی کوئی صورت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کی تلاش میں سومنات کے قلعے کے اس حصے میں گیا جہاں چند مہندسوں (انجینئروں) کی نگرانی میں کچھ تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ قلعے کے جنوبی حصے میں بڑے پھاٹک کی اوپری فصیل کا متصل حصہ ہاتھیوں کو اوپر نیچے

کامیاب ہدایت کار

نومبر ۱۹۷۲ء کے شمارے میں ایک کہانی "کامیاب ہدایت کار" شائع ہوئی تھی جس میں قارئین کو مجرم کی کوتاہی کا سراغ لگانے کی دلچسپ دعوت دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں بے شمار خطوط موصول ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنے جوابات زیادہ سے زیادہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء تک روانہ فرما دیں، اس کے بعد آنے والے دلائل شاملِ اشاعت نہیں کیے جائیں گے۔ آئندہ شمارے میں انعام یافتہ جوابات کا اعلان کر دیا جائے گا۔ (ادارہ)

جانے کے سیمنٹی کے ڈھیر سے پاٹ کر بتدریج اونچا کیا جا رہا تھا۔ وہاں بہت سے مزدور کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ علی مردان ان کے قریب جا جا کر ان میں اپنی شناسا شکلوں کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ دھوپ میں دو گھنٹے گزارنے کے بعد بھی اسے مایوس واپس ہونا پڑا۔

واپسی میں کئی رتھ اس کے پاس سے کھڑکھڑاتے ہوئے گزر گئے۔ ایک جگہ چھوٹے سے مندر کے پہلو میں ایک گھنیرے پیپل کے سائے تلے کچھ لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے، عام راہ سے ہٹ کر سبزے پر ایک خالی رتھ کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ رتھ کے قریب سے گزر رہا تھا تو کسی نے اسے آواز دی۔ اس نے مڑ کر پیپل تلے دیکھا تو چندراوتی ہاتھ ہلا ہلا کر اسے بلا رہی تھی۔ وہ چندراوتی کے پاس چلا گیا۔ چندراوتی کھڑی ہو گئی اور اپنے ساتھی مرد کا علی مردان سے تعارف کرایا، بولی۔

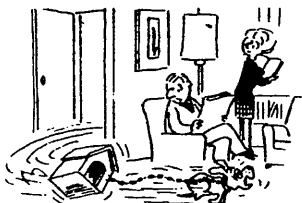
"رتن سین ان سے ملو، یہ ست پال جی ہیں، متھرا سے سومنات جی کی یاترا کو آئے ہیں۔" پھر علی مردان سے کہنے لگی۔ "اور ست پال جی یہ ہیں رتن سین، سومنات کی سینا (فوج) کے ایک افسر ہیں۔ انھیں بہت پسند کرتی ہوں، یہ بھی مجھے چاہتے ہیں اور میں ان کا کوئی حکم ٹال نہیں سکتی۔"

اس تعارف سے علی مردان کو دکھ پہنچا اور رتن سین سے رقابت محسوس کرنے لگا۔

تعارف کے بعد چندراوتی بیٹھ گئی، علی مردان بھی سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سانولی رنگت کا رتن سین اسے گہری نظروں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور تعارف کے علاوہ بھی کچھ جاننے کا خواہشمند ہے۔

چندراوتی کچھ پس و پیش اور سکوت کے بعد بولی "ست پال جی! تم متھرا سے آئے ہو، تم یقیناً متھرا اور اس کے آس پاس کے رہنے والوں کے چہرے مہرے اور طور طریق سے اچھی طرح واقف ہو گے۔ رتن سین جی کو معلوم ہوا ہے کہ سومنات میں کچھ لوگ غزنی کے محمود کے جاسوس کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کن حلیوں میں یہاں آئے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ اس سلسلے میں رتن سین کچھ مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں۔ ہمیں محمود کے جاسوسوں کو پہچاننا ہے، کل سے اس مہم کا آغاز ہو گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی میرا ساتھ دو!"

علی مردان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، اسے شبہ گزرا کہ شاید وہ خود بھی پہچانا جا چکا ہے اور چندراوتی جو کچھ کہہ رہی ہے طنزاً اور چھیڑ کی خاطر کہہ رہی ہے۔ اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ چندراوتی کو کیا جواب دے۔ پھر بھی ہمت سے کام لے کر جواب دیا۔ بولا۔ "لیکن انھیں پہچانا کس طرح



جائے گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنی زبان سے تو یہ کہنے سے رہا کہ میں محمود کا جاسوس ہوں۔"

چندراوتی ہنس دی، کہنے لگی۔ "پورے سومنات میں مسلمان جاسوسوں کو پہچاننا نہایت آسان بات ہے، اتنی آسان کہ اس سے زیادہ آسان دوسری کوئی بات بھی نہیں ہو سکتی!"

"مثلاً؟ یعنی؟" علی مردان چندراوتی کی صورت دیکھنے لگا۔

جواب میں چندراوتی کے بجائے رتن سین بولا۔ "وہ پہچان چندراوتی نہیں بتا سکتیں، میں بتاتا ہوں!" اس کے بعد اس نے چندراوتی کی طرف دیکھا جس نے غالباً شرم سے سر جھکا لیا تھا۔ رتن سین کہتا رہا۔ "کسی بھی شخص کو نیچے سے برہنہ کر کے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان!"

علی مردان چکرا گیا، اس نے یقین کر لیا کہ اب وہ گرفتار ہونے سے ہرگز نہ بچ سکے گا۔ پھر بھی کھڑا ہو گیا اور جی کڑا کر کے چندراوتی سے کہنے لگا۔ "چندراوتی! میں متھرا سے آیا ہوں، تم نے ابھی جو کچھ کہا ہے اگر اس کا ذرا سا بھی اشارہ میری طرف ہے تو میں خود کو پہچنوانے پر آمادہ ہوں۔ رتن سین بشوق میرا نچلا لباس اتار کر اپنے شبہے کی تصدیق کر سکتے ہیں!"

چندراوتی نے دردمند آواز میں کہا۔ "تم بھی بڑے تنک مزاج ہو ست پال جی! ہم لوگ تم پر اعتماد کرتے ہیں اور یہ اعتماد ہی تو تھا جس کی وجہ سے تمھیں اتنی بڑی راز کی بات بتا دی گئی!"

رتن سین بولا۔ "دوست! چندراوتی تمھیں بے حد شریف اور معقول آدمی سمجھتی ہے، اگر میں تم پر شبہ بھی کروں تو چندراوتی ناراض ہو جائے گی اور ہم میں سے کوئی بھی شخص کم از کم چندراوتی کو ناراض نہیں کر سکتا!"

یہیں باتوں باتوں میں رتن سین نے یہ بھی بتایا کہ غزنی کا محمود عنقریب اپنے خونخوار لشکر کے ساتھ سومنات آنے والا ہے۔ رتن سین نے شیخی میں یہ بھی کہا کہ غزنی کے بادشاہ کو آنے تو دو، سومنات جی اسے ایسا مزہ چکھائیں گے کہ مسلمان رہتی دنیا تک نہ بھولیں گے۔" پھر چندراوتی سے کہنے لگا "چندراوتی

دیوی! سلطان کو اصل مزہ تو تم چکھاؤ گی!"

"ہاں! بالکل!" چندراوتی نے جواب دیا۔ "مسلمانوں کا بادشاہ مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔" پھر وہ ایک دم اداس ہوگئی، ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "اور شاید میری زندگی کا آخری دن بھی وہی ہوگا، ایک طرف مسلمانوں کا بادشاہ دم توڑ رہا ہوگا، دوسری طرف میں ـــ میرے جیون کا پنچھی اُڑنے کی تیاری کر رہا ہوگا!"

یہ ساری باتیں سُن سُن کر علی مردان پریشان ہو رہا تھا۔ آخر یہ چندراوتی ہے کیا؟ اس کا راز کیا ہے؟ یہ سلطان کو کس طرح ہلاک کرے گی ـــ؟ چندراوتی کی ایک ایک بات اُسے پریشان کر رہی تھی۔

رتن سین، علی مردان سے محمود کی ان تباہ کاریوں کی داستان سنتا رہا جو متھرا اور اس کے نواح میں پیش آچکی تھیں۔ جب علی مردان نے رتن سین کو یہ بتایا کہ اب وہ عنقریب متھرا واپس جانے والا ہے تو رتن سین نے اس سے خواہش کی کہ ابھی وہ یہیں رہے کیونکہ غزنی کا بادشاہ عنقریب سومنات آنے والا ہے۔ سومنات کے عتاب اور چندراوتی کے انتقام سے اس کا کام تمام ہوتے دیکھ کر وہ متھرا واپس جائے!

علی مردان نے ٹھہرنے کا وعدہ کر لیا۔

اسی رات چندراوتی تنہا اس کے حجرے میں آئی اور اس سے گداز کی باتیں کرنے لگی۔ اس نے علی مردان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور شدید جذباتی انداز میں اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی: "ست پال جی! تم مجھے اپنے ساتھ متھرا لے چلو، میں یہاں تنگ آچکی ہوں ـــ"

علی مردان نے اس کے سیاہ چمکتے بال چوم لیے اور سینے میں بھینچتا ہوا بولا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ متھرا نکل چلو۔ تمھارے بغیر میری زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا!"

چندراوتی نے علی مردان کے سینے کے سیاہ بالوں پر اپنے نتھنے رکھ دیے اور ان سے نکلنے والی بُو سے لطف اندوز ہونے لگی۔ بولی۔ "لیکن تم ایک وعدہ اسی وقت کرو؟"

"کہو، میں تیار ہوں!"

"ہم دونوں رہیں گے تو ایک ساتھ ہی لیکن شادی نہیں کریں گے میاں بیوی نہیں بنیں گے!"

"یہ کیوں؟" علی مردان نے حیرت سے پوچھا۔ "جب ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کریں گے تو شادی کیوں نہیں کریں گے؟"

چندراوتی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "شادی نہ کر سکنے کی ایک خاص وجہ ہے، جب میں سب کچھ صاف صاف تمھیں بتادوں گی تو تم خود ہی مجھ سے دُور دُور رہنے لگو گے، بالکل اسی طرح جس طرح لوگ ناگ یا ناگن سے بچتے ہیں!"

علی مردان نے پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "چندراوتی! تم مجھ سے کچھ چھپاتی ہو، ایک طرف تو محبت کا دم بھرتی ہو اور دوسری طرف اپنی زندگی کا اہم ترین راز چھپا کر مغائرت برتتی ہو!"

چندراوتی اس کے سینے اور ٹھوڑی کے بوسے لے لے کر اپنی پیاس بجھاتی رہی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے کوئی برسوں کا پیاسا محض چند قطروں سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

کچھ دیر بعد چڑھی ندی اُتر گئی، اور چونکہ پورا زور دکھائے بغیر اُتر رہی تھی اس لیے دونوں ہی کے سر درد کرنے لگے۔

دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ لکڑی کے ہتھے پر کئی بتیوں والا چراغ روشن تھا۔ چندراوتی کی نظریں جھلملاتی بتیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ علی مردان اس کی اندرونی کشمکش کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس محویت اور خاموشی کو زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ علی مردان کچھ پریشان ہوا لیکن چندراوتی نے ہمت بندھائی، بولی۔ "ست پال جی، تم میری موجودگی سے ہرگز نہ گھبرانا۔ میری حیثیت شک اور شبہے اور لوگوں کی نکتہ چینی سے بالا ہے اور اسی لیے میں عام عورتوں سے زیادہ بے باک ہو کر گفتگو کر لیتی ہوں۔"

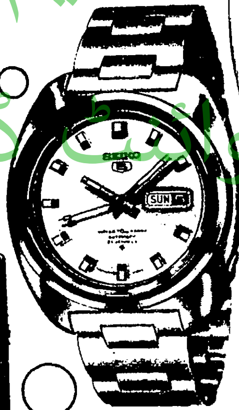
علی مردان تھکے تھکے قدموں سے دروازے تک پہنچا اور زنجیر کھول دی۔ باہر کوئی شخص دھوتی میں منہ چھپائے اس سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا چندراوتی یہاں موجود ہے؟"

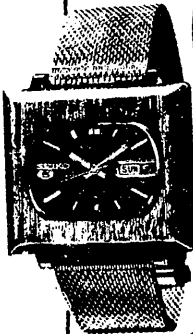
علی مردان نے آواز سے پہچان لیا کہ یہ وہی زرد رُو شخص ہے جو چندراوتی کے حجرے میں ایک بار پہلے بھی مل چکا ہے، چندراوتی نے بھی اس کی آواز سُن لی تھی، اور اسے پہچان بھی لیا تھا، بولی۔ "ست پال جی انھیں بھی اندر ہی بلالو۔"

اور پھر یہ اجنبی بھی اندر آگیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا زرد چہرہ دھوتی کے پلو میں چھپا لیا اور چندراوتی سے کہنے لگا۔ "چندراوتی! میں صبح واپس جا رہا ہوں، تم سے آخری بار ملنے آیا ہوں!"

چندراوتی نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "شاید تم ابھی نہ جاسکو، میں رتن سین کے ساتھ تمھارے پاس گئی تھی لیکن تم سے ملاقات نہ ہو سکی، رتن سین کسی


SEIKO
SUN 5


SEIKO
SUN


SEIKO
SUN

خاص غرض سے تم سے ملنا چاہتا ہے!"

اجنبی نے جواب دیا۔ "تب پھر میں ایک دن اور رہ جاؤں گا!" پھر ہارے ہوئے جواری کی طرح بولا۔ "میں چاہتا تھا تم بھی میرے ساتھ ہی چلو لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ کی طرح میری یہ درخواست ایک بار پھر رد کر دو گی۔"

چندراوتی نے اس کی بات ہنسی میں اُڑا دی، بولی "میں محبت کی اہل نہیں ہوں یہ بات میں پہلے ہی تمھیں بتا چکی ہوں۔"

اجنبی ٹھہرا نہیں، چندراوتی سے صبح ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

اجنبی کی آمد اور روانگی نے دونوں ہی کو مکدر کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد کھوئی کھوئی چندراوتی بھی چلی گئی۔

آدھی رات کے بعد ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی اور جب دروازہ کھلا تو ایک بار پھر وہی اجنبی پھرتی سے اندر داخل ہو گیا، اس بار اس نے اپنا چہرہ دھوتی میں نہیں چھپایا تھا۔ علی مردان نے اندر کی زنجیر چڑھا لی اور سوالیہ نظروں سے اجنبی کو گھورنے لگا۔

"ادھر آؤ، چراغ کے پاس!" اجنبی نے علی مردان کو شانے سے پکڑ لیا اور چراغ کی طرف لے جانے لگا۔ علی مردان معمول کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

چراغ کے قریب پہنچ کر اجنبی نے کہا۔ "علی مردان، تمھارا حافظہ اور ذہانت کو کیا ہو گیا۔ میں نے تو تمھیں پہلی ملاقات اور پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا اور اس خیال سے کہ تم خود بھی مجھے پہچان کر بے اختیاری میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھو، اپنا چہرہ دھوتی کی اوٹ میں چھپا لیا تھا۔" پھر اپنا چہرہ چراغ کے روبرو کر دیا، بولا۔ "لو اب پہچان لو مجھے! میں اسماعیل ہروی ہوں سلطان کے بھیجے ہوئے آدمیوں میں سے ایک جو مہندس بھی ہے، میں تم سے پہلے ہی یہاں آگیا تھا!"

علی مردان نے اب اسے پہچان لیا تھا، پریشان ہو کر بولا۔ "لیکن تم تو نہایت صحت مند انسان تھے، یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے اسماعیل۔ تمھاری آواز میں بھی ضعف اور نقاہت کی لہر پیدا ہو گئی ہے!"

"ہاں!" وہ کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔ "کبھی میں واقعی صحت مند تھا لیکن جب سے چندراوتی کا ساتھ ہوا اور میں اس کی محبت میں مبتلا ہوا، اپنی جوانی اور صحت کو گھن لگ گیا!"

علی مردان نے تشویش سے پوچھا۔ "کیا چندراوتی بھی تمھیں چاہتی ہے؟"

"نہیں!" اسماعیل نے جواب دیا۔ "اسے تم سے محبت ہو تو ہو لیکن مجھ سے محبت نہیں کرتی۔" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "اور یہ بات بھی کسے معلوم کہ وہ تم سے واقعی محبت کرتی ہے یا بے وقوف بنا رہی ہے!"

علی مردان نے بے چینی سے کہا۔ "تم چندراوتی کے بارے میں جتنا کچھ بھی جانتے ہو، مجھے صاف صاف بتا دو، اس میں اسرار کیا ہیں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔"

اسماعیل نے جواب دیا۔ "مجھے اپنی جوانی اور صحت گنوا دینے کے بعد اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ چندراوتی ناگن ہے جو کسی بھی مرد کو اپنی عنایات اور نوازشوں کے جال میں پھانس کر ڈس سکتی ہے۔ اس کی سانس، اس کے لعاب اور اس کے وجود میں زہر گھلا ہوا ہے۔ اس سے انتہائی قریب رہنے والا کوئی بھی شخص میری ہی طرح گھل گھل کر زرد پڑ سکتا ہے۔ میں نے اس کا قرب حاصل کیا، اس سے محبت کی، ہم آغوشی کا لطف اُٹھایا، بوس و کنار کی لذتیں حاصل کیں، اکثر راتیں اس کی آغوش میں سو کر گزار دیں اگر مسلمان ہونے کا راز مجھے محتاط رہنے پر مجبور نہ کر دیتا تو شاید میں چندراوتی کی آخری نوازشیں بھی حاصل کر لیتا۔ اس اختلاط اور قربت نے مجھے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے اور میں روز بروز خود کو گھلتا ہوا محسوس کر رہا ہوں، جسم میں زہر خون میں شامل ہو کر کھوکھلا کیے دے رہا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر چندراوتی راضی ہو گئی تو اسے اپنے ساتھ غزنی لے جاؤں گا۔ ممکن ہے وہاں وہ بدل جائے لیکن چندراوتی ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہے!"

علی مردان کا دل ہول گیا۔

اسماعیل نے کہا۔ "میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں صبح سے پہلے یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ رتن سین میری تلاش میں ہے۔ غالباً وہ یہ معلوم کر چکا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اپنے سلطان کی طرف سے جاسوسی کی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ صبح مجھے حراست میں لے کر برہنہ کر دیا جائے گا اور جب میرا مسلمان ہونا ثابت ہو جائے گا تو مجھے کسی بت کے سامنے لٹا کر کُتے کی موت مار دیا جائے گا۔ تمھیں سلطان کے نام جو پیغام دینا ہے مجھے اسی وقت دے دو اور یہاں سے نکلنے کی تدبیریں کرو۔ بت خانے کے کتے ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں، کسی وقت بھی پکڑے جا سکتے ہو!"

علی مردان نے کئی دن پہلے کی مرتبہ معلومات اسماعیل کے حوالے کیں، خوفزدہ اسماعیل اسی وقت وہاں سے چلا گیا اور علی مردان اپنی فکروں میں کھو گیا۔



صبح مندر میں چندراوتی سے ملاقات ہوئی تو اس نے علی مردان سے پہلا سوال یہ کیا کہ۔ "رات اجنبی دوبارہ تو نہیں آیا تھا؟"

علی مردان نے منفی میں جواب دیا تو چندراوتی کہنے لگی۔ "وہ لاپتہ ہے، وہ یقیناً مسلمانوں کا جاسوس تھا، وہ کہیں بھی جائے پکڑا جائے گا!"

پروہت بھیم دیو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دونوں کے قریب آگیا اور علی مردان سے مخاطب ہوا۔ "ست پال جی! کیا میں نے تمھیں منع نہیں کیا تھا کہ تم چندراوتی کا پیچھا مت لو، تم متھرا کے یاتری معلوم نہیں کیوں اتنے نادان بنتے ہو، کیا تم اب بھی نہیں سمجھے کہ چندراوتی کے رگ و پے میں خون کے ساتھ زہر کیوں دوڑ رہا ہے؟"

علی مردان نے سادہ لوحی سے انکار میں گردن ہلا دی اور بولا۔ "وشال پروہت! میں شکر گزار ہوں گا اگر تم اس راز سے پردہ اٹھا دو گے!"

بھیم دیو نے شک اور شبہے سے علی مردان کو گھورا اور چندراوتی سے کہنے لگا۔ "چندراوتی! معلوم نہیں یہ یاتری جھوٹ بول رہا ہے یا واقعی کچھ نہیں جانتا، اگر یہ تجھ سے واقعی لاعلم ہے تو یہ خود ہم سب کے لیے ایک راز ہے اور اس راز کی نقاب کشائی خود تجھے کرنی ہوگی!"

چندراوتی ادب سے خم ہوگئی اور کہنے لگی۔ "وشال پروہت! تمھارے حکم کی تعمیل ہوگی!"

"کب تک؟"

"آج ہی شام تک!"

"ضرور۔" پروہت جاتا ہوا بولا۔ "اگر سومنات جی کے یاتری کی بے حرمتی اور عذاب کا خوف نہ ہوتا تو میں اس شخص کو یہیں برہنہ کرکے اپنے شبہے کی تصدیق کرلیتا لیکن یہ سوچ کر ڈر جاتا ہوں کہ اگر میرا شبہ غلط نکلا تو مجھ پر سومنات جی کوئی عذاب نازل کردیں!"

چندراوتی نے جواب دیا۔ "پروہت جی تم سومنات جی کے عتاب کا خطرہ ہرگز مول نہ لو، میں شام تک اس کی اصل حقیقت سے تمھیں آگاہ کردوں گی!"

پروہت نے قہر کی نظروں سے علی مردان کو گھورا اور چندراوتی سے کہنے لگا۔ "اور ہاں اس کا خیال رکھنا کہ یہ شخص کہیں ادھر ادھر نہ ہوجائے۔"

علی مردان نے نجات اسی میں دیکھی کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق ذرا گرمی کا اظہار کرے۔ اس نے تیوریوں پر بل ڈال لیے اور ترش لہجے میں کہنے لگا۔ "افسوس کہ تم لوگ سومنات جی کے ایک مخلص یاتری کو شک اور شبہے کی نظر سے دیکھ رہے ہو، اگر تم لوگ مجھے واقعی مسلمانوں کا جاسوس سمجھتے ہو تو میں اسی وقت دھوتی الگ کرکے اپنے غیر مسلم ہونے کا ثبوت دینے کو تیار ہوں!"

پروہت کچھ متاثر ہوا اور اپنے شبہے پر کچھ پشیمان سا ہوگیا لیکن چندراوتی کو منع بھی نہیں کیا کہ اب تم اسے جانچنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔

مندر سے دونوں ساتھ ساتھ نکلے تو باہر ایک جگہ کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ چندراوتی نے کہا۔ "پروہت جی کو تم پر کچھ شک ہوگیا ہے ورنہ وہ اس طرح ہرگز بات نہ کرتے۔ خیر اب تم اپنی تلاشی دینے پر آمادہ ہوجاؤ۔ اس سلسلے میں میں تمھیں کچھ رعایتیں تو دے سکتی ہوں لیکن معاف نہیں کرسکتی!"

علی مردان نے بناوٹی بے نیازی سے جواب دیا۔ "مجھے کوئی رعایت بھی درکار نہیں تم جس طرح چاہو میری طرف سے اطمینان کرلو۔ میں مطمئن ہوں، میرا ضمیر مطمئن ہے۔"

چندراوتی مسکراتی ہوئی بولی۔ "اب ہم تم بہت قریب آگئے ہیں میں تم پر اعتماد کرتی ہوں، اپنے جیون کی سوگند! تم مجھے اچھے لگتے ہو، تم اگر یاتری ہو تو، اور اگر وہ ہو جس کا تم پر لوگوں کو شک ہے تو، مجھے کوئی پروا نہیں میں تمھارے لیے ڈھال بنی رہوں گی، میں بہتوں کی جانیں لے چکی ہوں لیکن میں تمھیں نہیں مار سکتی، نہ جانے ایسا کیوں ہوگیا ہے۔"

علی مردان نے مایوسی سے کہا۔ "نہیں چندراوتی! تم میری جانچ کرلو اور میں جو کچھ بھی نکلوں اس سے پروہت جی کو مطلع کردو میں تم سے کوئی رعایت نہیں چاہتا!"

"بالکل کہیں کے!" وہ شوخی سے بولی۔ "تمھیں خوش کرنے کے لیے میں آج ناچ کی محفل سجاؤں گی، اچھے اچھے گیت سناؤں گی، شام کی پوجا کے بعد تم ایک جگہ میرے ساتھ چلنا۔ وہاں میری قربت سے تمھیں بہت لطف آئے گا۔"

علی مردان اپنے خوف اور اندیشے چھپائے چندراوتی کے والہانہ انداز سے لطف و مسرت حاصل کر رہا تھا۔

دوپہر کو وہ علی مردان کو رتن سین کے پاس لے گئی۔ رتن سین انھیں دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔ چندراوتی نے پوچھا۔ "کوئی پکڑا گیا؟"

رتن سین نے کچھ خوشی اور کچھ اداسی سے جواب دیا۔ "صرف ایک شخص، دوسرا نکل گیا، ہمارے آدمی اس کا اب بھی پیچھا کر رہے ہیں خیال ہے دو ایک دن میں وہ بھی پکڑا جائے گا!"

چندراوتی نے پوچھا "وہ پکڑا جانے والا شخص کہاں ہے؟"

رتن سین اسے ایک تہہ خانے میں لیے چلا گیا، جہاں دن میں بھی چراغ کی روشنی درکار تھی۔ چندراوتی اور علی مردان دونوں ہی نے اس قیدی کو پہچان لیا۔ یہ وہی زرد رو اسماعیل تھا۔ علی مردان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسماعیل نے علی مردان کو اجنبیوں کی طرح دیکھا۔ رتن سین نے علی مردان پر ایک اچٹتی نظر ڈالی پھر کہنے لگا۔ "اس کے پاس کسی کی کوئی تحریر تھی جسے اس نے گرفتاری سے پہلے ہی اپنے کسی ساتھی کو دے کر چلتا کردیا!"

چندراوتی نے پوچھا۔ "اب تم اسے سزا کیا دو گے؟"

رتن سین نے جواب دیا۔ "بہت ہی عبرت ناک، جس سے ہمیں کئی فائدے پہنچیں گے!"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ ہم اسے سومنات جی کے چرنوں میں قربان کر دیں گے۔ ہم سے دو ایسی غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں جن کا اس قربانی سے بہتر علاج ہو ہی نہیں سکتا!"

چندراوتی سوالیہ نظروں سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

رتن سین نے چندراوتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہنے لگا "میں تم سے محبت کرتا ہوں چندراوتی لیکن تمھارے وِش سے ڈرتا ہوں، میں نے سوریہ دیوتا کے چرنوں میں گھنٹوں اپنا سر رکھ کر پرارتھنا کی ہے کہ وہ تمھارا زہر زائل کر دیں لیکن میری یہ دعائیں ہمیشہ بے اثر رہیں، پھر مجھے کسی نے یہ بتایا کہ اگر میں سوریہ دیوتا کی مورتی اپنے ہاتھ سے پتھر تراش کر بناؤں تو دل میں جو منّت بھی مانوں گا پوری ہوگی۔ میں نے اس مقصد سے سنگ تراشی اور بُت سازی کا ہنر سیکھا اور جب مجھے اپنے سیکھے ہوئے ہنر پر اعتماد ہو گیا تو ایک دن میں نے یہ منّت مانی کہ اگر سوریہ دیوتا تمھارے جسم کا وِش زائل کر دیں گے تو میں ان کا ایک شاندار بُت بناؤں گا۔ اس منت کے بعد اپنی دعا کا اثر دیکھے بغیر ہی میں نے سوریہ دیوتا کی بت سازی کا کام شروع کر دیا اور جب یہ بُت بن کر تیار ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت ملال ہوا کہ بُت بہت بڑا بن گیا ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ میرا یہ بت حاکم وقت کو بہت پریشان اور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔" پھر وہ باتیں کرتا ہوا اپنے نوادر — والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

علی مردان کو غصّہ بھی آ رہا تھا اور وہ کڑھ بھی رہا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو جب رتن سین نے چندراوتی سے اظہارِ عشق کیا تھا، اسی وقت اس کا منہ توڑ دیتا۔ ابھی اس کا جوش کم نہ ہوا تھا کہ رتن سین نے ایک نئی حرکت کی۔ علی مردان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر لے جاتا ہوا بولا "ست پال جی! تم ذرا دیر کے لیے باہر ہی رہو، مجھے چندراوتی سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں!"

لیکن چندراوتی نے رتن سین کو ایسا کرنے سے روک دیا، بولی۔

"نہیں، ست پال جی ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ ہر بات ان کے سامنے ہی ہوگی!"

رتن سین نے رشک و رقابت سے علی مردان کو دیکھا اور چندراوتی سے پوچھا "چندراوتی! کیا ست پال جی مجھ سے زیادہ تمھاری نوازشوں کے مستحق قرار پا گئے ہیں؟"

چندراوتی نے کہا "بات یہ نہیں ہے!" پھر ذرا تامّل سے بولی "میں ست پال جی کو حد سے زیادہ پسند بھی کروں تو میری یہ چاہت فضول ہے، میں چاہوں تو ست پال جی سے لطف اندوز ہو کر انھیں ہلاک ہو جانے دوں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی اور جب ایسا نہیں کر سکتی تو تمھیں ست پال جی سے خواہ مخواہ کا رشک و حسد بھی نہیں رکھنا چاہیے۔"

رتن سین شرمندہ ہو گیا، علی مردان کے کاندھے سے ہاتھ ہٹا لیا اور چندراوتی سے بولا "دیوی! جیسی تمھاری مرضی۔ پر یہ دل رقابت پر اکساتا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ غلط ہے۔"

پھر وہ دونوں کو ایک ایسے بُت کے سامنے لے گیا جس کا گول چہرہ کنول کے مغز جیسا سُرخ اور جواہر کی طرح چمکتا ہوا تھا، اعضا کشادہ اور دونوں کانوں میں آویزے پڑے ہوئے تھے۔ گلے میں موتیوں کی لڑیاں تھیں جو سینے پر لٹکی ہوئی تھیں، سر پر تاج، دونوں ہاتھوں میں کنول کے پھول تھے اور لباس گھٹنوں تک نیچا تھا۔ یہ سوریہ دیوتا کا بُت تھا اور جو بہت بڑا تھا۔

رتن سین آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "جب سوریہ دیوتا کا یہ بُت بن کر تیار ہو گیا تو بھیم دیو جی نے اس کی نقاب کشائی کی اور اس کا بڑا حجم دیکھ کر اسی وقت یہ بتایا تھا کہ سوریہ دیوتا کا تناسب سے بڑا بت بنا دینے سے ملک اور قوم پر تباہی نازل ہوگی۔ اتفاق کی بات کہ سوریہ دیوتا کے اس بُت کا پیٹ بھی ذرا پچکا ہوا ہے اس پر پروہت جی نے یہ بتایا کہ اس سے اطراف میں قحط سالی پھیلنے کا اندیشہ ہے!"

علی مردان رتن سین کی باتوں سے اکتا رہا تھا۔ اچانک چندراوتی کی آواز سنائی دی۔ وہ رتن سین سے کہہ رہی تھی "رتن سین! تم کچھ بھی کرو میرا وِش مجھ سے جدا نہ کر سکو گے۔ تم میرا خیال چھوڑ دو، اگر نہ مانے تو اسی طرح الجھنوں میں پھنستے چلے جاؤ گے۔"

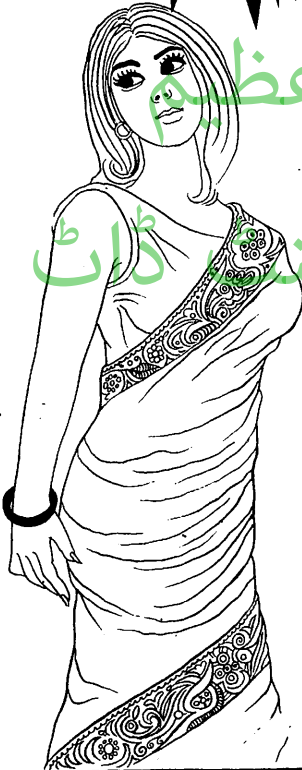
"ایک کوشش اور کروں گا!" رتن سین کہنے لگا۔ "منّت ہی تو ہے، میں سوریہ دیوتا کا ایک بُت اور بنا رہا ہوں، اگر اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تو ممکن ہے سوریہ دیوتا مجھ پر مہربانی کریں اور تمھیں وِش سے پاک کر دیں۔"

چندراوتی نے مایوسی سے کہا۔ "یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لو لیکن اب میں کچھ اور سوچنے لگی ہوں، دیوی دیوتاؤں پر سے میرا اعتقاد اٹھتا جا رہا ہے۔ ہمارے دُکھوں کا علاج نہ سوریہ دیوتا کے پاس ہے نہ کئی چہروں والے برہما کے پاس۔"

رتن سین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، خوف زدہ لہجے میں بولا — "چندراوتی! تم تو ناستک ہوتی جا رہی ہو۔ تمھارے غلط خیالات اور جھوٹے وشواش تمھیں کہیں کا بھی نہ رکھیں گے، مایوس مت ہو!"

معیاری اور دیدہ زیب پارچہ جات کا مرکز

جمال کو



ہم اپنے کرم فرماؤں کی خدمت میں

سالِ نو کی مبارکباد پیش کرتے ہیں

مردانہ وجاہت اور زنانہ حسن دوبالا کرنے کے لیے
لاجواب سوٹنگ، شرٹنگ، جدید ڈیزائن کے برقعے،
رنگارنگ ساڑھیاں۔ خواتین کے لئے بہترین سوٹ
اور ہمہ اقسام ریشمی، اونی اور سوتی پارچہ جات کے لیے

جمال کو

کی شہر بھر میں مقبولیت کا راز......
مناسب دام، پائیداری اور وزرائٹی ہے
اپنی شخصیت پُرکشش بنانے کے لیے جمال کو
کے پارچہ جات استعمال کیجیے۔

جمال کو کلاتھ مرچنٹس عیدگاہ کلاتھ مارکیٹ بندر روڈ کراچی
فون: ۲۳۲۶۵۹

چندراوتی نے علی مردان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"ست پال جی! تم ہمیں متھرا لے چلو۔ وہاں کچھ دن رہ کر میں بدری ناتھ چلی جاؤں گی اور بقیہ زندگی گمنامی میں گزاروں گی!"

رتن سین نے چونک کر کہا۔"کیا پاگل ہوگئی ہو؟ تم اپنی بابت اتنا بڑا فیصلہ چپ چاپ کیسے کر سکتی ہو؟ کیا دھنپال پروہت تمھیں یہاں سے آسانی چلا جانے دیں گے؟ تمھیں تو ابھی مسلمانوں کے بادشاہ غزنی کے محمود کے لیے کچھ کرنا ہے، سُنتا ہوں کہ صبح شام میں وہ آنے ہی والا ہے!"

چندراوتی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجبوری اور بےبسی سے اس کا دل بھر آیا۔

اس تین نفری ماحول میں علی مردان خود کو تنہا تنہا اور اجنبی اجنبی محسوس کرتا رہا۔



مہادیو کے بُت کے سامنے عقیدت مندوں اور پرستاروں کا ہجوم جمع ہوگیا۔ تین آنکھوں والا مہادیو، جس کی تیسری آنکھ دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر کھڑی ہوئی بنی تھی، ایک ہاتھ میں ترشول اور تلوار دوسرے سے اپنی بیٹی گور کو تھامے ہوئے، جو مہادیو کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی، سر پر چاند بنا تھا۔

مہادیو کے روبرو دیوداسیوں اور ناچنے والیوں کے پرے موجود ہوئے۔ اوپر چھت اور دیواروں میں بےشمار دیے روشن تھے جن کی روشنی سے مندر کی فضا دن بن گئی تھی، علی مردان اور چندراوتی اگلی صف میں کھڑے اس سیلِ رنگ و نور سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ رقاصائیں اور گانے والیاں پیلے، سُرخ اور کئی دوسرے رنگوں کے کپڑوں میں ملبوس بھیم دیو کے اشارے کی منتظر کھڑی تھیں۔ بھیم دیو مہادیو کے پیچھے سے نمودار ہوا اور تمکنت سے چلتا ہوا مہادیو کے قدموں میں کھڑا ہوگیا۔ باری باری کچھ لوگوں نے چڑھاوے چڑھائے۔ پھر بھیم دیو نے ایک نوعمر اور نازک اندام رقاصہ کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ رقاصہ گھنگرو کھنکاتی آگے بڑھی اور مہادیو کے قدموں میں گر گئی۔ بھیم دیو نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھی اور بھیم دیو کی آنکھوں میں عقیدت اور احترام سے کچھ دیکھا پھر یکایک رقص شروع کر دیا۔ یہ تتلی کی طرح پرواز کرتی ہوئی کبھی مہادیو کے قدموں میں چلی جاتی اور کبھی اُلٹے قدموں تھرک کر واپس آتی اور مہادیو کے پرستاروں کے سامنے جھوم جھوم کر ناچنے لگتی۔ علی مردان کبھی اس نوعمر رقاصہ کو دیکھتا اور کبھی چندراوتی کو دیکھنے لگتا۔

ایک کے بعد ایک رقاصہ آگے بڑھی اور اپنے کمال کا مظاہرہ کر کے چلی گئی، پھر گانے والیوں کی باریاں آئیں اور انھوں نے نہایت لطیف سُروں میں مہادیو کی شان میں بھجن سنانے شروع کر دیے۔ چندراوتی کبھی شرکائے محفل کو دیکھتی اور کبھی علی مردان کو دیکھنے لگتی۔ رات کے پچھلے پہر جب یہ لوگ مندر سے باہر نکلے تو علی مردان کو سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس نے چندراوتی سے کہا۔"تم مجھے اپنی کٹیا میں لے چلو اور کھانا کھلواؤ!"

چندراوتی نے کہا۔"کیا تم دوسروں کے گھر کھانا کھانا پسند کرو گے؟ اور چھوت چھات محسوس نہیں کرو گے؟"

علی مردان نے جواب دیا۔"صبح تم نے رتن سین سے جیسی باتیں کی تھیں، ان سے رتن سین کو یہ شبہ گزرا تھا کہ تم ناستک ہوگئی ہو۔ اب جو بھوک نے مجھے ستا رکھا ہے تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بھوک میں سب کچھ جائز ہے۔ ویسے چار باتیں تو یوں بھی بہت مشہور ہیں!"

چندراوتی نے پلک جھپکائے بغیر علی مردان کو دیکھا اور پوچھنے لگی "کون سی چار باتیں؟ ذرا مجھے بھی تو بتانا؟"

علی مردان نے جواب دیا۔"مثل مشہور ہے بھوک نہ دیکھے جھوٹا بھات، عشق نہ دیکھے ذات بذات، نیند نہ دیکھے ٹوٹی کھاٹ اور پیاس نہ دیکھے دھوبی گھاٹ۔"

چندراوتی نے شوخی سے علی مردان کو دیکھا اور کہنے لگی۔"پھر بھی میں اپنے گھر کا کھانا نہیں کھلاؤں گی، میرا کھانا میرے لیے ہے صرف میرے لیے جسے تم ہضم نہیں کر سکو گے۔"

علی مردان طنز کرتے ہوئے بولا۔"نہ کھلانے کے ہزار بہانے۔ شاید تم بھول گئیں کہ تم اتنی قربت کے باوجود اتنی دور کی باتیں کر رہی ہو، کیا ہمارے درمیان اب بھی کوئی دُوری رہ گئی ہے؟"

چندراوتی ایک دم سنجیدہ ہوگئی، پوچھا۔"کیا ناراض ہوگئے؟"

"نہیں تو!"

"پھر ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟"

"میں خود ایسی باتیں نہیں کرتا، تم مجبور کرتی ہو تو کرنے لگتا ہوں!"

چندراوتی بےبسی سے بولی۔"تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے ست پال جی! میرے کھانے میں زہر ملا ہے، تم اسے کھا کر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

علی مردان نے آزردگی سے کہا۔"تم اپنی بابت سب کچھ کھُل کر کیوں نہیں بتا دیتیں چندراوتی؟ تم میں وِش بھرا ہے، تمھارے کھانے میں زہر

شامل ہے۔ تم یہ کیسی باتیں کرتی ہو۔"

چندراوتی شدّتِ جذبات سے رونے لگی۔ اس کا چہرہ تمتما گیا "بھگوان! میں کتنی مجبور ہوں، اپنے محبوب کو کسی طرح خوش بھی نہیں کرسکتی۔ اسے اپنے گھر کا کچھ کھلا بھی نہیں سکتی۔ تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے۔"

علی مردان اس عجیب و غریب دوشیزہ کو بس دیکھتا رہ گیا۔



چاند گرہن پڑ رہا تھا اس بُری ساعت میں سارے پجاری پریشان اور مضطرب پھر رہے تھے۔ سومنات جی کے سامنے انسانوں کا ایک ٹھٹھ لگا رہتا تھا۔ وشال پروہت بھیم دیو سومنات جی کے قدموں میں گھی کے دیے جلا رہا تھا۔ سومنات جی کے سامنے کی جگہ خالی چھٹی ہوئی تھی اور تقریباً دو بالشت دور پتھر کی ایک سل رکھی ہوئی تھی۔ سل کے پاس زرد رو اسماعیل بندھا پڑا تھا۔ مجمع کے لوگ اس طرح آ آ کر اسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو، اسماعیل کا زریں لباس دور کر دیا گیا تھا تاکہ دیکھنے والے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیں کہ وہ مسلمان ہے۔

چندراوتی اور علی مردان بھی اس کے قریب گئے۔ اسماعیل نے انھیں دُور ہی سے آتا دیکھ کر بڑبڑانا شروع کر دیا، اس طرح جیسے رسیوں کی بندش کے کرب سے تلملا رہا ہو۔ اس وقت وہ اپنی مادری زبان میں بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی اس بڑبڑاہٹ میں بھی علی مردان کے لیے پیغام تھا، وہ علی مردان سے کہہ رہا تھا۔

"سلطان ملتان تک آ چکا ہے۔ اسے میرے انجام سے مطلع کر دینا۔ میرا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ جب وہ سومنات کا قلعہ محاصرے میں لے لے تو تیروں کی نوک میں پیغامات باندھ کر سلطان کو مطلع کر دینا کہ قلعے کے صدر پھاٹک کے بائیں طرف سے قلعے پر چڑھنے کی کوشش کی جائے۔ وہاں ہاتھیوں کو اوپر لیجانے کی غرض سے قلعے کی فصیل بہت چوڑی کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے سلطان کے ہزاروں آدمی اوپر اپنے قدم جما سکتے ہیں اور سلطان کو یہ بھی بتا دینا کہ سومنات کے لوگ جوش اور عمل کے بجائے سومنات کی کرامت پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں اور ہاں ایک بات اور، زہریلی ناگن (چندراوتی) سے ہوشیار رہنا اور سلطان کو بھی اس کے زہر سے بچانے کی کوشش کرنا۔ پروہت جی اس کی مدد سے معلوم نہیں کس طرح سلطان کو ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ خطرناک ناگن سلطان کو ڈس کر ہلاک کر دینا چاہے گی۔ سلطان کو اس کی زد سے محفوظ رکھنا۔"

ایک وحشی اور اُجڈ پنڈت آگے بڑھا اور اسماعیل کا منہ بند کر دیا۔

علی مردان سے یہ منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا لیکن دیکھنے پر مجبور تھا۔

پھر ایک کرخت مزاج اور سخت خدوخال کا ننگ دھڑنگ، سیاہ، دیو قامت شخص گنڈاسا لے کر آگے بڑھا اور اسماعیل کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وشال پروہت بھیم دیو نے گردن اٹھائی اور آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

"سومنات جی کے پجاریو اور خدمت گزارو! یہ ناپاک شخص جو سومنات جی کے روبرو بندھا پڑا ہے، مسلمانوں کے بادشاہ کا جاسوس تھا، اس نے غزنی کے بادشاہ محمود کو سومنات کے راز بھیج دیے ہیں اور اب اُس کی حریص نظریں سومنات کی طرف اُٹھ چکی ہیں۔ اس شخص کا جاسوسی کے علاوہ ایک دوسرا سنگین جرم بھی ہے۔ یہ مسلمان تھا اور دھوکے سے ہمارے مندروں میں داخل ہو کر ہماری وشال دھرتی اور پوتر بھومی کو ناپاک کرتا رہا ہے۔ شاید اسی وجہ سے مہادیو نے ہم پر یہ عتاب نازل کیا ہے کہ سوم جی گرہن کی وجہ سے سخت مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ سوم جی کو اس مصیبت سے نجات دلانے اور اس مسلمان کے ناپاک قدموں کی گندگی کے پرائشچت کے لیے ہمیں اسے بھینٹ چڑھانا پڑے گا۔ سومنات جی اس کی بھینٹ چاہتے ہیں۔ جب اس کا گرم گرم خون سومنات جی کے چرنوں میں جائے گا تو انھیں سکون پہنچے گا اور ان کے غصے اور عتاب میں کمی آ جائے گی!"

پھر اچانک ان سب پر جنون کا دورہ پڑ گیا۔ سبھی اسماعیل پر ٹوٹ پڑے اور اسے زدوکوب کرنے لگے لیکن بھیم دیو نے انھیں ہٹا دیا اور چندراوتی کو اشارے سے قریب بلایا۔ چندراوتی بھیم دیو کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

بھیم دیو نے علی مردان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چندراوتی! کیا تو نے متھرا کے اس یاتری کی بابت اپنا اطمینان کر لیا ہے؟"

چندراوتی نے جواب دیا۔ "ہاں وشال پروہت جی!"

بھیم دیو نے دل میں اُتر جانے والی نظروں سے چندراوتی کو گھورا اور کہنے لگا۔ "اس یاتری سے کہو کہ سومنات جی نے اپنی خدمت کا اسے بہترین موقع عطا کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ دو قدم آگے بڑھے اور جلّاد کے ہاتھ سے گنڈاسا لے کر اس ملکش کا سر اپنے ایک وار سے الگ کر دے۔"

چندراوتی اس حکم سے گھبرا گئی۔ وشال پروہت سے بحث کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ چپ چاپ علی مردان کے پاس واپس گئی اور بجھی بجھی آواز میں بھیم دیو کا حکم سنایا۔ علی مردان کو ایسا لگا جیسے چندراوتی کی آواز لوہے کی سلاخ بن کر دماغ سے اُتر کر دل میں ڈوب گئی ہے۔ انکار یا تامل کا کوئی موقع نہ تھا۔ وہ کچھ سوچے بغیر آگے بڑھا اور سیاہ قامت دیو سے گنڈاسا لے لیا۔ اسماعیل نے سہم کر علی مردان کو دیکھا اور بین کرنے کے انداز

میں غیر ہندی زبان میں پوچھا۔ "تو مجھے تم قتل کرو گے؟ لیکن میری زندگی کے دن اس عورت کے زہر کی وجہ سے پہلے ہی کم ہو گئے تھے۔"

علی مردان نے کوئی جواب نہ دیا۔ گنڈاسے والا ہاتھ اوپر اٹھا اور پوری قوت سے نیچے گر کر اسماعیل کا سر جسم سے الگ کر دیا۔ اسماعیل کا جسم پھڑکنے لگا۔ خون کی دھار فوارے کی طرح اچھلی اور سومنات جی کے چرن تر کرنے لگی۔ کچھ چھینٹے علی مردان کی دھوتی بھی تر کر گئے۔ چاروں طرف سے عجیب قسم کا شور غل بلند ہوا اور بعض پنڈت زور زور سے اشلوک پڑھنے لگے۔ علی مردان کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے اور چندراوتی کو ساتھ لیے یہ خونیں منظر چھوڑ کر چلا آیا۔



اسماعیل کی موت کے بعد متھرا کے بارے میں پرشبہ نہیں کیا گیا۔ چندراوتی اس سے اور زیادہ قریب ہو گئی۔ دوسری طرف رتن سین کے لیے علی مردان ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ سوریہ دیوتا کا ایک دوسرا بت بنانے میں مصروف تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ سوریہ دیوتا کا یہ بت بنانے میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً دیوتا اس پر مہربانی کرے گا اور چندراوتی کا وش چوس کر اسے عام اور بے ضرر عورت بنا دے گا۔

بحیرۂ عرب کی ہوائیں جسموں کو چپ چپا رہی تھیں جس سے طبیعتوں میں کسل مندی اور سستی پیدا ہو گئی تھی۔ چاروں طرف افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ مسلمان سومنات کے قریب آ چکے ہیں۔ قلعے کے دروازے بند کیے جا چکے تھے اور اونچی اونچی برجیوں اور فصیلوں سے اہل سومنات محمودی لشکر کا انتظار کر رہے تھے۔ پورے شہر میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور سومنات کے فدائیوں کے دلوں میں جوش اور ہیجان کے ساتھ ہی غزنوی کی ہیبت اور خوف بھی کارفرما تھا۔

چندراوتی مختلف قسم کے ابٹنوں اور مسالوں سے اپنے جسم میں اور زیادہ نکھار پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ علی مردان سے بھی کم ہی ملتی تھی۔ ہاں رتن سین کی آمد و رفت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سلطان کی آمد سے پہلے ہی علی مردان موقع پا کر سومنات سے نکل جانا چاہتا تھا اور جانے سے پہلے چندراوتی سے ایک طویل ملاقات کا خواہش مند تھا۔

ایک دن صبح ہی صبح رتن سین چندراوتی کو تلاش کرتا ہوا علی مردان کے حجرے میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد چندراوتی بھی وہیں پہنچ گئی۔ چندراوتی نے دونوں کو مخاطب کیا۔ "رتن سین! میں ست پال جی کے سامنے تم سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ پتہ نہیں کل کیا ہو جائے اسی لیے میں ایک اہم بات کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔"

رتن سین کے ساتھ ہی علی مردان بھی ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

چندراوتی کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں کو اپنے آئندہ منصوبے سے مطلع کر دوں اور یہ بتا دوں کہ تم دونوں میں سے کوئی ایک مجھ ابھاگن کو کس طرح اور کس شرط پر حاصل کر سکتا ہے۔" پھر علی مردان کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "لیکن میں رتن سین کی تڑپ اور لگن بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔"

علی مردان کا دل ڈوبنے لگا۔ بولا۔ "چندراوتی! میں متھرا واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر اس سفر میں تم میرا ساتھ دو گی تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا ورنہ کوئی شکایت بھی نہ کروں گا۔"

رتن سین سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ علی مردان کی آواز پر اس نے اپنا سر اٹھایا اور غمزدہ آواز میں بولا۔ "ست پال جی! تم ابھی متھرا واپس نہ جاؤ۔ یہیں رہو۔ غزنی کا بادشاہ آج یا کل میں آنے والا ہے۔ وہ سومنات پر لشکر کشی کرے گا اور اس جنگ کا وہی نتیجہ نکلے گا جو اب تک مسلمانوں سے جنگ کرنے کا نکلتا رہا ہے۔ سوریہ دیوتا کا غلطی سے بڑا بن جانے والا بت ہمیں بتا چکا ہے کہ ہمیں شکست ہو جائے گی۔ اگر ہمیں شکست ہو گئی تو میں خود میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی موت مر چکا ہوں گا۔ اس وقت چندراوتی کو تمہاری ضرورت شدت سے محسوس ہو گی۔"

چندراوتی رتن سین کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی۔ بولی۔ "تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ اگر جنگ میں ہمیں شکست ہی ہو گئی تو تم میدان جنگ ہی میں مارے جاؤ گے؟"

رتن سین نے اداس نظروں سے چندراوتی کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "چندراوتی! تمہیں معلوم ہے کہ میں سوریہ دیوتا کا ایک دوسرا بت بنا رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا تناسب قائم رکھوں لیکن ناکام رہا اور سوریہ دیوتا بہت چھوٹے بن گئے اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اگر سوریہ دیوتا تناسب سے چھوٹے بن جائیں تو بنانے والے پر ان کا عتاب ضرور نازل ہوتا ہے اور وہ شخص تباہ و برباد ہو کر اپنی جان تک سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو چکا ہے۔ اس لیے میرا اب کوئی مستقبل نہیں ______ مستقبل نہ زندگی کچھ بھی نہیں!"

"پھر بھی میری ایک خواہش ہے۔" چندراوتی کہنے لگی۔ "میں عنقریب سومنات سے باہر چلی جاؤں گی اور غزنی کے بادشاہ تک کسی بھی طرح رسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ محمود میرے حسن کا گرویدہ ہو جائے گا اور مجھے اپنے حرم میں ڈال لے گا۔ بس میرا اس کے ساتھ چند راتیں گزار لینا ہی کافی ہو گا۔ پھر سلطان کو دنیا کی کوئی طاقت بھی مرنے سے بچا سکے گی۔"

علی مردان نے کہا۔ "تم اپنی خواہش بیان کرو۔"

چندراوتی نے کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ایک مرد کی ضرورت ہے، جو مجھے اپنی بیوی بنا کے مسلمانوں کے لشکر کے سامنے سے گزرے۔ مسلمان میرے حُسن سے متاثر ہو کر گرفتار کر لیں گے اور مجھے اپنے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ رتن سین میرے ساتھ ہے اور گرفتاری پر پہلے تو وہ شور غل مچاتے۔ اس کے بعد سلطان سے مرعوب ہو کر مجھے بخوشی سلطان کے حوالے کر دے اور پھر جب میں سلطان کا کام تمام کر کے چوری سے فرار ہونے کی کوشش کروں تو رتن سین میرے ساتھ فرار ہونے میں میری مدد کرے۔"

رتن سین نے مایوسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے سوچ سمجھ کر ایسی خواہش کی ہے جسے پورا کرنا کم از کم میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں سپاہی ہوں اور میں اس وقت میدان جنگ میں ہوں گا۔ تمہارے ساتھ نہیں۔ تمہارا ساتھ متھرا کا یاتری ہی دے سکتا ہے۔"

چندراوتی نے تکلیف دہ لہجے میں کہا۔ "شرط جیت کر مجھے حاصل کر لینا کوئی خوش آیند بات نہیں ہے۔ میں جس کسی کے حصے میں آؤں گی، وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی خطرے میں ڈال لے گا۔ میں کسی کے لیے بھی کارآمد نہیں ہوں لیکن چونکہ تم دونوں مجھ سے محبت کرتے ہو اور میرے طلب گار ہو۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ تم دونوں کا دل نہ توڑوں اور ظاہر ہے مجھے تم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ویسے ست پال جی آدمی بہت اچھے ہیں۔ میں انھیں بہت زیادہ پسند کرتی ہوں۔"

وہیں دشال پروہت بھیم دیو بھی پہنچ گیا اور یہ خبر سنا دی کہ غزنی کا بادشاہ اپنی افواج سمیت دریائے سرستی کے کنارے فصیل کے نیچے خیمہ زن ہو چکا ہے۔

یہ خبر سنتے ہی رتن سین اٹھ کھڑا ہوا، بولا۔ "اچھا چندراوتی! ہتھیار مجھے آواز دے رہے ہیں، میں چلا۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی، نہ رہی تو تمہاری یاد لیے موت کا سواگت کروں گا۔"

چندراوتی بھی کھڑی ہو گئی اور علی مردان یا بھیم دیو کا ادب لحاظ کیے بغیر ہی رتن سین سے ہم آغوش ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پیار کیا اور پھر جدا ہو گئے۔



اب رتن سین دونوں کے درمیان سے ہٹ چکا تھا۔ مسلمانوں کی فوجیں قلعے کی فصیل کے قریب خیمہ زن تھیں اور دریائے سرستی کے کنارے کنارے دور تک ملے کرتوں، عماموں اور لوہے کے خود پہنے یہ اجنبی سپاہ حوصلہ مندانہ شان سے سومنات کے قلعے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان حالات میں چندراوتی کو ایک نہایت اہم کام انجام دینا تھا۔

اُس وقت تقریباً سناٹا تھا۔ علی مردان سومنات جی کے روبرو کھڑا چندراوتی کا انتظار کر رہا تھا۔ سومنات جی کے قدموں میں چڑھائے جانے والے سونے کی وافر مقدار ڈھیر تھی۔ علی مردان عقیدت مندوں کے اندھے اعتقاد پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظریں سومنات جی کے پچھلے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے ایک مست اور لڑکھڑاتی حسینہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ ذرا قریب آ گئی تو علی مردان نے پہچان لیا کہ یہ چندراوتی ہے۔

لیکن اس وقت چندراوتی کی شان ہی کچھ اور تھی۔ گلے میں کالا ناگ لپٹا ہوا تھا۔ اس کا پھن چندراوتی کی گردن پر تھا۔ بار بار شعلے جیسی زبان لپکتی اور گردن پر ٹہوکا سا لگا کر پھن میں غائب ہو جاتی۔ علی مردان سمجھا، اب چندراوتی بس کچھ ہی دیر کی مہمان ہے لیکن شرابیوں کی طرح نشے میں چور وہ علی مردان کے سامنے پہنچ گئی اور بہکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ست پال جی

اورنگ زیب کی وفات کو سات سال گزر چکے تھے۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ مغلیہ سردار قمرالدین علی خاں کو تسخیر دکن کا خیال آیا۔ یہ سردار مشہور بزرگ شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ کی خدمت میں پہنچا اور اپنا مقصد بیان کر کے روحانی امداد کا طالب ہوا۔

کلیم اللہ جہان آبادیؒ نے کچھ سکوت کے بعد جواب دیا "دکن کا علاقہ شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے سپرد ہے۔ ان کے پاس جاؤ اور مدد طلب کرو۔"

قمرالدین علی خاں نے کہا "حضرت آپ ان کے نام سفارشی چٹھی لکھ دیں تو بڑا کرم ہوگا۔"

شیخ نے ٹالنا چاہا، لیکن سردار مُصر رہا۔ بالآخر شیخ کلیم اللہؒ نے ایک ٹھیکری پر لکھ دیا۔

"کُتّا آرہا ہے، ہڈّی ڈال دو۔"

مغلیہ سردار نے دکن پہنچ کر وہ ٹھیکری شیخ نظام الدینؒ کے حوالے کر دی۔ شیخ نے ٹھیکری کو ادب سے بوسہ دیا اور سردار کو اپنے سامنے بٹھا کر اس کے سر پر ایک زرد رومال باندھ دیا اور فرمایا "آج سے تو نظام ہے۔"

اس کے بعد مغل سردار نے فوجیں تیار کر کے دکن پر حملہ کر دیا اور پوری ریاست فتح کر لی۔

برسرِاقتدار آنے کے بعد قمرالدین علی خاں نے شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے نام کی رعایت اور فیضانِ روحانی کے خیال سے لقب نظام الملک آصف جاہ اختیار کیا اور زرد رنگ کی دستار کو شاہی لباس کا جزو بنا لیا۔

تمھیں میری چاہت کا دعوا ہے نا؟"

علی مردان نے جواب دیا۔ "ہاں بالکل۔ کیا تمھیں اب بھی شبہ ہے چندراوتی؟"

چندراوتی نے شرابیوں کی طرح جواب دیا۔ "آج تمھیں سومنات جی کے دیدوا اپنی چاہت کی سوگند کھانا پڑے گی۔ یہاں ہم دونوں عہد کریں گے کہ دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کے ہوتے ہوئے کسی اور سے شادی نہیں کریں گے۔"

علی مردان نے گلے کے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن گلے سے اسے تو دور تو کرو۔ مجھے تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے چندراوتی!"

چندراوتی لڑکھڑائی لیکن پھر سنبھل گئی۔ علی مردان نے کہا۔ "تمھیں یہ ہو کیا گیا ہے چندراوتی؟ کیا کسی وید کو بلواؤں؟ تمھیں تو سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

چندراوتی نے مست مخمور نظروں سے علی مردان کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ "تم میری فکر نہ کرو۔ یہ سانپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ اگر میں چاہوں تو اس سانپ کو ہلاک کر سکتی ہوں۔"

"وہ کس طرح؟"

چندراوتی نے سانپ کو گردن سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ اور اسے کئی جگہ سے دانتوں سے کاٹ لیا۔ سانپ تڑپا، اچھلا اور کئی بار چندراوتی پر منہ بھی مارا لیکن بے سود، آخر سانپ بھی جھومنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سانپ مر گیا۔ چندراوتی نے ناگ دیو کو ایک کونے میں پڑی ہوئی سیتل پالی کے نیچے چھپا دیا اور پھر اپنی جگہ واپس آگئی۔ علی مردان یہ دیکھ کر دہل گیا لیکن کچھ دیر بعد چندراوتی اپنی اصل حالت میں آگئی۔ ایک معصوم اور خوب صورت دوشیزہ کے روپ میں۔

چندراوتی اور علی مردان سومنات جی کے دیدو گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور زندگی بھر ایک دوسرے کے ہوتے ہوئے شادی نہ کرنے کا عہد کیا۔ علی مردان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ چندراوتی کے احکام کی تعمیل کرے۔

علی مردان نے سرگوشی میں کہا۔ "سومنات جی! میں نے چندراوتی کو دل و جان سے چاہا ہے اور تمھارے سامنے اس بات کی قسم کھاتا ہوں کہ تازیست چندراوتی کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت سے شادی نہ کروں گا۔"

چندراوتی نے اٹھلا کر لڑکھڑائی آواز میں کہا۔ "سومنات جی! تمھاری یہ داسی بھی اس بات کا عہد کرتی ہے کہ میں متھرا کے یاتری ست پال جی کے سوا کسی اور کو نہیں چاہوں گی اور ان کے ہوتے ہوئے کسی اور مرد کی طرف آنکھ تک نہ اٹھاؤں گی۔"

پھر چندراوتی تو سجدے میں چلی گئی لیکن علی مردان گلوخلاصی کی تدبیریں سوچنے لگا۔

جب یہ دونوں ایک دوسرے سے موت اور زندگی کا عہد و پیمان کر کے باہر نکلے تو دونوں کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے چندراوتی کا تو انگ انگ مست و سرشار تھا۔

راستے میں علی مردان نے اس سے پوچھا۔ "چندراوتی! تمھاری ہر بات عجیب ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ ناگ والا واقعہ کیا اور کیوں ہے؟"

چندراوتی پھیکی ہنسی ہنس دی، بولی۔ "ناگ تو میری غذا ہیں ست پال جی! جب جسم ٹوٹنے لگتا ہے اور اعضا میں ایک قسم کا کھنچاؤ اور سستی پیدا ہونے لگتی ہے تو میں ناگ سے ڈسوا کر چاق و چوبند ہو جاتی ہوں۔"

پھر علی مردان کو خوف سا محسوس ہوا لیکن چندراوتی کے حسن کا سحر ہر خوف پر حاوی تھا۔



علی مردان کے لیے قلعے سے باہر نکلنا آسان کام نہ تھا لیکن بھیم دیو اور چندراوتی نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا اور یہ مشکل آسان ہو گئی۔ اس رات چندراوتی اور علی مردان قلعے کے مغربی دروازے سے نکلے اور چوری سے بھاگنے کے انداز میں بچتے بچاتے محمود کے لشکر کے قریب سے گزرے۔ یہ ۹ر جنوری ۱۰۲۶ء جمعرات کا دن تھا۔ کہرا آلود فضا میں محمود کے سپاہی دریائے سرستی کے کنارے خیمہ زن تھے۔ مسلمانوں نے چندراوتی اور علی مردان کو پکڑ لیا۔ انھیں شبہ تھا کہ یہ جوڑا اپنے ساتھ کوئی خاص پیغام یا راز لے کر کسی ہندو راجا کے پاس جا رہا ہے۔ چندراوتی کے حسن و جمال نے سبھی کو متاثر کیا۔ جہاں یہ لوگ پکڑے گئے تھے وہاں سے محمود تقریباً ایک میل دور تھا۔ سپاہیوں نے ان دونوں کو الگ الگ قید کر دیا اور ان سے راز اگلوانے کی کوششیں کرنے لگے۔ علی مردان نے اپنی بابت جو کچھ بتایا، کوئی اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

چندراوتی یہ کہتی تھی کہ "مجھے اپنے بادشاہ کے دربار میں لے چلو۔ مجھے جو کچھ بتانا ہے اسی کو بتاؤں گی۔"

اور علی مردان بے چین ہو ہو کر اپنے نگراں سپاہیوں سے یہ درخواست کر رہا تھا کہ "خدا کے لیے چندراوتی کو محمود سے نہ ملانا، وہ خطرناک عورت ہے۔"

دونوں کی تضاد بیانی سے محمود کے آدمیوں کو یہ شبہ ہوا، کہ یہ دونوں ہی اہم شخصیتیں ہیں اور یہ یقیناً کسی اہم منصوبے سے کہیں جا رہے تھے اور کمزور دل عورت محمود سے شاید اس لیے ملنا چاہتی ہے کہ جو کچھ اسے معلوم ہے جلد از جلد محمود کو بتا کر گلو خلاصی حاصل کر لے۔ اس کے برعکس مرد، عورت کو محمود سے یوں دور رکھنا چاہتا ہے کہ ان کا راز راز ہی رہے۔

علی مردان ناکام رہا اور چندراوتی کو محمود کی خدمت میں پیش کر دیا گیا

چندراوتی کے پاس ناز و انداز کے جتنے تیر تھے، سبھی محمود پر چلانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ، آواز کی کھنک، چال کا مستانہ انداز، گاہ ہنس کر محمود کے دل پر بجلی گرانے کی کوشش کرتی۔ گاہ ملول ہو کر چہرے کو سوگواریت کے سحر کا ناقابلِ خطا نشانہ بخشتی۔

محمود نے اس پیکرِ رعنائی کو غور سے دیکھا اور بے چین ہو گیا۔ ایسا متناسب اور دلکش نسائی روپ اس نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ محمود کے داہنی طرف ملک ایاز کھڑا تھا۔ وہ ملک ایاز، جس میں عقل اور حُسن یکجا ہو گئے تھے، والیٔ کشمیر کا فرزند، جسے بردہ فروشوں نے اغوا کر کے بدخشاں میں فروخت کر دیا تھا۔ اور پھر اس کی رسا قسمت نے اسے محمود تک پہنچا دیا تھا۔

محمود نے ایاز کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ "ایاز! اس فتنۂ خرد و نظر سے پوچھو، یہ ہمیں کیا بتانا چاہتی ہے"؟

رعبِ سلطانی اور اقبالِ محمودی نے چندراوتی کی ساری تیزی و طراری ہوا کر دی تھی۔

ایاز نے اس سے بیسیوں سوالات کر ڈالے اور آخر ـــ اس نتیجے پر پہنچا کہ حسن و جمال کی ساحرہ ـــ اپنے اصل منصوبے کے سوا سب کچھ بتا سکتی ہے۔ ہر سوال کے جواب میں چندراوتی نے یہی جواب دیا کہ "مجھے جو کچھ بتانا ہے سلطان کو تخلیے میں بتاؤں گی"۔

جب ایاز نے سلطان کو اپنی کوشش کے لبِ لباب سے آگاہ کیا تو محمود نے لاپروائی اور بے نیازی سے حکم دیا۔ "لڑکی کو سخت نگرانی میں رکھا جائے۔ ہم غزنی پہنچ کر اس سے ملاقات کریں گے"۔ پھر ایاز سے کہا۔ "ملک ایاز! تم اس لڑکی سے کہو کہ ہماری کمزوری عورت نہیں بلکہ نئے اور مضبوط قلعوں کی تسخیر ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں ہندی عورتیں فتح کر لیں"۔

چندراوتی کو ایک خیمے میں قید کر دیا گیا۔

ادھر علی مردان بہت پریشان تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں چندراوتی اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جائے لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سلطان نے اُسے ایک خیمے میں قید کر دیا ہے تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

سلطان کی ایما پر ایاز، علی مردان کے پاس پوچھ گچھ کرنے پہنچا اور جب اصل حقیقت کا اظہار ہوا تو اس نے علی مردان کو محمود سے ملا دیا۔ علی مردان نے ساری روداد سنا دی اور آخر میں بتایا۔ "چندراوتی کی بابت اس غلام کو بس اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ اس کے وجود میں زہر شامل ہے اور سومنات کے فوجی اور مندر کے بڑے پروہت نے اسے سلطان کی خدمت میں بھیج کر حضور کی ہلاکت کا منصوبہ بنایا تھا اور اس کے باوجود کہ سلطان کا یہ غلام نہیں چاہتا کہ چندراوتی کو کوئی نقصان پہنچے، بار بار یہی کہے گا کہ اس عورت پر سلطان کو اعتبار نہیں کرنا چاہیے"۔

محمود نے بے نیازی سے کہا۔ "جب بقول تیرے اس عورت کے وجود میں زہر گھلا ہوا ہے تو پھر تو اس میں کیوں دلچسپی لیتا ہے۔ ناگن کو ڈسنے کے لیے پالنا کہاں کی دانشمندی ہے؟"

علی مردان گھگھیا گیا، بولا۔ "غلام کی منشا تو یہی تھی۔ ویسے حضور کی جیسی مرضی ہو، اس کا حکم صادر فرما دیں"۔

اسماعیل کی ہلاکت کا حال سن کر محمود کو دکھ پہنچا۔

سومنات کی برجیوں اور فصیلوں پر ہندوؤں کا ہجوم تھا اور وہ چیخ چیخ کر مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ اے مسلمانو! تم نے اب تک جو گناہ اور مندروں کو تباہ و برباد کر کے جو پاپ کیے ہیں، سومنات جی نے ان کی سزا دینے کے لیے تمھیں یہاں تک پہنچا دیا ہے، اب تم واپس نہیں جا سکتے"۔

اوپر سے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور نیچے مسلمان قلعے کی فصیل تک پہنچ چکے تھے۔ تیروں کی بارش ان کے ارادوں میں حائل ہونے سے

معذور بھی سیڑھیوں کی مدد سے قلعے پر چڑھنے والے مسلمان زخمی ہو ہو کر نیچے گر رہے تھے اور سیڑھیوں کی خالی جگہ دوسرے سپاہی لے لیتے تھے۔ مسلمان تیرانداز بھی تیروں کی بوچھاڑ سے فصیل کی ہندو سپاہ کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔

اس جدوجہد میں شام ہو گئی اور دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے گئے۔

دوسرے دن تازہ دم سپاہ پھر فصیل پر چڑھنے لگی اور ہندوؤں کی زبردست مزاحمت کے باوجود اوپر چڑھ گئی۔ تیراندازی موقوف ہوئی اور نیزے، برچھیاں اور تلواریں انسانوں کو ہلاک اور زخمی کرنے لگیں۔ مسلمانوں کی شجاعت اور بے جگری سے خوفزدہ ہو کر سومنات کے پجاری، مندر میں داخل ہوئے اور اس سے لپٹ کر گریہ زاری کرنے لگے۔ محمودی سپاہ مندر کے دروازے تک پہنچ گئی۔ ہندو سپاہ مندر سے نکلی اور دیوانہ وار مسلمانوں پر ٹوٹ پڑی۔ ان کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ کئی جگہ سے مسلمان پسپا ہو گئے۔ لیکن شام تک مجموعی حیثیت سے مسلمان حاوی رہے۔ رات کی سیاہی نے دونوں افواج کو اپنی اپنی جگہ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ قلعے کا پھاٹک کھل گیا لیکن ابھی سومنات جی محفوظ تھے اور ایک فیصلہ کن معرکہ باقی تھا۔ محمود نے قلعے کے پھاٹک پر ایک طاقتور دستہ بٹھا دیا اور خود بیرونِ قلعہ لشکر میں واپس چلا گیا۔

تیسرے دن صبح محمود یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قرب و جوار کے ہندو راجاؤں کی فوجیں اسے محاصرے میں لے چکی تھیں اور یہ ساری تازہ دم فوجیں تھیں۔ محمود نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں علی مردان نے ایاز کی بات گوش گزار کی کہ اگر جنگ فوراً شروع کی گئی تو ہندوؤں کو مزید کمک مل جائے گی اور ان کا مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔ محمود سخت پریشان تھا۔ غزنی سے ہزاروں میل دور تھکی ہوئی سپاہ، واپسی یا فرار کی راہیں مسدود، دشمنوں کے علاقے، حریف کی کثرت، یہ ساری باتیں محمود کو پریشان کر رہی تھیں۔

محمود فوری جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ مجلسِ مشاورت سے اٹھ کر ایک گوشے میں چلا گیا۔ خرقان کے مشہور بزرگ شیخ ابوالحسن کا خرقہ سامنے بچھا کر سجدے میں گر گیا اور رو رو کر گریہ زاری کرنے لگا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"اے رب العالمین! اس خرقے کے مالک کے طفیل دشمنوں پر فتح عطا فرما۔ تو جانتا ہے کہ تیرا یہ عاجز بندہ دیارِ ہند کے سب سے بڑے بُت کی شکست و ریخت کے لیے یہاں آیا ہے، تو اپنے اس ناچیز کی مدد فرما۔"

پھر جب دونوں لشکر آمنے سامنے صف آرا ہوئے تو محمود نے اپنی سپاہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"مسلمانو! آج ہمیں تم سے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے تمہیں صرف یہ بتانا ہے کہ دشمنوں کی کثرت سے تم خوفزدہ ہرگز نہ ہونا۔ جنگ کے دوران یہ بات ذہن نشین رکھنا کہ غزنی یہاں سے بہت دور ہے لیکن جنّت بہت قریب ہے۔"

اس کے بعد جو خونریز جنگ ہوئی تو شام سے پہلے ہی اس کا فیصلہ محمود کے حق میں ہو چکا تھا۔ محاصرین کی بے شمار تعداد قتل اور بقیہ فرار ہو چکے تھے۔ محمود، علی مردان کی رہنمائی میں کرّوفر کے ساتھ سومنات کے مندر میں داخل ہو گیا۔ اندر مفتوح اور شکست خوردہ وشال پروہت بھیم دیو اور دوسرے پجاری صف بستہ بت کے سامنے کھڑے رو رہے تھے۔ محمود اپنے امرا کے ساتھ بُت کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بھاری گُرز تھا۔ علی مردان ہندوانے لباس میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بھیم دیو نے اسے حیرت سے دیکھا اور نظریں جھکا لیں اور اپنی زبان میں بولا۔ "تو ہم نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی تھی۔" پھر درخواست کی۔ "ست پال جی! ہم تمہارے اصل نام سے واقف نہیں ہیں ورنہ اسی نام سے مخاطب کرتے۔ تم اپنے بادشاہ سے ہماری سفارش کر دو، وہ جتنی دولت چاہے ہم سے لے لے لیکن سومنات جی کو نہ توڑے۔"

محمود نے علی مردان سے پوچھا۔ "یہ کیا کہتا ہے؟"

علی مردان نے صاف صاف بتا دیا۔ محمود نے اپنے امرا سے مشورہ کیا۔ "کیا ہمیں اس پروہت کا کہنا مان لینا چاہیے؟"

ایاز نے مشورہ دیا۔ "اگر ہم اس کی پیش کش مان لیں تو زیادہ اچھا ہے۔ اس طرح ہم نہ صرف ان کے دل جیت لیں گے بلکہ سومنات کے بدلے خاصی دولت بھی حاصل کر لیں گے۔"

"اور اگر ہم پروہت کی پیش کش ٹھکرا دیں تو؟" محمود نے کچھ سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

"تب پھر۔" ایاز کہنے لگا۔ "ہم مفتوحین کے دلوں میں اپنے لیے نفرت کے بیج بو دیں گے اور یہ بات بھی طے ہے کہ ایک سومنات توڑ دینے سے سلطان پورے ہندوستان کی بت پرستی نہیں ختم کر سکیں گے۔"

محمود نے ذرا تامّل کیا۔ پھر کہا۔ "ملک ایاز! ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہمارے بعد لوگ ہمیں بُت فروش محمود کہہ کر پکاریں۔ ہم محمودِ بُت شکن کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

وفعتہً محمود کا گرز والا ہاتھ اوپر اٹھا اور سومنات پر پوری قوت سے گرا۔ بت کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ کر ادھر ادھر منتشر ہو گیا۔ بھیم دیو اور دوسرے پجاری چیخ مار کر رو دیے۔

بت کا اوپری چھالیے کی طرح گول حصہ عین اس جگہ گرا جہاں اسماعیل کے خون کا بڑا دھبا سیاہ پڑ چکا تھا۔

علی مردان سلطان سے نظریں بچا کر اس پر جھک گیا اور آہستہ سے کہا۔ "اسماعیل! تمھارا خون رائیگاں نہیں گیا۔ جس سومنات کے قدموں میں تمھیں قربان کیا گیا تھا، آج وہیں تمھارے خون پر خود سومنات قربان کر دیا گیا ہے!"

علی مردان محمود کی اجازت کے بعد چندراوتی سے ملنے گیا۔ وہ مغموم اور اداس خیمے میں بیٹھی تھی۔ علی مردان نے اسے مطلع کیا۔ "چندراوتی! سومنات فتح ہو گیا ہے اور آج مندر اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اب تمھارے حجروں میں محمودی سپاہ رہ رہی ہے۔"

چندراوتی پر اس بری خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ٹکٹکی لگائے ذرا دیر علی مردان کو دیکھتی رہی، پھر پوچھا۔ "اور کیا ہوا؟"

علی مردان نے جواب دیا۔ "اور سومنات جی کو سلطان کے گرز نے پارہ پارہ کر دیا اور سومنات جی کا سر ٹوٹ کر وہیں گرا، جہاں اسماعیل نامی مسلمان قتل کیا گیا تھا۔"

چندراوتی نے غیر جذباتی لہجے میں پوچھا۔ "سومنات جی ٹوٹ گئے اور اسے توڑنے والے اب بھی زندہ ہیں؟"

"ہاں!" علی مردان نے جواب دیا۔ "نہ صرف زندہ ہیں بلکہ انھیں تو سومنات جی کا بیش بہا خزانہ بھی ہاتھ لگا ہے جس کی قیمت کا اندازہ سوا پانچ کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔"

چندراوتی نے پوچھا۔ "وشال پروہت کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "وہ کہیں چلے گئے۔ کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

چندراوتی نے نیا سوال کیا۔ "رتن سین کہاں ہے؟"

علی مردان نے جواب دیا۔ "اس کا بھی کچھ پتہ نہیں، شاید وہ میدان جنگ میں مارا جا چکا ہے!"

چندراوتی نے ایک بار پھر علی مردان کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔

"اور وہ متھرا کا یاتری کہاں گیا؟"

علی مردان جھینپ گیا اور اس سے فوری کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شرما کر بولا۔ "میں تمھارے سامنے جو کھڑا ہوں۔"

چندراوتی نے پوچھا۔ "تمھیں کوئی سزا نہیں دی گئی؟"

"نہیں!" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "نہ صرف یہ کہ مجھے کوئی سزا نہیں دی گئی بلکہ میری وجہ سے تم خود عتاب سلطانی سے محفوظ ہو۔"

چندراوتی ہارے ہوئے، اپنی قسمت پر شاکر سپاہی کے انداز میں بولی۔ "ست پال جی! خوب! اب تم اپنی اصل پر آ گئے — تم یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ میری آنکھوں نے تمھیں پہچانا نہیں تھا لیکن یہ میرا ناستک پنا اور دل کا جھکاؤ تھا جس نے تمھیں زندہ رکھا۔ میں اندر سے بہت دکھی ہوں اور اسی دکھ نے مجھے بے حد رحم دل بنا دیا ہے۔ تم مسلمان ہو — یہ بات میں بہت دنوں سے جانتی ہوں۔"

علی مردان کی وہ حالت ہوئی جو کسی چور کی ایک ایسے شخص کے روبرو ہوا کرتی ہے جو جانتے بوجھتے اپنے مال کی چوری کرتا رہا ہو اور آخر اس کا چور پر انکشاف ہو جائے۔

علی مردان نے افسوس سے کہا۔ "چندراوتی! میں جس مقصد سے سومنات آیا تھا، وہ پورا ہو چکا ہے۔ ہم موحد لوگ سومنات والوں کا تکبر اور کفر خاک میں ملانے آئے تھے۔ تم نے مجھ پر جو احسانات کیے ہیں ان کا اتارنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی تم جیسا چاہو گی، اسے ٹالا نہیں جائے گا میرا اور تمھارا عہد اپنی جگہ برقرار رہے گا مگر شاید اس صورت حال میں تم اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکو۔"

چندراوتی نے ہنس کر کہا۔ "اگر کر سکو تو ایک کام کر دو۔"

"بتاؤ!"

"واپسی سے پہلے مجھے قتل کر دو!"

علی مردان نے افسوس سے جواب دیا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"پھر مجھے میرے اپنے ہی حجرے میں رہنے دو۔"

"یہ منظور، ایسا ہی ہو گا۔"

اور چندراوتی کو خیمے کی قید سے نکال کر اس کے اپنے حجرے میں پہنچا دیا گیا۔

محمود چار ماہ تک سومنات میں ٹھیرا رہا۔ اسے یہ جگہ اتنی اچھی لگی کہ وہ یہاں مستقلاً رہ جانا چاہتا تھا۔ وہ غزنی کی حکومت اپنے بیٹے مسعود کے حوالے کر کے گجرات کو اپنا مستقر بنانا چاہتا تھا لیکن اس کے امرا، جو پردیس سے اُکتائے ہوئے تھے محمود کے ارادے میں مزاحم ہوئے اور غزنی واپس چلنے پر مجبور کر دیا۔



علی مردان، چندراوتی سے ــــ بار بار ملا اور اس کے وجود میں حلول زہر کی بابت پوچھتا رہا لیکن چندراوتی ہمیشہ ٹال گئی۔ اس نے کہا "میرے اس انکشاف سے ہندو دھرم کے ایک مہلک ہتھیار کا اس کے مخالفوں کو علم ہو جائے گا۔"

علی مردان نے کہا "خیر تمھاری مرضی ہے لیکن اب کوئی راز نہیں رہا جسے تم چھپانا چاہتی ہو، شاید میں وہ سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔"

پھر جب محمود کی سپاہ غزنی واپس جانے لگی تو علی مردان چندراوتی سے الوداعی ملاقات کرنے گیا۔ بولا "چندراوتی! میں غزنی واپس جا رہا ہوں۔"

"اچھا" چندراوتی نے غیر جذباتی آواز میں کہا۔

علی مردان نے پوچھا "تم یہاں کس کے سہارے رہو گی؟ سومنات تو ایک انقلاب کا شکار ہو چکا ہے۔ یہاں کا تو نظام ہی درہم برہم ہو چکا ہے۔ کیا تمھیں اپنے عہد و پیمان کا خیال نہیں رہا؟"

چندراوتی نے جواب دیا "مجھے سب کچھ یاد ہے لیکن ایسے عالم میں کیا مجھ پر اس عہد کی پاسداری لازم ہے جب کہ بساط ہی الٹ گئی ہو۔ بہر حال اگر رتن سین زندہ ہوتا تو میں اسی کے سہارے رہ جاتی۔" پھر کچھ سوچ کر بولی "اگر تم ایک وعدہ کرو تو میں تمھارے ساتھ غزنی چل سکتی ہوں۔"

رتن سین کے ذکر سے علی مردان نے قباحت محسوس کی لیکن غزنی چلنے کی خواہش نے اسے اسی قدر خوش بھی کر دیا۔ بولا "بولو، تم جو کہو گی، میں پورا کروں گا۔"

چندراوتی نے کہا "میں جنم جنم کی ہندو ہوں۔ ہندو دھرم نہیں چھوڑ سکتی۔ گو ہندو دھرم نے مجھے کوئی خوشی نہیں دی اور مجھے زہر آلود کر کے میری زندگی بھر کی خوشیاں چھین لی ہیں ـــ پھر بھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں اپنے قدیم مسلک سے یکلخت منحرف ہو جاؤں۔"

علی مردان نے کہا "جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو چندراوتی ــ! پہیلیاں نہ بجھاؤ۔"

چندراوتی نے کہا "میں چاہتی ہوں کہ غزنی میں تم مجھے مذہب بدلنے پر مجبور نہ کرو۔ تم لوگ مجھ سے میرے پرانے عقیدے نہ چھینو۔"

علی مردان نے جواب دیا "تم اس کی بالکل فکر نہ کرو چندراوتی، ہمارے رسولؐ نے فرمایا ہے 'لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (دین میں جبر نہیں ہے) تم پر مذہب کے معاملے میں کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔"

واپسی میں محمود نے سندھ کا ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو غیر آباد اور دشمنوں کی مزاحمت سے پاک تھا۔ سومنات جی کے چار ٹکڑوں میں سے دو مکے اور بغداد روانہ کر دیے گئے اور دو غزنی پہنچ گئے۔ محمود نے سومنات کا ایک ٹکڑا جامع مسجد غزنی کی چوکھٹ میں اور دوسرا ایوانِ سلطنت کے صحن میں پیوست کرا دیا جس سے اس کا یہ مقصد تھا کہ لوگ آتے جاتے انھیں اپنے پیروں سے روند کر گزرا کریں۔

غزنی میں علی مردان کو چندراوتی کی خواہش پوری کرنے کے لیے سانپوں کا انتظام بھی کرنا پڑا کیوں کہ اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ چندراوتی کھانے میں سنکھیا استعمال کرتی ہے۔ سنکھیا ملا ہوا کھانا کھانے کے بعد چندراوتی خود کو سانپوں سے ڈسواتی اور پھر بے سُدھ ہو کر کسی شرابی کی طرح بستر پر دراز ہو جاتی۔

ایک دن اسے سومنات جی کے رُوبرو کیا ہوا عہد و پیمان شدومد سے یاد آ گیا۔ اس نے باہر جاتے ہوئے علی مردان کو روک لیا ـــ بولی "علی مردان! کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گے کہ میں تمھیں ست پال جی کہہ کر ہی مخاطب کیا کروں؟"

"بشوق چندراوتی! اس میں مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے" پوچھا "تم کبھی قرآن بھی پڑھتے ہو بھلا؟"

اس نے جواب دیا "کبھی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے چندراوتی، روز ہی پڑھتا ہوں میں قرآن۔"

بولی "تم اپنا قرآن میرے پاس لے آؤ۔"

علی مردان قرآنِ پاک لے کر اس کے پاس چلا گیا۔

کہنے لگی، "اسے اپنے سر پر رکھو۔"

جب علی مردان نے قرآن سر پر رکھ لیا تو کہنے لگی، "اب جو میں کہوں تم اسے اپنی زبان سے ادا کرتے جاؤ۔"

علی مردان نے کہا، "کہو، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ کہنے لگی، "کہو، قرآنِ پاک کی قسم، جب تک میں زندہ ہوں، تم کسی اور لڑکی یا عورت سے شادی نہیں کرو گے۔"

علی مردان نے کسی پس و پیش کے بغیر قسم کھا لی۔ اس کے بعد اس نے چندراوتی کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون پایا جاتا تھا، غضب کی طمانیت، بے انتہا آسودگی۔

علی مردان نے نرمی سے پوچھا، "چندراوتی! اب جب کہ میں تمھاری خواہش پوری کر چکا ہوں، کچھ میں بھی تم سے پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تم اس کا صحیح صحیح جواب دو گی؟"

چندراوتی نے اپنی نشیلی آنکھیں اوپر اٹھا دیں۔ ان میں سرخ سرخ ڈورے پڑ چکے تھے۔ بولی، "پوچھو، میں وعدہ کرتی ہوں جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

علی مردان نے کہا، "چندراوتی! ہم دونوں ہی یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے وابستہ نہیں ہو سکتے۔ تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں۔ پھر ان حالات میں اس قسم کی کیا ضرورت تھی؟"

چندراوتی کو اس سوال سے دکھ بھی پہنچا اور غصہ بھی آیا۔ بولی، "ست پال جی! کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟"

"تمھیں چاہتا کیوں نہیں چندراوتی، میں تو تمھیں جنون کی حد تک چاہتا ہوں۔ یہاں اتنی دور غزنی تمھیں لانے کا کیا مقصد تھا؟"

اس نے تڑپ کر کہا، "پھر تم نے ایسا دل آزار سوال کیوں کیا؟"

علی مردان نے دیکھا، چندراوتی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ شدتِ جذبات میں چندراوتی کو سینے سے لگا لیا۔ بولا، "چندراوتی! میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے تمھارا دل دکھا دیا۔"

چندراوتی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے علی مردان کو دیکھا اور کہنے لگی، "ست پال جی! میں بہت خود غرض ہو گئی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور محبت خود غرض ہی ہوتی ہے۔ جب تک زندہ ہوں، میں نہیں چاہتی کہ تم پر کوئی اور عورت متصرف ہو جائے حالانکہ میری حیثیت ہی کیا ہے۔"

علی مردان نے اسے پوری قوت سے بھینچ لیا۔ چندراوتی کی سسکی نکل گئی۔



غزنی میں رہتے ہوئے ڈھائی تین سال گزر گئے۔ کرب و اذیت، عشق اور اس کی شورشوں کی مدت، چندراوتی اس کے بہت قریب اور اس سے بہت دور تھی۔ علی مردان سے اس نے جو عہد لیا تھا، اب اس پر وہ شرمندہ سی رہنے لگی تھی۔ علی مردان اداس اداس، مایوس مایوس اس کے پاس آتا۔ دلنشین باتیں کرتا اور سر جھکائے واپس چلا جاتا۔ کبھی کبھی بات اس سے آگے بھی بڑھ جاتی۔ ہم آغوشیاں بھی ہوتیں لیکن اس میں شدت کے بجائے احتیاط کارفرما ہوتی۔ جیسے کوئی آگ سے خوفزدہ ہو کر اس سے بچا بچا رہتا ہے۔ چندراوتی اب کچھ چڑچڑی سی ہو گئی تھی، شاید اسے یہ احساس شدت کے ساتھ ہونے لگا تھا کہ اس نے اپنی محبت کی خاطر علی مردان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ بڑی زیادتی کی ہے۔

انہی دنوں دربارِ محمودی کا بے مثل عالم ابوریحان البیرونی اس عجیب و غریب زہریلی عورت سے ملنے آیا۔ اس عالم نے علی مردان پر یہ انکشاف کیا کہ ہندو قوم اپنے دشمنوں کے لیے جو حربے یا ہتھیار استعمال کرتی ہے، یہ زہریلی عورتیں بھی انھی میں شامل ہیں۔ اس نے بتایا کہ کسی ذہین ترین ہندو نے یہ خطرناک طریقہ دریافت کیا تھا کہ اگر خوبصورت بچیوں کو بچپن ہی سے نہایت محتاط طریقے سے سنکھیا کا عادی بنا دیا جائے اور انھیں اتنی سنکھیا کھلائی جائے جو زندگی کے لیے مہلک نہ ہو تو اس کی مقدار میں بتدریج اضافہ کر کے لڑکی کو جوان ہوتے ہوتے زہریلا بنایا جا سکتا ہے اور آخر یہی سنکھیا کھاتے کھاتے لڑکی کے جسم کی غذا اور ضرورت بن جاتی ہے۔ پھر ان لڑکیوں کو سانپوں سے ڈسوا کر ان کے خون میں مزید زہر گھول دیا جاتا ہے۔ جب یہ حسین لڑکیاں پوری طرح زہریلی ہو جاتی ہیں تو پھر انھیں اپنے دشمنوں کے پاس بھیج کر ان کے بڑے آدمیوں کو ان سے ڈسوا کر ہلاک کروا دیا کرتے ہیں۔

علی مردان، ابوریحان البیرونی سے پوری محویت اور انہماک سے ساری باتیں سنتا رہا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔

چندراوتی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ علی مردان سب کچھ جان چکا ہے۔ ایک دن شام کو جب وہ چندراوتی سے ملنے پہنچا تو وہ بہت اداس تھی۔ علی مردان کو سامنے بٹھا کر دیر تک اسے دیکھتی رہی، پھر پوچھا، "ست پال

جی! اب بھارت ورش کب جانا ہوگا؟"

علی مردان نے جواب دیا۔ "جب بھی بادشاہ کا حکم ہوگا۔"

تشویش سے بولی۔ "تو تم جاؤ گے ضرور؟"

"ہاں، شاید ضرور!"

بولی۔ "لیکن اب تم وہاں نہ جانا کیونکہ وہاں میری ہی جیسی اور چندراوتیاں بھی موجود ہیں اور ہر چندراوتی میری طرح ہرگز نہ ہوگی۔ ان میں سے کوئی بھی تمہیں ڈس کر ہلاک کر دے گی!"

پھر کچھ دیر چپ رہ کر علی مردان کی شکل دیکھتی رہی، بے خیالی میں پوچھا۔ "ست پال جی! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

علی مردان نے جواب دیا۔ "چندراوتی! کیا تم بھول گئیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں شادی نہیں کر سکتے ہم نے قسمیں کھا رکھی ہیں۔"

چندراوتی نے افسوس سے کہا۔ "ہاں وہ مجھے یاد ہے لیکن میں اس عہد کو توڑنے کی اجازت دیتی ہوں۔" پھر آنکھیں بند کر لیں، کہنے لگی: "مجھے تم سے ایسی قسم نہیں لینی چاہیے تھی، میں نے تم پر ظلم کیا ہے۔"

علی مردان نے اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے دامن سے پونچھ دیا۔ بولا۔ "لیکن میں اپنے اس عہد پر شرمندہ نہیں ہوں۔ چندراوتی۔ میں شادی نہ کر کے بھی بہت خوش ہوں، میرا محبوب میرے پاس ہے۔"

وہ کربناک ہنسی سے بولی۔ "تم جھوٹ بولتے ہو ست پال جی! تم سچ نہیں بول رہے، تم بہت کرب میں ہو۔"

علی مردان نے جلدی جلدی کہا۔ "میں تمہیں اس بات کا کس طرح یقین دلاؤں چندراوتی کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور عورت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"بھگوان نے چاہا تو میں تمہیں تمہارے عہد سے نجات دلا دوں گی، تم فکر نہ کرو۔"

چندراوتی کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید اس وقت وہ سومنات میں موجود تھی۔ اپنے ماضی میں، جہاں بے پناہ چہل پہل تھی، بڑی رونقیں تھیں پجاریوں کا اژدہام، دیوداسیوں کی بھیڑ، گانے والیوں کا ریلا، سازندوں کا مجمع، یاتریوں کی ریل پیل، گھنٹیوں کا شور، اشلوکوں کا ہلا، جس میں اس کے اپنے عقیدے اور خیال کے مطابق ایک عظمت تھی، ایک شان تھی۔ ایک شکوہ تھا، سومنات جی کا عظیم الشان وجود اور پھر محمود کے ہاتھوں اس کا توڑا جانا ۔۔۔ چندراوتی نے خواب خیال سے آنکھیں کھولیں تو علی مردان سے کہنے لگی۔ "ست پال جی! تمہیں وہ دن یاد ہیں نا، جب رتن سین اور تم مجھے ناستک سمجھنے لگے تھے؟"

علی مردان نے جواب دیا۔ "ہاں یاد ہیں لیکن اب اس ذکر سے فائدہ؟"

فائدہ تو کوئی نہیں ۔۔۔ پھر بھی سومنات جی کی تباہ کاری اور اپنے شاندار اور چہل پہل سے معمور ماضی کے شمشان پر جب نظریں ڈالتی ہوں تو دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہے اور مجھے اپنے آپ پر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ میں آخر ناستک کیوں ہو چلی تھی۔ ان دنوں اب غزنی میں شدت سے یہ محسوس کرتی رہتی ہوں کہ میں ہندو تھی، ہندو ہوں اور ہندو رہوں گی۔ یہ تو جنم جنم کا دھرم ہے۔ پر اس دھرم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لینے کے سوا دیا کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی میں اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکتی۔" پھر آنکھیں بند کر کے کرب سے بولی۔ "کاش میرا ماضی مجھے واپس مل سکتا ست پال جی! تم مسلمان، تم سے محبت، ہندو دھرم سے محبت کتنی متضاد محبتیں یکجا ہو گئی ہیں، خوب!"

علی مردان نے یہ محسوس کیا کہ چندراوتی کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ کر چلا آیا۔ اس رات علی مردان سو بھی نہیں سکا، اسے رہ رہ کر چندراوتی کی باتیں یاد آتی رہیں ۔۔۔ اور اس کی بے بسی علی مردان کو خون کے آنسو رلاتی رہی۔

اس رات علی مردان کو اس پہلے ہندو پر بھی بڑا غصہ آیا، جس نے زہر آلود کنیاؤں کا حربہ ایجاد کیا تھا۔ وہ رات بھی بڑی سرد تھی۔ برف باری ہو رہی تھی۔ جب صبح مؤذن نے بآواز بلند کہا کہ "نماز نیند سے بہتر ہے۔" تو وہ اٹھ بیٹھا اور فجر کی نماز کے لیے جامع مسجد روانہ ہو گیا۔

مسجد کے دروازے پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ لوگ مشعلیں لیے اس کی روشنی میں جھکے ہوئے کچھ دیکھ رہے تھے۔ علی مردان بھی لوگوں کو چیرتا ہوا وہیں پہنچ گیا اور مسجد کی چوکھٹ پر جھک گیا۔ وہاں خون میں لت پت سردی سے اکڑی ہوئی چندراوتی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے خود ہی خنجر سے اپنا پیٹ چاک کر لیا تھا۔ اس کے قریب ہی سومنات جی کا وہ ٹکڑا تھا جو محمود نے نمازیوں کے قدموں سے روندنے کے لیے دروازے کے فرش میں جڑوا دیا تھا۔ چندراوتی کے پیٹ سے ابل کر نکلنے والا خون سومنات جی کا ٹکڑا تر کر کے دور تک بہا چلا گیا تھا۔



اس ماہ کے لیے شعورُ الوار کا انتخاب

اُردو کے زندۂ جاوید ادیبؒ

نیاز فتح پوری

کی ایک منفرد کہانی

پہلی کہانی

ایک صدی بلکہ اس سے بھی پہلے کا واقعہ ہے۔ جب معاشرت و تہذیب کے اصول یہ نہ تھے اور دنیا کچھ اور تھی —— گرجا کا گھنٹہ باقاعدہ وقفے کے ساتھ اپنی حزیں دردناک آواز بلند کر رہا تھا۔ لوگ جوق در جوق چلے جا رہے تھے دُکانیں بند ہو رہی تھیں، مکان مقفل کیے جا رہے تھے اور قصبے کی ساری چہل پہل سمٹ کر اس ایک عمارت کی طرف منتقل ہو رہی تھی جو آبادی سے کچھ دور بلندی کے اوپر قائم تھی —— یہ بہت قدیم گرجا تھا اور جو روایات قرب و جوار میں اس کے متعلق مشہور تھیں وہ بہت عجیبؔ و غریب تھیں چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ اس گرجا کے پادری ہمیشہ ولی ہوتے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ صحیح معنوں میں عیسیٰ کی تعلیمات کا درس دیا ہے جس زمانے کا ہم ذکر رہے ہیں اس وقت بھی یہاں کا پادری اسی حیثیت سے سارے قصبے میں مشہور تھا اور لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے حالانکہ وہ بہت نوجوان تھا۔

سپاہیوں کا ایک دستہ ہاتھوں میں ترسول نما علم لیے ہوئے گزرا، تماشائی سڑک کے دونوں طرف جمع ہو گئے اور جلوس دیکھنے لگے جو گورنر کے گزرنے کے وقت ہمیشہ ترتیب دیا جاتا تھا۔



یہ بھی گرجا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گورنر جو ایک ضعیف العمر لیکن قوی الاعضا انسان تھا، ہاتھ میں عصائے حکومت اور کمر میں تلوار لٹکائے ہوئے گزرا۔ وہ چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا کہ کوئی سے مکان کھلا ہوا تو نہیں ہے۔ کوئی لہو و لعب میں تو مصروف نہیں ہے۔ کیونکہ عبادت کے دن اُس زمانے میں کھیلنا اتنا ہی معیوب تھا جتنا اِس وقت کھیل کے وقت کسی کا سنجیدہ بن جانا۔



للی نے بھی گھنٹے کی آواز سن کر گرجا جانے کی تیاری شروع کی، وہاں کا خاص ملبوس نکالا، آئینے کے سامنے اس کی شکنیں دور کرنے لگی اور بالوں میں تیل ڈالنے لگی آئینہ ٹھیک اس کھڑکی کے محاذ میں لگا تھا جو سڑک کی طرف کھلتی تھی، آفتاب کی شعاع نے کھڑکی کی راہ سے آئینے پر اپنی روشنی ڈالی اور اس کا عکس کھڑکی سے ہو کر سڑک پر پہنچا۔ جہاں اس وقت گورنر گزر رہا تھا۔

اس کی آنکھیں چُندھیا گئیں اور وہ اسی جگہ ٹھیر کر دیکھنے لگا کہ یہ کس کا مکان ہے جس کی کھڑکیاں ابھی تک بند نہیں ہوئیں اور وہ کون ہے جو گرجا جانے کے لیے باہر نہ نکلا۔ للی آئینے کے سامنے سے ہٹ کر کناری (چڑیا) کے پنجرے کے پاس گئی، ہاتھ ڈال کر اسے نکالا اور اس کے سر پر نرم نرم ہاتھ پھیر کر اس کی چونچ اپنے ہونٹوں کے پاس لے جا کر پیار کی باتیں کرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ پھر پنجرے میں ہاتھ ڈال کر اسے بند کر دے کہ گرفت ڈھیلی ہوگئی اور چڑیا کھڑکی سے باہر اڑ گئی۔ للی بے تابانہ دوڑی، باہر جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر ڈھونڈتی پھری، شاخوں سے ٹکرائی، کانٹوں سے دامن الجھایا، گری پڑی لیکن وہ ناشکر گزار اور شریر چڑیا ہاتھ نہ آئی۔

گورنر نے یہ سب کچھ دیکھا اور غضب آلود چہرہ لیے ہوئے اپنے نائب سے یہ کہتا ہوا گزر گیا کہ "عبادت کے دن یہ لہو و لعب ہرگز معافی کے قابل نہیں ہے۔" ایک سپاہی نے بڑھ کر دروازے پر صلیبی نشان سفید کھریا سے بنایا اور سب لوگ گزر گئے۔ للی بدستور اسی الجھن میں گرفتار تھی اور گرجا کا گھنٹہ سن کر چونک چونک پڑتی۔ یہاں تک کہ گھنٹے کی آواز بند ہوگئی۔ یہ خموشی گویا اس امر کا اعلان تھا کہ اب انتظار کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ للی نے گھبرا کر چڑیا کی جستجو ترک کی اور بھاگتی ہوئی گرجا کی طرف چلی۔ قصبے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ سڑکیں خالی پڑی تھیں گرجا کے سامنے دو سپاہی گورنر کے باڈی گارڈ

مسلح کھڑے تھے اور دروازہ بند تھا۔ للی نے ڈرتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھولا اور اس طرح دبے پاؤں چلی جیسے وہ چوری کرنے جا رہی ہو۔

کلیسا کا درمیانی ہال آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور نوجوان راہب انجیلِ مقدس ہاتھ میں لیے ہوئے وعظ کہہ رہا تھا۔ لوگ نہایت خلوص و صداقت کے ساتھ اس کی آسمانی باتیں سُن رہے تھے۔ للی قریب کی بنچ پر ایک جگہ خالی دیکھ کر آہستہ سے بیٹھ گئی لیکن راہب نے جس کی نگاہ دروازے میں داخل ہوتے ہی اس پر پڑ چکی تھی، للی کی طرف اشارہ کر کے با آوازِ بلند حکم دیا کہ "یہ لڑکی سامنے لائی جائے۔"

للی نازک اندام للی، کمزور بیل کی طرح ذرا سے جھٹکے سے تھرتھرا جانے والی للی کانپتی ہوئی آگے بڑھی اور اشک آلود نگاہوں سے راہب کی طرف دیکھنے لگی۔

للی ان لڑکیوں میں سے تھی کہ اگر ان کے اعضا پر علیحدہ علیحدہ نگاہ ڈالی جائے تو وہ معمولی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے لیکن مجموعی حیثیت سے ان کی دلکشی ناقابلِ انکار ہوتی ہے۔ قصبے کے اندر اسی سن و سال، اسی قد و قامت، اسی نقشہ و ساخت کی بہت سی لڑکیاں ہوں گی، جنھیں راہب نے دیکھا ہوگا لیکن للی بالکل نئی لڑکی تھی جس کی طرف سے جلد نگاہ پھیر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی وہ برابر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا اور ایسا محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے تمام جسم کے ساتھ اس کے دل میں سمائی جا رہی ہے۔ کتابی چہرہ باریک کترا ہوا نقشہ، پنکھڑی سے ہونٹ، رسیلی آنکھیں، جن پر اس وقت آنسوؤں نے اور بھی موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیے تھے

——— یہ سب وہ باتیں تھیں جنھوں نے اس کی رعنائی، فطری دلکشی اور موسمِ شباب کے ساتھ مل کر مقدس راہب کو بھی کچھ دیر تک سوچنے پر مجبور کر دیا کہ "کیا قانون کی گرفت سے ایسا معصوم حسن بھی آزاد نہیں ہو سکتا۔"

اس خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس کا تقدس کانپ اٹھا اور اب بہ مشکل اس نے اپنی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹا کر با آوازِ بلند کہا "بے شک جو گناہ کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔ عبادت کے دن کھیل کود میں مصروف رہنا، کلیسا کا دروازہ بند ہونے کے بعد اسے کھٹکھٹانا جرم ہے اور خدا یہ گستاخی کبھی معاف نہیں کرے گا۔

راہب یہ کہہ کر منبر سے اتر آیا۔ انجیل بند کر کے میز پر رکھ دی اور ایک کونے میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔



شاہراہ پر، نازک اندام لی کے نازک ہاتھ پاؤں ایک کاٹھ میں ڈال دیے گئے تھے جس پر یہ اعلان کندہ تھا کہ

"یہ سزا ہے اُس کی جو عبادت کے دن، عبادت سے مُنہ چرائے"

عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، جوان سبھی ادھر سے گزر رہے تھے اور اس کو دیکھتے جاتے تھے لیکن کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ اس کے لبوں کو، جو تمازتِ آفتاب کی وجہ سے خشک ہو رہے تھے پانی سے تر کر دے۔ اس کے بال پریشان تھے، لباس بے ترتیب تھا۔ چہرہ زرد اور آنکھیں اشک آلود تھیں اور وہ دل ہی دل میں سخت محجوب و منفعل تھی کہ کیوں اس نے ایک بے وفا چڑیا کے لیے مذہبی قانون کا پاس نہیں کیا۔ اسی حال میں گھنٹوں گزر گئے اور اس کی حالت شدتِ تشنگی سے متغیر ہونے لگی۔ یہ وہ وقت تھا جب راہب گرجا سے نکل کر لوگوں کی تیمار داری، مزاج پرسی اور مذہبی تلقین کے لیے جایا کرتا تھا۔ ہر چند وہ اس لمحے کو نہیں بھولا تھا جب لی ایک گناہ گار کی حیثیت سے سامنے لائی گئی تھی اور جب خود اس کے دل میں اوّل اوّل، تاویلِ گناہ کا جذبہ پیدا ہوا تھا، لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ لی کہاں اور کس عالم میں ہے۔ وہ اسی خیال میں منہمک سڑک سے گزر رہا تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ ایک ہجوم کی طرف گئی اور جب وہ قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ لوگ لی کی بے بسی و بے کسی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ وہ بے تابانہ، بے اختیارانہ آگے بڑھا، اُس کی نڈھال گردن ہاتھ پر سنبھال کر پانی پلایا اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹھ سے نکال کر گھر تک پہنچانے گیا۔ لوگوں نے دیکھا اور کہا "راہب کس قدر رحم دل ہے ـــــ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسے ایک گناہگار سے بھی وہی محبت ہے جو اوروں سے۔"

لوگ اپنی اپنی راہ چلے گئے اور لی، راہب کی معیت میں اپنے گھر پہنچی، جہاں اس کا گمشدہ طائر پنجرے پر بیٹھا ہوا چہچہا رہا تھا لی نے بڑھ کر اس کو پکڑ لیا۔ پیار کیا اور وہ تمام مصائب بھول گئی جن میں گھنٹوں مبتلا رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر راہب سے کہا "بس گرجا دیر میں گئی تو وہ سب کچھ ہوا، جس کے خیال سے ایک انسان کو شرم کرنا چاہیے لیکن میں اس چڑیا کو باوجود اس کے کہ اسی نے ذلیل و رسوا کیا پیار کرتی ہوں۔ اے راہب مجھے بتا کہ انسان کے دل میں انتقام کا جذبہ کون پیدا کرتا ہے کیا خدا ایسا کرتا ہے؟ مجھے اس کا یقین نہیں"

راہب جو لی کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش اپنے دل و دماغ میں منقوش کرتا جا رہا تھا، یہ سن کر بیتاب ہو گیا اور جب اس نے دیکھا کہ زیادہ قیام اسے بالکل بے قابو کر دے گا تو اس نے سر جھکا کر "ہاں" ـــــ کہا اور فوراً دروازے سے باہر نکل کر چلا گیا۔



چند دن گزر گئے۔ لی تنہا زندگی کے مشاغلِ معیشت میں مشغول رہی اور راہب گرجا کے اندر صرف اس کوشش میں کہ وہ لی کا خیال کیوں کر اپنے دل سے نکالے اس نے رات دن انجیل اپنے سامنے کھلی رکھی، گھنٹوں مسیح کے بُت کے حضور میں التجائیں کیں، دعائیں مانگیں کہ وہ اس عہد پر استوار رہے جو اس نے دس سال قبل ملک کے سب سے بڑے گرجا میں کیا تھا۔ اور جب اس نے ایک نوع کا سکون محسوس کر لیا تو پھر باہر نکلا۔ وہ انجیل ہاتھ میں لیے، جھاڑیوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک لڑکی دکھائی دی جو چشمے پر کھڑی کپڑے دھو رہی تھی۔ یہاں کا ایک قانون یہ بھی تھا کوئی عورت اپنے چھوٹے کپڑے نہ اعلانیہ دھو سکتی تھی نہ کسی کو دکھا سکتی تھی۔ راہب کو خیال آیا کہ ممکن ہے کوئی عورت اس قانون کو توڑ رہی ہو۔ اس لیے وہ آگے بڑھا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی لی ہے اور حقیقتاً قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ راہب بڑھا اور لی اس کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ کپڑا دونوں ہاتھوں سے پشت کر کے پیچھے چھپا لیا اور حد درجے معصومانہ انداز سے اس کو دیکھنے لگی۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی عادی تھی، اور راہب سب سے زیادہ اُس کی اسی ادا سے گھبراتا تھا کیونکہ اس کی ہر نگاہ اس کے لیے ایک ایسا مہلک پیام تھی کہ مشکل ہی سے وہ اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ کبھی ایسا محسوس کرتا کہ لی کی آنکھوں سے سیاہ بردار شعلے نکل نکل کر سیدھے اعماقِ قلب تک پہنچ رہے ہیں اور کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ کسی زبردست سیلاب میں اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ لی نے اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا ہو اور اس کے جسم میں سنسنی نہ پیدا ہوئی ہو۔ اس نے لی کی طرف سے نگاہ ہٹا کر کہا "لی مجھے دکھاؤ یہ کون سا کپڑا ہے؟" لی برابر دیکھتی رہی اور کپڑا اسی طرح چھپائے رہی۔ راہب نے اس کی کلائیاں اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "کیا تم نہیں دکھاؤ گی؟" لی کے اعصاب حسین راہب کے گرم ہاتھوں کے مس سے ڈھیلے پڑ گئے اور اس نے بے اختیارانہ وہ کپڑا سامنے

کر دیا جسے وہ چھپائے ہوئے تھی۔ یہ اس کی چھوٹی قمیص تھی جو رات کو استعمال کی جاتی ہے۔ راہب کا خیال فوراً اس قمیض کو دیکھ کر للی کے اس مینائی جسم کی طرف گیا جس سے وہ مَس ہوتا رہتا تھا اور صحیح معنی میں وہ ہیجانی کیفیت پیدا ہونے لگی، جس کی حکومت میکدہ و خانقاہ دونوں جگہ یکساں ہے' اس نے بے اختیارانہ للی کی دونوں کلائیاں اپنی طرف کھینچنی شروع کیں، اور للی جسے راہب کے حسن و شباب نے پہلے ہی دن اپنا بنالیا تھا، اس کی طرف اِس طرح کھنچنے لگی جیسے گھاس کا تنکا کہربا کی طرف کھنچتا ہے چہرے قریب تر ہوتے جا رہے تھے آنکھیں باہم تبادلہ صہبا میں مصروف تھیں اور مرتعش لبوں کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا کہ دفعتہً راہب چونکا اور اس نے فوراً للی کے دونوں ہاتھ چھوڑ کر منہ موڑ لیا اور یہ کہتا ہوا چلا کہ "للی، دیکھو تم قانون و مذہب کی مخالفت نہ کرو۔ جاؤ اس کپڑے کو کہیں چھپا دو، پھر دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔" للی، جس کی بیتابی کا وہی عالم تھا جیسے کسی کے خشک لبوں تک لے جا کر جام ہٹا لیا جائے، راہب کے پیچھے دوڑی اور سامنے جا کر اسے روک لیا۔ اس نے منہ پھیر کر دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہا کہ للی پھر سامنے آ گئی۔ راہب نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

"للی نے اشتیاق سے کہا۔ صرف یہی کہ میں اسی طرح گناہ کرتی رہوں اور تم اسی طرح مجھے سزا سے ڈراتے رہو۔" اس مرتبہ للی نے راہب کی کلائیاں پکڑ لیں اور اس نگاہ سے اس کی طرف دیکھا، جس کا جواب سوائے اس کے کوئی نہ ہو سکتا تھا کہ آنکھ بند کر کے اس کی قوت کا اعتراف کر لیا جائے۔

راہب کے لب پہلے للی کی آنکھوں تک، پھر اس کے لبوں تک اور وہاں سے اس کی مرمریں لانبی گردن تک پہنچے اور اس کو اپنی آغوش میں کھینچ کر آخر کار اس کے قلب و روح نے یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ اگر عبادت کسی لذتِ روحانی کے لیے کی جا سکتی ہے تو گناہ سے زیادہ عبادت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

(۵)

مہینوں گزر گئے اور کوئی قابلِ ذکر واقعہ ان دونوں کی زندگی میں پیش نہیں آیا۔ ایک بار رات دن میں دونوں کو مل کر تھوڑی دیر بات کر لینا لازم تھا اور ان پوشیدہ ملاقاتوں کی لذت سے دونوں اپنی اپنی جگہ سرشار رہتے تھے۔

ایک دن صبح راہب بہت خوش خوش للی کے گھر آیا اور بولا کہ "میں گورنر کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر بادشاہ کے پاس جا رہا ہوں۔" للی نے گھبرا کر اسے دیکھا اور جدائی کے خیال سے پریشانی اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگی جس کو محسوس کر کے راہب نے کہا کہ "میں تنہا نہیں جاؤں گا بلکہ تم بھی میرے ساتھ ہو گی اور آج ہم تم دونوں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو جائیں گے۔"

یہ سن کر للی کا وہ عالم ہوا جیسے اس پر بجلی گری ہو اور راہب کی آغوش سے علیحدہ ہو کر اس طرح سہمی ہوئی پیچھے کی طرف ہٹنے لگی جیسے اس کے جسم کا اتصال جلائے دے رہا ہو۔ راہب متحیر ہو گیا اور مطلقاً نہ سمجھ سکا کہ شادی کے ذکر سے للی پر یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی۔ اس نے پوچھا، بار بار پوچھا "کیا تم شادی پر آمادہ نہیں ہو؟"

اور للی نے آخر کہہ دیا کہ "نہیں میں شادی نہیں کر سکتی" اور بکس سے نکال کر وہ انگوٹھی دکھا دی جو اس سے قبل رسم ازدواج کے وقت اس کے ہاتھ میں پہنائی گئی تھی۔ اس نے کہا کہ "چند سال ہوئے میرے والدین نے میری مرضی کے خلاف ایک ڈاکٹر سے شادی کر دی تھی، جو یہاں لے آیا تھا لیکن چند مہینے رہنے کے بعد وہ کسی کام سے دوسرے گیا اور پھر وہاں سے واپس نہیں آیا اور نہ اس کی کوئی خبر معلوم ہوئی۔ یقیناً تم مجھے ملامت کرو گے اور میں اس کی مستحق ہوں مگر میں نے تم پر یہ حال اس خوف سے ظاہر نہیں کیا کہ شاید تم ملنا چھوڑ دو اور اس کو میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی تھی۔"

راہب دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا اور پھر حد درجے سوگوار یاس کے عالم میں باہر جانے لگا۔ اس نے للی کو ملامت نہیں کی، اس نے برہمی کا اظہار نہیں کیا لیکن اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع اس کے لیے اس قسم کی تکلیف کا پیدا ہوا ہے' وہ دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا اور پھر دفعتہً اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

(۶)

پانچ ماہ بعد —— صبح کا وقت تھا۔ گورنر کے مکان کے سامنے کا میدان ہے جو آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے' سپاہی وردیاں پہنے میدان کے اس حصے کا احاطہ کیے ہوئے تھے جہاں ایک بلند چبوترے پر سولی قائم کی گئی تھی گورنر بالاخانہ پر مع سرداروں کے بیٹھا ہوا باتوں میں مصروف تھا اور اس وقت کا منتظر تھا کہ ملزم سولی کے چبوترے تک زنداں سے نکال کر لایا جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد اسے خبر معلوم ہوئی کہ

بادشاہ کے پاس سے واپس آ رہا ہے چنانچہ گورنر حد درجہ مسرت کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوا جب راہب اندر داخل ہوا اور اس نے اپنی کامیابی کی خوشخبری سنانا شروع کر دی تو گورنر نے اسے روک دیا کہ وہ مفصل گفتگو بعد میں کرے۔ گورنر نے کہا "تمہارا اس وقت آنا بہت برمحل رہا ہے کیونکہ ایک مجرم سولی پر چڑھایا جانے والا ہے اور ضروری تھا کہ اس سے پہلے تفصیل جرم معلوم کی جائے کیونکہ حسب قانون اس کے ساتھ کسی اور کو بھی اس سزا میں شریک ہونا ضروری ہے۔"

اسی وقت نیچے میدان میں ایک ہنگامہ پیدا ہوا اور راہب نے دریچے سے جھانک کر دیکھا تو حیرت سے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا اس نے دیکھا کہ سپاہی للی کو کشاں کشاں لیے آ رہے ہیں اور اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی ہے جو گھڑی گھڑی ہمک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ماں کی گردن سے چمٹا جا رہا ہے تمام واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے اور یہ دیکھ کر کہ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کے سامنے اس کا مکروہ باطن بے نقاب ہو اس کا دل کانپنے لگا۔ وہ بے اختیارانہ وہاں سے دوڑا اور مجمع چیرتا ہوا کسی نہ کسی طرح للی کے پاس پہنچا چلا تو وہ اس جذبہ بے اختیار سے تھا کہ جاتے ہی اس کو اپنی آغوش میں لے لے گا اور سب پر اصل راز ظاہر کر دے گا لیکن وہاں پہنچ کر پھر اسے اپنے راہبانہ تقدس کا خیال آیا اور اس نے اپنی اُس شفقت کے ساتھ جو ہر شخص پر صرف ہوتی تھی، للی کی طرف توجہ کی۔ وہ اس وقت چبوترے پر پہنچ چکی تھی اور اس سے دریافت کیا جا رہا تھا کہ وہ اس بچے کے باپ کا نام بتائے تاکہ اسے بھی اس کے ساتھ سولی پر چڑھا دیا جائے لیکن وہ ساکت و خاموش تھی اور کسی طرح اپنی گود سے اس بچے کو علیحدہ نہ کرتی تھی جسے سپاہی چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔

راہب دوڑتا ہوا للی کے پاس گیا تو وہ حیران رہ گئی کیونکہ وہ راہب کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھی احساس کی یہ اولین کیفیت دور ہونے کے بعد راہب نے اشاروں ہی اشاروں میں للی سے کہا کہ اب حقیقت چھپانے کا وقت نہیں ہے لیکن للی نے اسی ایثار سے کام لے کر جو ایک محبت کرنے والی عورت کی زندگی ہے، اسے منع کیا کہ وہ اپنے وقار و احترام کو صدمہ نہ پہنچائے۔

راہب نے کہا "اے للی اگر تجھ سے محبت کرنا واقعی کوئی گناہ تھا تو اس سے زیادہ ثواب کا کام دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ میں اس کا اعتراف کر لوں۔"

لیکن للی اس پر راضی نہ ہوئی۔ اس نے کہا کہ "اس وقت تک ہم نے اپنے تعلق کو جس طرح چھپایا وہ یقیناً ایک بڑا جھوٹ تھا جو ہم دنیا کے سامنے بولے، لیکن اس جھوٹ کے بعد اب یہ سچ بولنا جس سے تین جانیں ہلاکت میں پڑ جائیں، اس جھوٹ سے زیادہ سخت گناہ ہے۔"

راہب کے سامنے اس وقت سوال اپنے تقدس کی حفاظت کا نہ تھا بلکہ للی اور اس کے معصوم بچے کا تھا۔ اس نے دل میں کہا، اگر دنیا میں ایک بار جھوٹ بولنے کے بعد انسان ساری عمر جھوٹ نہ بولنے پر مجبور کیا جائے تو یہ اس کے جرم کی پاداش ہے اور یہ سزا اسے بھگتنا چاہیے۔ وہ یہ سوچ کر گورنر کے پاس گیا اور کہا کہ "خدا کے احکام کے مطابق اس عورت کو اس وقت تک سزا نہیں دی جا سکتی جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ بچے کا باپ کون ہے؟" گورنر نے پوچھا کہ "پھر کیا تدبیر ہے" راہب نے ہجوم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو اس بچے کا باپ ہونے کا اقرار کرے اور دس سال تک قید میں رہ کر اس عورت اور اس کے بچے کی پرورش و نگہداشت کا ذمہ دار بنے۔"

یہ سنتے ہی مجمع سے نفرت و احتراز کی آواز بلند ہوئی اور لوگ للی کو دیکھ کر اس طرح پیچھے ہٹنے لگے، جیسے وہ کوئی زہریلی ناگن ہو۔

دیر تک انتظار کرنے کے بعد راہب پھر اٹھا اور بولا کہ "اے گورنر اے شہر کے معززین، سن لو کہ میں اس بچے کا باپ ہوں اور للی میری بیوی ہے۔"

یہ سن کر ہجوم میں عجیب طرح کی بے چینی پیدا ہوئی لیکن جس وقت راہب یہ کہنے کے بعد نیچے اترا اور للی کا ہاتھ پکڑ کر قید خانے کو لے چلا تو سب دم بخود تھے اور کہہ رہے تھے کہ راہب کے تقدس کی انتہا ہو گئی۔"

کلیسا اب دوسرے راہب کے سپرد ہے جو رات دن اپنے تقدس کا سکہ بٹھانے کے لیے خدا کے احکام لوگوں کو سنایا کرتا ہے لیکن سب کی نگاہیں ایک دوسرے کی طرف اس طرح اٹھتی ہیں گویا یہ سب کچھ بے معنی ہے اور اس مقدس راہب کی یاد کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھر لیتے ہیں جس نے ایک آوارہ لڑکی کے لیے اپنی عزت، وجاہت اور اپنے اقتدار و احترام کو خاک میں ملا دیا۔



اُردو کے عظیم ادیب

کرشن چندر

کی نُکیلی کٹیلی تخلیق

جذبے کی زبان

کراچی میں بھی اس کا یہی دھندا تھا اور باندرے آکر بھی یہی دھندا رہا۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا کوئی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کراچی میں بھی سدھو حلوائی کے گھر کی سیڑھیوں کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں سوتا تھا۔ اور باندرے میں بھی وہیں سیڑھیوں کے عقب میں اسے جگہ ملی تھی۔ کراچی میں اس کے پاس ایک میلا کچیلا بستر، زنگ آلود ٹین کا ایک چھوٹا سا سیاہ ٹرنک اور ایک پیتل کا لوٹا تھا۔ یہاں بھی وہی سامان تھا۔ ذہنی لگاؤ اسے نہ کراچی سے تھا نہ اسے بمبئی سے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ ذہنی لگاؤ کسے کہتے ہیں؟ کلچر کسے کہتے ہیں؟ حب الوطنی کیا ہوتی ہے اور کس بھاؤ بیچی جاتی ہے؟ وہ ان سب نئے دھندوں سے ناواقف تھا۔ بس اسے اتنا یاد تھا کہ جب اس نے آنکھ کھولی، تو اپنے آپ کو سدھو حلوائی کے گھر میں برتن مانجھتے جھاڑو دیتے، پانی ڈھوتے، فرش صاف کرتے اور گالیاں کھاتے پایا۔

دُوسری کہانی



لسے ان باتوں کا کبھی ملال نہ ہوا کیوں کہ اُسے معلوم تھا کہ کام کرنے اور گالیاں کھانے کے بعد ہی روٹی ملتی ہے۔ اور اس قسم والے لوگوں کو ایسے ہی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں سدھو حلوائی کے گھر میں اس کا جسم تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اسے روٹی کی شدید ضرورت رہتی تھی اور ہر وقت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے وہ حلوائی کے جھوٹے سالن کے ساتھ ساتھ اس کی گالی بھی روٹی کے ٹکڑے میں لپیٹ کر نگل جاتا تھا۔

اس کے ماں باپ کون تھے؟ کسی کو پتہ نہ تھا۔ خود چندرو نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ البتہ سدھو حلوائی اسے گالیاں دیتا ہوا اکثر کہا کرتا تھا کہ چندرو کو سڑک پر سے اٹھا کر لایا ہے۔ اس پر چندرو نے کبھی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ نہ سدھو کے لیے شکریے کے نرم جذبے کا اس کے دل تک گزر ہوا کیوں کہ چندرو کو کوئی دوسری زندگی یاد نہیں تھی

اسے بس اتنا معلوم تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ماں باپ ہوتے ہیں، کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ گھر والے ہوتے ہیں، کچھ لوگ سیڑھیوں کے پیچھے سونے والے ہوتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں دیتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں سنتے ہیں۔ ایک کام کرتا ہے، دوسرا کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ بس ایسی ہے یہ دنیا اور ایسی ہی رہے گی۔ دو خانوں میں بٹی ہوئی۔ یعنی ایک وہ جو اوپر والے ہیں۔ دوسرے وہ جو نیچے والے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں۔ اور جو ہے وہ کب، کیوں اور کیسے بہتر ہو سکتا ہے؟ وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ اس قسم کی باتوں سے دلچسپی رکھتا تھا البتہ جب کبھی وہ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا اس کی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ جس طرح وہ سٹے کے نمبر کا داؤ لگانے کے لیے کبھی کبھی ہوا میں سکہ اچھال کر ٹاس کر لیتا ہے اسی طرح اس کے پیدا کرنے والے نے اس کے لیے ٹاس کر لیا ہوگا اور اسے اس خانے میں ڈال دیا ہوگا جو اس کی قسمت تھی۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ چندرو کو اپنی قسمت سے شکایت تھی، ہرگز نہیں، وہ ایک خوش باش محنت کرنے والا، بھاگ بھاگ کر جی لگا کر خوش مزاجی سے کام کرنے والا لڑکا تھا۔ وہ دن رات اپنے کام میں اس قدر مشغول رہتا تھا کہ اسے بیمار پڑنے کی بھی کبھی فرصت نہیں ملی۔

کراچی میں تو وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا مگر بمبئی آکر تو اس کے ہاتھ پاؤں اور کھلے اور بڑھے۔ سینہ پھیلا۔ گندمی رنگ صاف ہونے لگا۔ بالوں میں لچھے سے پڑنے لگے۔ آنکھیں زیادہ روشن اور بڑی معلوم ہونے لگیں۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں ضرور کسی بڑے گھر کی رہی ہوگی۔ اس کے پھیلے ہوئے سینے، بانہوں کی مضبوط مچھلیاں اور کھردرے سخت ہاتھ دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا باپ بھی ممکن ہے اسی بڑے خاندان کا کوئی جوان اور تگڑا نوکر رہا ہوگا۔ اس قسم کے تجربے بالعموم سڑک پر پھینک دیے جاتے ہیں۔

چندرو کی دنیا میں آواز کا اس حد تک گزر تھا کہ وہ سن سکتا تھا بول نہیں سکتا تھا۔ عام طور پر گونگے بہرے بھی ہوتے ہیں مگر وہ صرف گونگا تھا بہرا نہ تھا۔ اس لیے حلوائی ایک دفعہ اسے بچپن میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے چندرو کا معائنہ کرنے کے بعد حلوائی سے کہا کہ چندرو کے حلق میں کوئی پیدائشی نقص ہے مگر آپریشن کرنے سے یہ نقص دور کیا جا سکتا ہے اور چندرو کو بولنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے مگر حلوائی نے کبھی اس نقص کو آپریشن کے ذریعے دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سدھو نے سوچا یہ تو بہت اچھا ہے کہ نوکر گالی سن سکے مگر جواب نہ دے سکے۔

چندرو کا یہی نقص سدھو کی نگاہ میں اس کی سب سے بڑی خوبی بن گیا۔ اس دنیا میں مالکوں کی آدھی زندگی اسی فکر میں گزر جاتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے نوکروں کو گونگا کر دیں۔ اس کے لیے قانون پاس کیے جاتے ہیں، پارلیمنٹیں سجائی جاتی ہیں اور اخبار نکالے جاتے ہیں، پولس اور فوج کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ سنو لوگو جواب نہ دو۔

اور چندرو تو پیدائشی گونگا تھا۔ یقیناً سدھو ایسا احمق نہیں ہے کہ اس کا آپریشن کروائے۔

سدھو بھی دل کا برا نہیں تھا۔ اپنے مخصوص حالات میں، مخصوص حدود کے اندر رہ کر اپنا زاویۂ نگاہ رکھے ہوئے وہ چندرو کو اپنے طریقے سے چاہتا بھی تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور اس بات پر خوش تھا اور اکثر اس کا فخریہ اظہار بھی کیا کرتا تھا کہ اس نے چندرو کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح کی ہے۔ کون کسی یتیم بچے کی اس طرح پرورش کرتا ہے۔ اس طرح پالتا پوستا اور بڑا کرتا ہے۔ کون اس طرح اسے کام پر لگاتا ہے۔ جب تک چندرو کا لڑکپن تھا۔ سدھو اس سے گھر کا کام لیتا رہا۔ جب چندرو لڑکپن کی حدود پھلانگنے لگا تو سدھو نے اس کی خاطر ایک نیا دھندا شروع کیا۔ حلوائی کی دکان پر تو اس کے اپنے بیٹے بیٹھتے تھے۔ اس نے چندرو کے لیے چاٹ بیچنے کا دھندا طے کیا۔ ہولے ہولے اس نے چندرو کو

چاٹ بنانے کا فن سکھا دیا۔ جل جیرہ اور کانجی بنانے کا فن۔ گول گپّے اور دہی بڑے بنانے کے طریقے۔ چٹخارا پیدا کرنے والے تیکھے مسالے۔ کرکری۔ پاپڑیاں اور چنے کا لذیذ مرچیلا سالن۔ بھٹورے بنانے اور تلنے کے انداز۔ پھر سموسے اور آلو کی ٹکیاں بھرنے کا کام۔ پھر چٹنیاں۔ لہسن کی چٹنی۔ لال مرچ کی چٹنی۔ ہرے پودینے کی چٹنی۔ کھٹی چٹنی۔ میٹھی چٹنی۔ ادرک کی چٹنی اور انار دانے کی چٹنی۔

پھر انواع و اقسام کی چاٹیں پروسنے کے انداز، دہی بڑے کی چاٹ، کانجی کے بڑے کی چاٹ، میٹھی چٹنی کے پکوڑوں کی چاٹ، آلو کی چاٹ، آلو اور آلو پاپڑی کی چاٹ، ہری مونگ کے گول گپّے، کانجی کے گول گپّے، آلو کے گول گپّے۔ ہر مسالے کے گول گپّے۔

جتنے برسوں میں چندرو نے یہ کام سیکھا، اتنے برسوں میں ایک لڑکا ایم اے پاس کر لیتا ہے پھر بھی بیکار رہتا ہے۔ مگر سدھو کا گھر بے کار گر بچوں کو لگنے کی یونیورسٹی نہیں تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ چندرو اپنے کام میں مشّاق ہوگیا ہے اور جوان ہوگیا ہے، تو اس نے چار پہیّوں والی ایک ہاتھ گاڑی خریدی، چاٹ کے تھال سجائے اور چندرو کو چاٹ بیچنے پر لگا دیا۔ ڈیڑھ روپے روز پر۔

جہاں چندرو چاٹ بیچنے لگا وہاں کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا۔ سدھو نے بہت سوچ سمجھ کے یہ جگہ انتخاب کی تھی۔ کھار لنکنگ روڈ پر اور پالی ہل کے چوراہے کے قریب ٹیلی فون ایکس چینج کے سامنے اس نے چاٹ کی چار پہیّوں والی گاڑی کھڑی کی۔ یہ جگہ بہت بارونق تھی۔ ایک طرف یونین بنک تھا، دوسری طرف ٹیلی فون ایکس چینج تیسری طرف ایرانی کی دکان تھی، چوتھی طرف کھوڑ بندر روڈ کا ناکا بیچ میں۔ شام کے وقت کھاتے پیتے خوش باش خوش لباس نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ چندرو کی چاٹ ہمیشہ تازہ اور عمدہ ہوتی تھی۔

وہ بول نہیں سکتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ بڑی دل کش ہوتی تھی۔ اس کا سودا ہمیشہ کھرا ہوتا تھا۔ بات صاف اور تول پورا گاہک کو اور کیا چاہیے۔ چندرو کی چاٹ اس نو آبادی میں چاروں طرف مقبول ہوتی گئی اور شام کے وقت اس کے ٹھیلے کے چاروں طرف نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ہجوم رہنے لگا۔ چندرو کو سدھو نے ڈیڑھ روپے روز پر لگایا تھا اور چندرو جو ڈیڑھ روپے میں خوش تھا اب تین روپے یومیہ پاکر بھی خوش تھا کیوں کہ خوش رہنا اس کی عادت تھی۔ اسے کام کرنا پسند تھا اور وہ اپنا کام جانتا تھا اور اپنے کام سے اسے لگن تھی۔

وہ اپنے گاہکوں کو خوش کرنا جانتا تھا اور انھیں خوش کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ دن بھر وہ چاٹ تیار کرنے میں مصروف رہتا۔ شام کے چار بجے وہ چاٹ گاڑی لے کر نکل پڑتا۔ چار سے آٹھ بجے تک ہاتھ روکے بغیر آرام کا سانس لیے بغیر وہ جلدی جلدی کام کرتا۔ آٹھ بجے اس کا ٹھیلا خالی ہوجاتا اور وہ اسے لے کر اپنے مالک کے گھر واپس آتا۔ کھانا کھا کے سینما چلا جاتا۔ بارہ بجے رات کو سینما سے لوٹ کر اپنی چٹائی بچھا کر سیڑھیوں کے پیچھے سو جاتا اور صبح پھر اپنے کام پر لگ جاتا۔ یہ اس کی زندگی تھی۔ یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ بے فکر اور زندہ دل تھا۔ نہ ماں باپ، نہ بھائی نہ بہن، نہ بیوی نہ بچے۔ دوسرے لوگوں کے لیے بہت سے خانے ہوتے ہیں، اس کا صرف ایک ہی خانہ تھا۔ دوسرے لوگ بہت سے لوگوں کے بہت سے ٹکڑوں میں بٹے ہوتے ہیں اور ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ہی ان کی شخصیت دیکھی جاسکتی ہے مگر چندرو ایک ہی لکڑی کا تھا اور لکڑی کے ایک ٹکڑے سے بنا تھا۔ جیسا وہ اندر سے تھا ویسا ہی وہ باہر سے بھی نظر آتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں بے جوڑ اور مکمل تھا۔

سانولی پارو کو اسے پریشان کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بالے جھلاتی پاؤں میں چھوٹی سی پازیب کھنکھناتی جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کے ٹھیلے کے گرد کھڑی ہوجاتی تو چندرو سمجھ جاتا کہ اب اس کی شامت آئی ہے۔ دہی بڑے کی تیّل تقریباً چاٹ کر ذرا سا دہی بڑا اس پر لگا رہنے دیتی اور پھر اسے دکھا کر کہتی۔

"لے گونگے! الو بہرا ابھی ہے کیا؟ میں نے دہی بڑے نہیں مانگے تھے۔ دہی پٹاکری مانگی تھی۔ اب اس کے پیسے کون دے گا تیرا باپ؟"

اتنا کہہ کر وہ دہی بڑے کی تقریباً خالی تیّل اسے دکھا کر بڑی حقارت سے زمین پر پھینک دیتی۔

وہ جلدی جلدی اس کے لیے دہی پٹاکری بنانے لگتا۔ پارو اس پٹاکری کی تیّل صاف کر کے اس میں آدھی پٹاکری چھوڑ دیتی اور غصّے سے کہتی

"اتنی مرچ ڈال دی! ___ اتنی مرچ!! ___ چاٹ بنانا نہیں آتا تو ٹھیلا لے کر ادھر کیوں آتا ہے؟ ___ لے اپنی پٹاکری واپس لے لے!"

اتنا کہہ کر وہ دہی اور چٹنی کی پٹاکری اپنے ناخن کے کور میں پھنسا کر اس کے ٹھیلے پر رکھ جاتی۔ کبھی اسے چھوٹی پٹاکریوں کے تھال میں واپس ڈال دینے کی دھمکی دیتی۔ اس کی سہیلیاں ہنستیں، تالیاں بجاتیں

چندرو دونوں ہاتھوں سے ناں ناں کے اشارے کرتا ہوا پارو سے اپنی جھوٹی پٹاکری زمین پر پھینک دینے کا اشارہ کرتا۔

"اچھا سمجھ گئی، تیرے چنوں کے تھال میں ڈال دوں؟" وہ جان بوجھ کر اس کا اشارہ غلط سمجھتی۔ جلدی جلدی گھبرائے ہوئے انداز میں چندرو زور زور سے سر ہلاتا۔ پھر زمین کی طرف اشارہ کرتا۔ پارو کھلکھلا کر کہتی۔

"اچھا زمین سے مٹی اٹھا کر تیرے دہی کے برتن میں ڈال دوں؟" پارو نیچے زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا لیتی۔

اس پر چندرو بھی گھبرا جاتا۔ دونوں ہاتھ زور زور سے ہلا کر منع کرتا۔ آخر پارو اسے دھمکاتی۔ "تو چل جلدی سے آلو کی چھ ٹکیاں تل دے اور خوب گرم گرم مسالے والے چنے دینا اور ادرک بھی۔ نہیں تو یہ پٹاکری ابھی جائے گی تیرے کالے گلاب جامنوں کے برتن میں!"

چندرو خوش ہو کر پوری بتیسی نکال دیتا۔ ماتھے پر آئی ہوئی ایک گھنگھریالی لٹ پیچھے ہٹا کے تولیے سے پونچھ کر جلدی سے پارو اور اس کی سہیلیوں کے لیے آلو کی ٹکیاں تلنے میں مصروف ہو جاتا۔

پھر کبھی کبھی پارو حساب میں بھی گھپلا کیا کرتی۔

"ساٹھ پیسے کی ٹکیاں، تیس پیسے کی پٹاکری۔ دہی بڑے تو میں نے مانگے ہی نہ تھے۔ اس کے پیسے کیوں ملیں گے تجھے؟ ہو گئے نوّے پیسے، دس پیسے کل کے باقی ہیں۔ ۔ ۔ لے ایک روپیہ!"

گونگا چندرو پیسے لینے سے انکار کرتا۔ وہ کبھی پارو کی شوخ چمکتی ہوئی شریر آنکھیں دیکھتا، کبھی اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں کپکپاتے ایک روپے کے نوٹ کو دیکھتا اور سر ہلا کر انکار کر دیتا اور حساب سمجھانے بیٹھ جاتا۔ وہ وقت قیامت کا ہوتا تھا جب وہ پارو کو حساب سمجھاتا تھا۔ دہی بڑے کے تھال کی طرف اشارہ کر کے اپنی انگلی اپنے منہ میں رکھ کر چپ چپ کی آواز پیدا کرتے ہوئے گویا اس سے کہتا۔

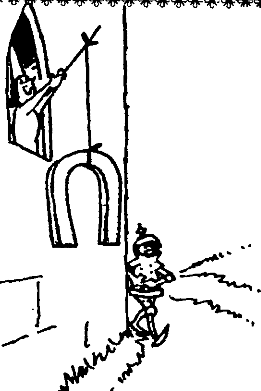
"دہی بڑے کھا تو گئی ہو، اس کے پیسے کیوں نہیں دو گی؟"

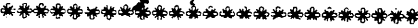
"تیس پیسے دہی بڑے کے بھی لاؤ!" وہ اپنے گلّے میں سے تیس پیسے نکال کر پارو کو دکھاتا۔

اس پر وہ فوراً چمک کر کہتی۔ "اچھا تیس پیسے مجھے واپس دے رہے ہو؟ لاؤ!"

اس پر چندرو فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا۔ "نہیں!" انکار سے وہ سر ہلا کر پارو کو سمجھاتا۔







"مجھے نہیں تمھیں دینا ہوں گے یہ تیس پیسے!" وہ اپنی تھدّی انگلی پارو کی طرف بڑھا کے اشارہ کر کے کہتا۔ اس پر فوراً پارو اسے ٹوک دیتی۔

"ابے اپنا ہاتھ پیچھے رکھ! نہیں تو ماروں گی چپّل!"

اس پر چندرو گھبرا جاتا۔ پارو کی ڈانٹ سے لاجواب ہو کر بالکل بے بس ہو کر مجبور اور خاموش نگاہوں سے پارو کی طرف دیکھنے لگتا کہ پارو کو اس پر رحم آ جاتا۔ جیب سے پورے پیسے نکال کر اسے دے دیتی اور بولتی۔

"تو بہت گھپلا کرتا ہے حساب میں۔ کل سے تیرے ٹھیلے پر نہیں آؤں گی!"

مگر دوسرے دن وہ پھر آ جاتی تھی۔ اسے چندرو کو چھیڑنے میں مزا آتا تھا۔ اور اب چندرو کو بھی مزا آنے لگا تھا۔ جس دن وہ نہیں آتی تھی حالانکہ اس دن بھی اس کی گاہکی اور کمائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، مگر نہ جانے کیا بات تھی چندرو کو وہ دن سونا سونا سا لگتا۔

جہاں اس کا ٹھیلا رکھا تھا، وہ اس کے سامنے کی گلی سے آتی تھی۔ پہلے پہل چندرو کا ٹھیلا بالکل یونین بینک کے سامنے ناکے پر تھا۔ ہولے ہولے چندرو اپنا ٹھیلا کھسکاتے کھسکاتے پارو کی گلی کے بالکل سامنے لے آیا۔ اب وہ دور سے پارو کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ سکتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے ٹھیلا یہاں لگایا تھا تو پارو ٹھیلے کی بدلی ہوئی جگہ دیکھ کر کچھ چونکی تھی۔ کچھ غصّے سے بھڑک گئی تھی۔

"ارے تو ناکے سے ادھر کیوں آ گیا رے گونگے؟"

گونگے چندرو نے ٹیلی فون ایکس چینج کی عمارت کی طرف اشارہ کیا، جہاں وہ اب تک ٹھیلا لگاتا آرہا تھا، ادھر کیبل بچھانے کے لیے زمین کھودی جارہی تھی اور بہت سے کالے کالے پائپ رکھے ہوئے تھے وجہ معقول تھی، پارو لاجواب ہوگئی۔ پھر کچھ نہیں بولی لیکن پھر جب کیبل بچھ گئے اور زمین کی مٹی ہموار کردی گئی تو بھی چندرو نے اپنا ٹھیلا نہیں ہٹایا اس پر بھی وہ کچھ نہ بولی، ہاں اس کے چنچل سبھاؤ میں ایک عجیب سی تیزی آگئی۔ وہ اسے پہلے سے زیادہ ستانے لگی۔

پارو کی دیکھا دیکھی اس کی دوسری سہیلیاں بھی چندرو کو ستانے لگیں اور کئی چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی۔ مگر لڑکوں کو تو چندرو ڈانٹ دیتا اور وہ جلدی سے بھاگ جاتے۔ ایک بار اس نے پارو کی سہیلیوں سے عاجز آکر انھیں بھی ڈانٹ بتادی تو پارو اس قدر ناراض ہوئی کہ اگلے تین چار روز تک چندرو کو ستانا بند کردیا۔ اس پر چندرو کو ایسا لگا کہ آسمان اس پر ڈھے پڑا ہو۔ یا اس کے پیروں تلے زمین پھٹ گئی ہو۔ پارو مجھے ستاتی کیوں نہیں ہے؟ طرح طرح کے حیلے بہانوں سے اس نے چاہا کہ پارو اسے ڈانٹ پلائے لیکن جب اس پر بھی پارو کے انداز نہیں بدلے اور ایک مہذب متمدن لیکن چاٹ بیچنے والے چندرو سے چھو کر دور کے فاصلے پر رکھنے والی لڑکی کی طرح اس سے چاٹ کھاتی رہی تو چندرو اپنی گونگی حماقتوں پر بہت نادم ہوا۔

ایک دفعہ اس نے بجائے پارو کے خود حساب میں گھپلا کردیا۔ سوا روپیہ بنتا تھا۔ اس نے پونے دو روپے طلب کیے جان بوجھ کر۔ خوب لڑائی ہوئی جم کے لڑائی ہوئی، آخر چندرو نے اپنی غلطی تسلیم کرلی، اور یہ گویا ایک طرح پچھلی تمام غلطیوں کی بھی تلافی تھی۔

چندرو بہت خوش ہوا، کیوں کہ پارو اور اس کی سہیلیاں اسے پھر ستانے لگی تھیں۔

بس اسے اتنا ہی کچھ چاہیے۔ ایک پازیب کی کھنک اور شریر ہنسی جو پھلجھڑی کی طرح اس کی گونگی سنسان دنیا کا ویرانہ ایک لمحے کے لیے روشن کردے۔ پھر جب پارو کے قدم سہیلیوں کے قدموں میں گڈمڈ ہوکے چلے جاتے، وہ اس کی پازیب کی کھنک دوسری پازیبوں کی کھنک سے الگ کرکے سن سکتا تھا کیوں کہ دوسری لڑکیاں بھی چاندی کی پازیبیں پہنتی تھیں مگر پارو کی پازیب کی موسیقی ہی کچھ اور تھی۔ یہ موسیقی جو اس کے کانوں میں نہیں، اس کے دل کے تنہا تاریک اور شرمیلے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔ بس اتنا ہی کافی تھا اور وہ اسی میں خوش تھا۔

اچانک مصیبت نازل ہوئی ایک دوسرے ٹھیلے کی صورت میں۔

کیا ٹھیلا تھا یہ! بالکل نیا اور جدید ڈیزائن کا چاروں طرف چمکتا ہوا کانچ لگا تھا۔ اوپر نیچے دائیں بائیں، چاروں طرف لال پیلے، اودے اور نیلے رنگ کے کانچ تھے۔ گیس کے دو ہنڈے بھی تھے جن سے یہ ٹھیلا بقعہ نور بن گیا تھا۔ پتل کی جگہ چمکتی ہوئی پلیٹیں تھیں۔ ٹھیلے والے کے ساتھ ایک چھوٹا سا چھوکرا بھی تھا جو گاہک کو بڑی مستعدی سے ایک پلیٹ اور ایک صاف ستھری نیپ کن بھی پیش کرتا تھا اور پانی بھی پلاتا تھا۔ چاٹ والے کے گھڑے کے گرد موگرے کے پھولوں کا ہار بھی لپٹا ہوا تھا اور ایک چھوٹا ہار چاٹ والے نے اپنی کلائی پر باندھ رکھا تھا اور جب وہ مسالے دار پانی میں گول گپے ڈبو کر پلیٹ میں رکھ کر گاہک کی طرف سرکاتا تو چاٹ کی کراری خوشبو کے ساتھ گاہک کے نتھنوں میں موگرے کی مہک بھی شامل ہوجاتی اور گاہک مسکرا کر نئے چاٹ والے سے گویا تمغے کی طرح وہ پلیٹ حاصل کرلیتا۔

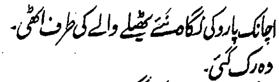
اور نیا چاٹ والا گونگے چاٹ والے کی طرف تحقیر سے دیکھ کر پُرغرور انداز میں زور سے کہتا۔

"چکھیے ___!"

ایک ایک دو دو کرکے چندرو کے بہت سے گاہک ٹوٹ کر نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع ہونے لگے، تو بھی چندرو کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی پھر آجائیں گے۔ یہ اونچی دکان پھیکے پکوان والے کب تک چندرو کی سچی اصلی اور صحیح مسالوں میں رچی ہوئی چاٹ کا مقابلہ کریں گے ہم بھی دیکھ لیں گے ___ اس نے دو ایک گاہکوں کو نئے چاٹ والے کی طرف جاتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ بھی لیا تھا اور اسے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ چکنی چمکتی پلیٹوں اور ہوٹل نما سروس کے باوجود انھیں نئے چاٹ والے کی چاٹ زیادہ پسند نہیں آرہی ہے۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہوکر اپنے کام میں جُت گیا یکایک اس کے کانوں میں پازیب کی ایک کھنک سنائی دی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

گلی سے پارو پازیب کھنکاتی اپنی سہیلیوں کے سنگ برآمد ہو رہی تھی۔ جیسے چڑیا چہکیں ایسے وہ لڑکیاں بول رہی تھیں کتنی ہی بڑی بڑی اور شوخ نگاہیں تھیں۔ فضا میں ابابیلوں کی طرح تیرتی ہوئی سڑک پار کرکے وہ اس کے ٹھیلے کی طرف بڑھنے لگیں۔



اچانک پارو کی نگاہ نئے ٹھیلے والے کی طرف اٹھی۔

وہ رک گئی۔

اس کی سہیلیاں بھی رُک گئیں۔

وہ سانس لیے بغیر پارو کی طرف دیکھنے لگا۔

پارو نے ایک اچٹتی سی نگاہ چندرو کے ٹھیلے پر ڈالی۔ پھر نخوت سے اس نے منہ پھیر لیا اور ایک ادائے خاص سے مڑ کر اپنی سہیلیوں کو لے کر نئے ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گئی۔

"تم بھی ؟ ___ تم بھی ؟ ___ پارو تم بھی ؟"

چندرو کا چہرہ غصہ و شرم سے لال ہو گیا۔ رگوں اور نسوں میں خون گونجنے لگا۔ جیسے اس کا حلق خون سے بھر گیا ہو۔ وہ کچھ بول نہیں سکا مگر اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اس موٹی دیوار کو توڑ دے گا جو اس کی روح کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ابھی چیخ کر کہے گا "تم بھی ! ___ پارو ! ___ تم بھی ! ؟" مگر خون اس کے حلق میں بھر گیا تھا۔ اس کے کان کسی بڑھتے ہوئے طوفان کی آوازیں سُن رہے تھے اور اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گویائی کی آخری کوشش گویا کسی لوہے کی دیوار سے ٹکرا کر لوٹ گئی تھی اور وہ سر جھکا کر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مگر بے چین پازیب کی کھنک ابھی تک اس کے دل میں تھی۔ پارو اور اس کی سہیلیاں نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع انواع و اقسام کی چاٹیں کھائے چلی جا رہی تھیں اور بیچ بیچ میں تعریفیں کرتی جا رہی تھیں، ان سب میں پارو کی آواز سب سے اونچی تھی۔

"ہائے کیسی لذیذ چاٹ ہے ! کیسے برابر کے مسالے ہیں ! ___ اس موئے (نام نہ لے کر محض اشارہ کر کے) پرانے ٹھیلے والے کو تو چاٹ بنانے کی تمیز ہی نہیں۔"

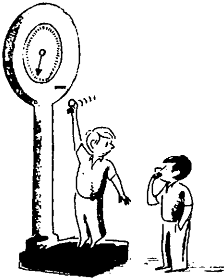
"اب تک جھوٹی پتّلوں میں چاٹ کھلاتا رہا ہے !"

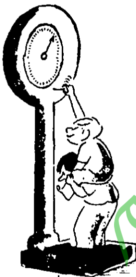
"اری اس کے ہاتھ تو دیکھو ___" پارو نے چمک کر چندرو کی طرف اشارہ کیا۔

"کیسے گندے اور غلیظ۔۔ معلوم ہوتا ہے سات دن سے نہایا نہیں !"

"ایک نیپ کن تو ہے نہیں اس کے پاس ! جب ہاتھ پونچھنے کے لیے مانگو، وہ ہی اپنا ۔۔۔ گندا میلا تولیا آگے کر دیتا ہے۔"

"اونہہ !" پارو کے پتلے پتلے ہونٹ نفرت سے خم ہو گئے ___ "میں تو کبھی اس چاٹ والے کے ٹھیلے پر تھوکوں بھی نا !"





اس کے آگے چندرو کچھ سُن نہ سکا۔ ایک لال آندھی اس کی نظروں میں چھا گئی۔ وہ گونگوں کی سی ایک وحشت زدہ چیخ کے ساتھ اپنا ٹھیلا چھوڑ کر آگے بڑھا اور اس نے نئے ٹھیلے والے کو جا لیا اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ لڑکیاں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں۔

چندرو نئے ٹھیلے والے اور اس کے چھوکرے دونوں پر بھاری ثابت ہوا۔ چندرو ایک وحشی جانور کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس نے نئے ٹھیلے والے کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اس کے ٹھیلے کے سارے کانچ توڑ ڈالے چھوکرے کی پٹائی کی۔ نیا ٹھیلا مع اپنے ساز و سامان کے سڑک پر اوندھا دیا پھر سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

پولیس آئی اور اسے گرفتار کر کے لے گئی۔

عدالت میں اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ عدالت نے اسے دو ماہ کی قید کی سزا دی اور پانسو روپے جرمانہ اور جرمانہ نہ دینے پر چار ماہ قیدِ با مشقت۔

سدھو حلوائی نے جرمانہ نہیں بھرا۔

اور دوسرا کون تھا جو جرمانہ ادا کرتا؟

چندرو نے پورے چھ ماہ جیل کاٹی۔

جیل کاٹ کر چندرو پھر سدھو حلوائی کے گھر پہنچ گیا۔ کوئی دوسرا اس کا ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ سدھو حلوائی پہلے تو اسے دیر تک گالیاں دیتا رہا اور اس کی حماقت پر اسے بے نقط سناتا رہا اور دیر تک چندرو سر جھکائے خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اگر وہ گونگا بھی نہ ہوتا تو کیا کہتا۔ اس کا جرم یہ نہیں تھا کہ اس نے ایک ٹھیلے والے کو مارا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک پازیب کی کھنک سنی تھی۔

جب سدھو حلوائی نے خوب اچھی طرح گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی، تو اس نے اسے پھر کام پر لگا لیا۔ آخر کیا کرتا؟ چندرو بے حد ایماندار اور اپنے کام میں مشاق تھا۔ اب جیل کاٹ کر آیا ہے تو تھوڑی عقل بھی آ گئی ہو گی کہ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس نے خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کے دو تین دن بعد پھر سے چندرو کو اسی اڈے پر ٹھیلا دے کر روانہ کر دیا۔

چندرو کی غیر حاضری میں سدھو نے ایک اچھا کام کیا تھا۔ اس نے چندرو کے ٹھیلے پر نیا رنگ و روغن کرا دیا، کانچ بھی لگا دیا تھا۔ پتیلوں کی جگہ کچھ سستی قسم کی پلیٹیں اور چمچے بھی رکھ دیے تھے۔

چندرو چھ ماہ بعد پھر سے ٹھیلا لے کر روانہ ہوا۔ آٹھویں دسویں گیارھویں سڑک پار کرکے لنگنگ روڈ کے ناکے پر آیا۔ یونین بنک سے گھوم کر ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے پہنچا۔ اس نے دیکھا، جہاں پہلے اس کا ٹھیلا تھا اب اس جگہ اس نئے ٹھیلے والے نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہی چھوکرا ہے وہی ٹھیلے والا ہے، اس ٹھیلے والے نے چندرو کو گھور کر دیکھا۔ چندرو نے اپنی نظریں چرا لیں۔ اس نے نئے ٹھیلے والے سے کچھ فاصلے پر ایکسچینج کے ایک طرف اپنا ٹھیلا روک دیا اور گاہکوں کا انتظار کرنے لگا۔

چار بج گئے، پانچ بج گئے، چھ بج گئے۔ کوئی گاہک اس کے پاس نہیں پھٹکا۔ دو ایک گاہک آئے مگر وہ نئے تھے اور اسے جانتے نہیں تھے، چار چھ آنے کی چاٹ کھا کر چل دیے۔ افسردہ دل چندرو سر جھکائے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی تولیا لے کر کانچ چمکاتا، ڈوئی ڈال کر گھڑے میں مسالے دار پانی ہلاتا۔ انگیٹھی میں آنچ ٹھیک کرتا، ہولے ہولے آلو کے بھرتے میں مٹر کے دانے اور مسالے ڈال کر ٹکیاں بناتا رہا۔

یکایک اس کے کانوں میں پازیب کی کھنک سنائی دی، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خون رخساروں کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھانا چاہتا تھا، مگر اس کا سر اوپر نہیں اٹھتا تھا۔ پازیب کی کھنک اب سڑک پر آ گئی تھی۔

پھر جسم و جان کا زور لگا کر اس نے اپنی گری ہوئی گردن اوپر اٹھائی اور جب دیکھا تو اس کی آنکھیں پارو پر جمی کی جمی رہ گئیں، اس کے ہاتھ سے ڈوئی گر گئی اور تولیا اس کے کاندھے سے اتر کر نیچے بالٹی میں بھیگ گیا اور ایک گاہک نے قریب آ کر کہا۔

”مجھے دو سموسے دو!“

مگر اس نے کچھ نہیں سنا۔ اس کے بدن میں جتنے حواس تھے، جتنے جذبات تھے سب کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔ اب اس کے پاس کوئی جسم نہ تھا۔ صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں۔

یہ اس کا ٹھیلا تھا۔ وہ چند قدم پر دوسرا ٹھیلا تھا اور وہ تکے جا رہا تھا۔ پارو کدھر جائے گی!

ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے گاہے گاہے اس کی طرف دیکھتے ہوئے لڑکیاں سڑک پر چلتے ہوئے ان دونوں ٹھیلوں کے قریب آ رہی تھیں۔ زیر بحث دھیرے دھیرے ساتھ چل رہی تھی۔ یکایک جیسے اس بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ لڑکیوں نے سڑک پار کرکے نئے ٹھیلے والے کو گھیر لیا۔

مگر چندرو کی نگاہیں نئے ٹھیلے کی طرف نہیں پھریں۔ وہ اس خلا میں دیکھ رہا تھا۔ گلی اور سڑک کے سنگم پر جہاں آج چھ ماہ بعد اس نے پارو کو دیکھا تھا۔ وہ سر اٹھائے دنیا و مافیہا، گرد و پیش سے بے خبر ادھر ہی دیکھتا رہا۔

وہ پتھر کی طرح کھڑا صرف خلا میں دیکھ رہا تھا۔

یکایک بڑی تیزی سے اکیلی پارو اپنی سہیلیوں سے کٹ کر اس ٹھیلے پر آ گئی اور چپ چاپ اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اسی لمحے گونگا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ آنسو نہیں تھے، الفاظ تھے شکر کے ——— دفتر تھے شکایتوں کے ——— ابلتے ہوئے آنسو..... فصیح اور بلیغ جملوں کی طرح اس کے گالوں پر بہتے آ رہے تھے اور پارو سر جھکائے سن رہی تھی۔

آج پارو گونگی تھی اور چندرو بول رہا تھا ——— ارے وہ کیسے کہے اس پگلے سے کہ پارو نے بھی تو چھ ماہ انہی آنسوؤں کا..... انہی آنسوؤں کا انتظار کیا تھا۔



موپاساں کی ایک زہریلی کہانی

اس شمارے کے لیے سید اقبال مشہدی کا انتخاب

یہ کہانی اس اعتماد کے ساتھ شائع کی جارہی ہے کہ اسے آپ یقیناً پسند کریں گے



عائشہ قمر

رینڈل ایک مہینے سے زیادہ کام کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ جب اُسے اپنے وطن ویلی ایوری میں، جو صوبے لامانشے کا ایک گاؤں تھا، کہیں کام نہ مل سکا، تو وہ اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگیا تاکہ کہیں اور ہاتھ پیر مارے۔ وہ ایک سفری بڑھئی تھا جس کی عمر ستائیس سال تھی۔ وہ بہت مضبوط اور بہت اچھا کاریگر تھا لیکن دو مہینے سے اپنے خاندان کا یہ سب سے چھوٹا رکن اس بات کے لیے مجبور ہوگیا تھا کہ اپنے رشتے داروں کے رحم وکرم پر اپنی اوقات بسر کرے۔ عام بے کاری کی وجہ سے گھومنے پھرنے کے سوا اب اس کا کوئی اور کام نہیں تھا۔ بمشکل تمام اسے روٹی نصیب ہوتی تھی، اس کی دو بڑی بہنیں جو دن میں کہیں باہر کام کرنے چلی جاتی تھیں، شام کو تھوڑے سے پیسے لے کر واپس آتیں۔ جیکسن رینڈل بے روزگار تھا حالانکہ خاندان میں وہ سب سے زیادہ مضبوط اور طاقت ور تھا۔ چونکہ اسے کوئی کام نہیں ملا تھا اس لیے اب وہ دوسروں کی کمائی میں حصہ بٹا رہا تھا۔

جب وہ ہر جگہ سے مایوس ہوگیا تو آخر میونسپلٹی میں اپنے ضلع کے افسر سے ملنے گیا اور وہاں سکریٹری سے اسے یہ ہدایت ملی کہ وہ لیبر سینٹرز جائے ——— وہاں اسے کام مل جائے گا چنانچہ اس نے اپنے کاغذات اور سندیں،



موپاساں

ایک نیا جوتا، ایک جوڑا قمیص اور پاجامہ، یہ سب سامان اپنی آسمانی دستی میں رکھ کر لکڑی سے باندھ لیا اور روانہ ہوگیا۔

راستے میں آرام کیے بغیر وہ برابر چلتا رہا۔ اپنا طویل سفر طے کرنے کے لیے اس نے نہ دن دیکھا نہ رات۔ نہ اسے بارش کی فکر تھی نہ دھوپ کی۔ وہ تو اس پُراسرار جگہ پہنچنے کے لیے بے قرار تھا جہاں بے روزگاروں کو کام مل جاتا ہے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے پیشے کا کام کرے گا لیکن ہر بڑھئی کی دکان سے اُسے ناکامی ہوئی اور اس سے کہا گیا کہ مال کی کھپت نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے لگے ہوئے آدمیوں کو بھی الگ کر دیا ہے۔ اپنا یہ ذریعۂ معاش ختم ہوتا دیکھ کر اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ جو بھی کام اسے کہا گیا ـــــ وہ کرے گا۔ اس نے نہریں بنانے کے لیے زمین کھودی، سائیس بنا، پتھر توڑے، لکڑیاں چیریں، درختوں کی شاخیں کاٹیں، کنویں کھودے، لکڑیوں کے گٹھے اُٹھائے۔ پہاڑوں پر بکریاں چرائیں، اور گارا ڈھویا اور یہ سب کام اس نے چند ٹکوں کے بدلے کیے۔ اسے یہ کام اتفاقیہ دو تین دن تک ملتے رہے جنھیں وہ اتنی معمولی مزدوری میں شرم و ندامت کے ساتھ کرتا رہا۔ یہ کام اس نے کافی محنت اور کوشش سے کیے تاکہ اس کے آقا اور دیہاتی کسانوں کو دوبارہ اس سے کام لینے کی ترغیب ہو۔

اور اب ایک ہفتے سے نہ تو اس کے پاس کوئی کام تھا اور نہ پیسے رہے تھے۔ صرف روٹی کا ایک ٹکڑا بچا تھا جو دروازوں پر بھیک مانگ کر اس نے چند ہمدرد عورتوں سے حاصل کیا تھا۔ اندھیرا ہوتا جا رہا تھا، اور جیکسن رینڈل تھک گیا تھا۔ اس کے پیر جواب دے چکے تھے۔ معدہ خالی تھا اور وہ مایوس اور شکستہ دلی کے ساتھ ننگے پاؤں سڑک کے ایک طرف گھاس پر چل رہا تھا۔ اس کا جوتا پھٹ چکا تھا اور دوسرا جوتا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے تھا۔ موسمِ خزاں کے آخری ایّام تھے، پانی سے بھرے ہوئے سیاہ بادل درختوں کے اوپر تیزی سے دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہفتے کی اُس شام، جب کلیسا میں کوئی تقریب ہو رہی تھی، پورا قصبہ سنسان تھا۔ کھیتوں میں اِدھر اُدھر غلّے اور گھاس پھوس کے بڑے بڑے انبار زرد کلاہ باراں کی طرح لگے ہوئے تھے اور خالی کھیت دوسرے سال کے لیے جوتے جا چکے تھے۔

رینڈل بھوکا تھا۔ ایک جنگلی جانور کی طرح بھوک سے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس کی اس بھوک کی وہی کیفیت تھی جو بھیڑیے کو انسان پر حملے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ ضعف و ناتوانی سے نڈھال ہو کر اس نے بڑے بڑے ڈگ بھرنے شروع کیے تاکہ چھوٹے چھوٹے قدموں کی مصیبت سے بچ جائے۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا اور خون کی تیز گردش کی وجہ سے اس کی کنپٹیاں پھٹی جا رہی تھیں۔ اس نے اپنی لاٹھی اپنے ہاتھوں میں اس خواہش کے ساتھ مضبوط پکڑ لی کہ جو آدمی بھی اپنے گھر کھانا کھانے جاتا ہوا اسے ملے گا، وہ اپنی پوری قوت سے اس کا سر پھوڑ دے گا۔

اس نے سڑک کی طرف دیکھا۔ عالمِ تصوّر میں اسے یہ نظر آیا کہ آلو زمین کھودے ہوئے پڑے ہیں۔ اگر یہ کہیں اسے مل جائیں تو وہ جنگل سے خشک لکڑیاں چُن کر آگ جلائے اور اس کے لیے عمدہ کھانا تیار ہو جائے۔ سب سے پہلے وہ اپنے سرد ہاتھوں سے ان کے ریشے پکڑ کر بھونے گا۔ لیکن یہ سب ایک تصوّر تھا، ایک خیال تھا۔ آلو کی فصل کا یہ موسم ہی نہیں تھا، اگر وہ کچھ کھانا چاہے تو روز کی طرح آج بھی اسے کھیت سے چقندر نکال کر کچے ہی کھا لینے چاہئیں۔

اپنے تیز قدموں کی طرح، خیالات کی فراوانی کی وجہ سے وہ دو دن تک بڑبڑاتا رہا۔ اس سے پہلے اس کے دماغ میں خیالات کا اتنا ہجوم نہیں آیا تھا۔ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ اس کی وہ صنعتی لیاقت اور ذہنی قوت جو اس کے پیشے کے لیے ضروری تھی سب کی سب برباد ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ کمزوری، نقاہت اور کام نہ ملنے کی وجہ سے مایوسی، ناامیدی اور پریشانی، ہر جگہ سے صاف انکار، کھلی ہوا میں گھاس پر لیٹ کر راتیں گزارنا، بھوک پیاس کی شدت، ان سب نے مل کر اسے ایک پیٹ بھرے کی نظر میں ـــ اُس

شخص کی نظر میں جس کا گھر بار ہو، آوارہ گرد اور بدمعاش بنا دیا تھا۔ رہ رہ کر ایک سوال وہ اپنے آپ سے کرتا تھا: "پھر جب یہ حالات ہیں تو تم اپنے گھر پر کیوں نہیں رہے؟" مصیبتوں اور تکلیفوں نے اس کے مضبوط ہاتھ ناکارہ بنا دیے تھے۔ اسے اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کی یاد نے، جن کے پاس ایک دمڑی بھی نہ تھی، اور بھی زیادہ غصے سے بھر دیا تھا۔ ضبط کے باوجود ہر ہر لمحے اس کا رنج و غم بڑھتا جا رہا تھا اور رہ رہ کر وہ اپنے دانت پیستا اور بڑبڑاتا۔

جب اس کے ننگے پیروں میں پتھروں کی ٹھوکریں لگتیں وہ کراہ اٹھتا: "اُف کیسی مصیبت ہے۔ کتنی تکلیفیں ہیں! آہ کتنی بدبخت ہے یہ دُنیا! کتنی خود غرض، مکّار، دغا باز، کمینی اور اذیتوں سے بھری ہوئی ہے یہ دنیا اور اس میں رہنے والے کس قدر کھاؤ اڑاؤ اور پیٹو ہیں، کتنے غلیظ، نجس اور گندے ہیں..... میں ..... میں ایک دست کار، ایک ہوشیار بڑھئی، ایک عمدہ کاریگر — آہ! مجھے اس طرح بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے — میرے لیے — میرے لیے ان کے پاس دو پیسے بھی نہیں ہیں — اُف! بارش بھی ہونے لگی۔"

اپنی قسمت کی اس ناانصافی پر وہ بے حد غضب ناک اور برہم تھا۔ وہ انسانوں کو اپنی تباہی کا ذمّے دار قرار دیتا تھا۔ دنیا کے تمام انسانوں کو، قدرت کو — اس بڑی اور اندھی ماں کو جو مہربان، بے انصاف سنگدل، بے رحم، ظالم، دھوکے باز، فریبی اور خائن ہے۔

صبح کے کھانے کا وقت تھا اور مکانوں کی چمنیوں سے آہستہ آہستہ دھواں نکل رہا تھا۔ اس کا خیال انسانوں کی اس کمزوری کی طرف منتقل ہونے لگا جسے چوری، ڈاکا اور تشدّد کہتے ہیں، بالکل غیر ارادی طور پر اس کا دل چاہا کہ وہ ان مکانوں میں گھس جائے اور ان میں رہنے والوں کو قتل کر دے اور خود ان کی جگہ میز پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔

وہ اپنے دل میں کہنے لگا: "مجھے بھی حق ہے کہ میں کھاؤں پیوں اور زندہ رہوں" — لیکن یہ کمینے انسان مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں — ان رذیلوں نے مجھے بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے — اور میں کہتا ہوں کہ مجھے کام دو، میں محنت کر کے پیٹ بھرنا چاہتا ہوں بدمعاش — سور کے بچے!" اس کے بدن کے ہر حصے میں سخت درد ہونے لگا، اس کے دل میں دھڑکن تیز ہوگئی اور درد کی وجہ سے اس کا سر پھٹنے لگا، اس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ اس کے دماغ میں صرف یہ خیال گونج رہا تھا کہ: "اس دنیا میں میں بھی رہتا ہوں، اس ہوا میں میں بھی سانس لیتا ہوں — پھر جب ہوا کسی کی ملکیت نہیں — ہوا پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی تو روٹی پر کیوں پابندی لگائی ہے؟ میرا بھی حق ہے کہ میں بھی سب کی طرح کھاؤں — کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مجھ سے روٹی چھین لے۔"

برفیلی، سرد، موسلا دھار نہایت نفیس بارش شروع ہوگئی۔ وہ چلتے چلتے رک گیا اور بڑبڑانے لگا: "ہائے کتنی بد قسمتی ہے! مجھے گھر سے آئے ہوئے ایک مہینہ گزر چکا۔" اس نے گھر کے متعلق سوچا۔ اسے خیال پیدا ہوا کہ واپس گھر چلنا چاہیے کیوں کہ وہ اپنے گھر پر زیادہ آسانی سے کوئی نہ کوئی کام تلاش کرے گا۔ وہاں کے سب جانتے ہیں — اور اب تک جو کچھ گزر چکا ہے، اسے بھول جانا چاہیے — یہاں ان سڑکوں پر راہ گیر اس کے متعلق کیا خیال کرتے ہوں گے۔ اپنے وطن میں اگر اسے اپنے پیشے کا کام نہیں ملا تو وہ کوئی دوسرا کام کرنے لگے گا۔ زمین کھودے گا یا سڑک پر پتھر توڑنے والوں میں شامل ہو جائے گا۔ اگر اس کام سے اسے دو آنے روز کی آمدنی بھی ہونے لگے گی تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنی گزر بسر تو کر ہی لے گا۔ اس نے اپنی دستی اپنے گلے میں باندھی تاکہ سینے اور پیٹھ پر بہتا ہوا سرد پانی روک سکے لیکن اس کی یہ کوشش فضول تھی۔ پانی کپڑوں میں سے گزر کر پھر اس کا جسم شرابور کرنے لگا۔ وہ سخت مایوس اور سنجیدہ نظروں سے اپنا جسم دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس جگہ اپنا سر چھپا کر تھوڑا سکون حاصل کرے۔ اس مہذب اور متمدّن دنیا میں پناہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

رات آئی اور پورے قصبے پر تاریکی چھا گئی۔ دور سبزہ زار پر اس نے ایک سیاہ نشان دیکھا۔ یہ ایک گائے تھی۔ وہ پگڈنڈی سے ہٹ کر سڑک پر آ گیا اور سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو گائے نے اپنا سر اٹھایا — اور ایک دم اسے یہ خیال آیا کہ اگر اس کے پاس کوئی برتن ہوتا تو وہ کچھ دودھ دوہ لیتا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور گائے کی

طرف غور سے دیکھنے لگا۔ گائے نے بھی اس کی طرف منہ اٹھایا۔ اور پھر یکایک ایک زور کی ٹھوکر مار کر کہا۔ "ہمّھ۔"

غریب جانور اپنے بھاری تھن لٹکا کر آہستگی سے کھڑا ہوگیا اور رینڈل اس کے پیروں میں گھس کر اس کا دودھ پینے لگا۔ جب تک اس جاندار کنوئیں میں دودھ کا ایک قطرہ بھی باقی رہا، وہ برابر پیتا رہا لیکن بارش بہت تیزی سے شروع ہوگئی تھی اور اس اجڑی زمین میں سر چھپانے کو کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس وقت اسے بہت سردی لگنے لگی۔ دور کسی مکان کی کھڑکی میں اس نے روشنی کی ایک جھلک دیکھی۔

گائے بعد سے پھر بیٹھ گئی اور رینڈل بھی اسی کے پاس بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ گائے کا دودھ پی کر کتنا ممنون ہوگیا تھا۔ دو بڑی گرم سانسیں کسی فوارے کی طرح جانور کے نتھنوں سے نکل کر اس سرد موسم میں کاریگر کے منہ پر لگیں تو وہ حیرت سے کہنے لگا۔

"ارے تمہارے پیٹ میں سردی نہیں ہے؟" اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیے اور خود وہ اس کے قریب کھسک گیا، وہاں اسے کچھ گرمی محسوس ہوئی ۔۔۔ اور پھر اسے خیال آیا کہ اس بڑے پیٹ کے پاس لیٹ کر رات گزارنا چاہیے۔ اس نے اپنا سر گائے کے ان تھنوں کے قریب کر لیا جن سے کچھ دیر دودھ پی کر وہ سکون حاصل کر چکا تھا، نیند آگئی۔

اس کے باوجود وہ کئی بار اُٹھا۔ اس کی پیٹھ اور پیٹ کا وہ حصہ جو ہوا میں کھلا تھا اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ منجمد ہوگیا ہے۔ اس نے کروٹ بدل لی اور پھر گہری نیند سو گیا۔

مرغ کی بانگ نے اسے جگایا۔ صبح ہونے والی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی اور مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا۔ گائے اپنا منہ چلا چلا کر جگالی کر رہی تھی۔ رینڈل اپنے ہاتھ ٹیک کر زمین پر جھکا تاکہ گائے کے مرطوب نتھنوں کو پیار کرے۔ وہ کہنے لگا "خدا حافظ اے میری محبوبہ! کل شام تک کے لیے خدا حافظ۔ تو کتنی نیک اور پیار کے قابل ہے۔"

اس نے اپنے نئے جوتے پہنے اور روانہ ہوگیا۔ دو گھنٹے تک وہ اس سیدھی اور لمبی سڑک پر برابر چلتا رہا لیکن اب اس میں چلنے کی سکت نہیں تھی، وہ بے دم ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ دن کافی چڑھ گیا تھا اور کلیسا کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ مرد اپنے آسمانی لباسوں میں اور عورتیں سفید ٹوپیاں لگائے پیدل یا گاڑیوں میں بیٹھے آس پاس کے گاؤں میں جا رہے تھے تاکہ اتوار کا دن وہ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے ساتھ گزاریں۔

ایک طاقت ور دیہاتی، خوف زدہ اور چلّاتی ہوئی بھیڑوں کا ایک گلّہ گھیرے ہوئے آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بہت چست و چالاک کتا تھا جو بھیڑوں کو اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتا تھا۔

رینڈل اپنی جگہ سے اٹھ کر سڑک پر آیا اور اپنی ٹوپی اٹھا کر دیہاتی کو سلام کیا اور کہنے لگا، "جناب کیا آپ کے پاس بھوک سے مرتے ہوئے آدمی کے لیے کچھ کام ہے؟"

دیہاتی نے قہر آلود نظروں سے آوارہ گرد کی طرف دیکھا اور غصّے سے کہنے لگا "میرے پاس ان بدمعاشوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو سڑکوں پر اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہوں۔"

بڑھئی پھر ایک گڑھے پر آ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ التجا کرنے سے پہلے وہ بہت دیر تک بیٹھا کسی آدمی کا انتظار کرتا رہا جس کی صورت سے نیکی اور رحم دلی ظاہر ہوتی ہو۔ آخر ایک آدمی کا انتخاب کر کے جو اوور کوٹ پہنے تھا اور جس کے کوٹ پر سونے کی زنجیر لٹک رہی تھی، کہنے لگا۔

"جناب عالی! دو مہینے سے کام کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہوں لیکن مجھے اب تک کوئی کام نہیں ملا اور اب میرے پاس ایک دھیلا تک نہیں ہے۔"

اس نیم شریف صورت آدمی نے کاریگر کو غور سے دیکھا اور پھر جواب دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ اور جا کر وہ نوٹس بورڈ پڑھ لو جو گاؤں کے سرے پر لٹکا ہوا ہے۔ تمہیں معلوم ہے وہ کیا ہے، بستی کی حدود میں بھیک مانگنا ممنوع ہے، اور تم مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟ ۔۔۔ میں اس ضلع کا حاکم ہوں ۔۔۔ اگر تم فوراً ہی یہاں سے نکل نہ گئے تو میں تمہیں گرفتار کرا دوں گا۔"

رینڈل جسے حاکمِ ضلع کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا، جھنجھلا کر کہنے لگا "اگر تم مجھے گرفتار کرنا چاہو تو گرفتار کر لو، میرے لیے ہر صورت میں یہ بہتر ہے۔ میں بھوک سے تو نہ مروں گا اور مجھے سر چھپانے کو جگہ تو مل جائے گی۔" اور پھر واپس جا کر وہ اپنے گڑھے پر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے آئے پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ دو سپاہی سڑک پر دکھائی دیے۔ وہ پہلو بہ پہلو آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور ان کی چمک دار ٹوپیاں سورج کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں، ان کی زرد وردیاں اور پیٹی کے بٹن ایک دہشت۔ آوارہ گرد کو ڈرا کر بھگانے کے لیے کافی تھے، وہ سمجھ گیا کہ سپاہی اسی کے پاس آ رہے ہیں مگر وہ اپنی

جگہ بیٹھا رہا۔ مقابلہ کر کے اپنے آپ کو گرفتار کرا دینے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو چکی تھی۔

سپاہی اس کی طرف اس طرح آ رہے تھے جیسے انھوں نے کاریگر کو دیکھا ہی نہ ہو۔ اپنا توازن قائم کیے اور فوجی انداز میں ہنس کی چال چلتے ہوئے وہ جب اس کے پاس سے گزرنے لگے تو ایکدم ٹھہر گئے۔ افسر نے غصّے سے دھمکا کر پوچھا: "یہاں بیٹھے تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں یہاں آرام کر رہا ہوں۔" کاریگر نے سکون سے جواب دیا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"اگر میں یہ بتاؤں کہ کہاں سے آیا ہوں، تو اس میں ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ویلی ایوری۔"

"یہ کہاں ہے؟"

"صوبے لا ماشنے میں۔"

"وہیں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں۔"

"وہاں سے کیوں آئے؟"

"روزگار کی تلاش میں۔"

افسر اپنے چالاک ساتھی کی طرف مڑا اور غصّے کے لہجے میں کہنے لگا۔ "میں ان بدمعاشوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" اور کاریگر کی طرف مڑ کر بولا۔ "تمھارے پاس کاغذات ہیں؟"

"بتاؤ۔"

رینڈل نے اپنی شکستہ سندیں اور کاغذات جو میلے کچیلے اور پھٹے پرانے تھے، جیب سے نکال کر دیے جنھیں اُس نے رُک رُک کر اور ہجے کر کر کے پڑھا اور یہ دیکھ کر کہ وہ سب صحیح ہیں، اسے واپس کر دیے۔ مگر اس نے رینڈل کو ایسی شکی اور مشتبہ نظروں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں کہ تم مجھ سے بھی زیادہ چالاک نکلے اور مجھے بھی فریب دے دیا۔

افسر نے چند لمحوں تک اسے دیکھنے کے بعد پھر پوچھا: "اچھا تمھارے پاس کچھ روپیہ پیسہ بھی ہے؟"

"نہیں۔"

"ایک پیسہ بھی نہیں؟"

"ہاں صاحب ایک پیسہ بھی نہیں۔"

"تو پھر تم کھاتے پیتے کہاں سے ہو؟"

"جو کچھ کہیں سے مل جاتا ہے، کھا پی لیتا ہوں۔"

"اچھا تو تم بھیک مانگتے ہو؟"

رینڈل نے استقلال سے جواب دیا۔ "ہاں صاحب جب بھوک سے جان نکلنے لگتی ہے تو مانگتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" افسر نے کہا اور پھر اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تمھارے پاس جائز طریقے سے کھانے پینے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم خود کو میرے حوالے کر دو اور میرے ساتھ ضلع کے حاکمِ اعلا کے پاس چلو۔"

کاریگر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "جو آپ کا مزاج چاہے کریں۔" اور پھر وہ ان کے کہنے سے پہلے ہی ان دونوں کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا، اور افسر سے مخاطب ہو کر بولا: "چلو مجھے قید کرا دو۔ وہاں بارش کے ایام میں سر چھپانے کو جگہ تو مل جائے گی۔"

اور پھر وہ سب کے سب گاؤں کی طرف چل دیے۔

ایک میل دُور ہی سے مکانوں کے سُرخ سُرخ کھپریل بے جان درختوں کی شاخوں سے نظر آنے لگے۔ جس وقت وہ گاؤں میں پہنچے، عبادت شروع ہونے والی تھی۔ کلیسا کا احاطہ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا آدمی اس ملزم کو دیکھنے لگے جو دو سپاہیوں کی حراست میں آ رہا تھا اور جس کے پیچھے گاؤں کے شوریدہ سر لڑکے غل غپاڑا مچاتے آ رہے تھے۔ مرد اور عورتیں اس قیدی کو نفرت اور حقارت سے دیکھ رہی تھیں۔ سب اس پر پتھر پھینکنے کو تیار تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بس چلے تو وہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔ اپنے پیروں سے اسے کچلیں اور روند ڈالیں وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ اس نے ڈاکا ڈالا ہے یا کسی کو قتل کیا ہے؟ - ایک شخص — جو پہلے کبھی سپاہی رہ چکا تھا، کہنے لگا کہ "یہ تو عادی مجرم ہے۔ فرار ہو گیا تھا، اب ہاتھ آیا ہے۔"

ایک تمباکو فروش نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ "نہیں یہ وہ شخص ہے جو صبح مجھے ایک کھوٹی اکنّی دے گیا تھا۔"

تیسرے آدمی نے جو لوہے کا سامان فروخت کرتا تھا اپنی

رائے پیش کی کہ یہ "فلاں کی بیوہ کا قاتل ہے۔ پولیس چھ مہینے سے اس کی نگرانی کر رہی تھی۔"

سپاہی اسے میونسپل کے دفتر میں لے گئے جہاں رینڈل نے دوبارہ حاکمِ ضلع کو دیکھا۔ وہ ایک اسکول ماسٹر کے بازو میں اپنی منصفی کی کرسی پر متکبرانہ انداز سے بیٹھا تھا۔

مجسٹریٹ اسے دیکھتے ہی چلّایا "ارے! ارے! تم آخر یہاں آ گئے، دیکھو میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمھیں گرفتار کرا دوں گا۔" اور پھر اس افسر کی طرف مخاطب ہوا جو اسے گرفتار کر کے لایا تھا۔

"اچھا! اس نے کیا جرم کیا ہے؟"

"جناب عالی! یہ ایک آوارہ گرد ہے بے خانماں۔ نہ اس کا کوئی وطن ہے نہ گھر بار ۔۔۔ یہ سب باتیں خود اسی نے بتائی ہیں البتہ اس کے پاس کچھ کاغذات اور سندیں ہیں جو ٹھیک اور درست معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے اسے بھیک مانگنے کے جرم میں گرفتار کیا ہے۔"

مجسٹریٹ نے رینڈل سے کاغذات طلب کیے اور انھیں پڑھا۔ دوبارہ پڑھا پھر واپس کر دیے۔ پھر اس نے افسر سے کہا اس کی تلاشی لی جائے۔ اور جب تلاشی میں اس کے پاس کچھ نہیں نکلا تو مجسٹریٹ سخت پریشان ہوا اور کاریگر سے کہنے لگا۔

"آج صبح سڑک پر بیٹھے تم کیا کر رہے تھے؟"

"میں کام کی تلاش میں بیٹھا تھا۔"

"کام کی تلاش میں؟ سڑک پر؟"

"تو اور کیا جناب آپ کا خیال ہے میں جنگل میں جا کر چھپ جاؤں تو مجھے کام ملے گا؟" سپاہی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر رینڈل پر نفرت و حقارت کی نگاہ ڈالی۔ گویا وہ کسی عجیب مخلوق سے تعلق رکھتا تھا۔ مجسٹریٹ نے پھر اس سے کہا۔

"اچھا میں تمھیں اس وقت چھوڑتا ہوں ۔۔۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ اب کبھی میرے سامنے نہ آنا۔"

کاریگر سخت پریشان ہوا ۔۔۔ اس نے مجسٹریٹ سے کہا "میں نے تو اپنے روزگار کی تلاش میں اس قدر دوڑ دھوپ کی ہے کہ اب میں خود"

"خاموش رہو" مجسٹریٹ نے ڈانٹا اور پھر سپاہیوں سے کہا کہ "اس منہ زور کو گاؤں کی حد سے دو سو گز دور نکال دو، اور پھر اسے مجبور کرو کہ یہ اپنا سفر جاری رکھے اور دوبارہ واپس نہ آنے پائے۔"

"جناب آپ کچھ بھی کہیے" کاریگر نے مایوسی سے کہا "مگر مجھے کچھ کھانے کو دیجیے۔" مگر اس کی سنتا کون۔ مجسٹریٹ بھڑک اٹھا "خوب ایک تو جرم کرو اور کھانے کو بھی مانگو؟۔ دور ہو جاؤ۔ تم جیسوں کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

لیکن رینڈل استقلال سے کہے جا رہا تھا "آپ لوگ مجھے بھوکا مار کر اس بات کے لیے مجبور کر رہے ہیں کہ میں واقعی کسی جرم کا ارتکاب کروں اور یاد رکھیے میرا جرم آپ جیسے پیٹ بھروں کے لیے مصیبت بن جائے گا۔"

مجسٹریٹ کھڑا ہو گیا اور سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا "لے جاؤ، لے جاؤ۔ اسے دیکھ کر مجھے سخت غصہ آ رہا ہے۔"

دونوں سپاہیوں نے اس کے بازو پکڑ کر اسے باہر نکال دیا۔ اس نے بھی کوئی مدافعت نہ کی اور گاؤں سے گزرتا ہوا پھر ایک بار اس گڑھے کے پاس آ گیا۔ جب وہ دو سو گز دور آ گیا تو سپاہی نے اس سے کہا "دفعان ہو جاؤ۔ اب کبھی یہاں نہ آنا، اور اگر پھر میں نے تم کو گرفتار کر لیا تو یہ تمھارے لیے بہت برا ہوگا۔"

رینڈل نے کوئی جواب نہیں دیا اور سوچے سمجھے بغیر ایک طرف چل دیا۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ گھومتا پھرتا رہا۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی، اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ جب وہ ایک چھوٹے سے مکان کے پاس سے گزرا جس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی تو وہ یکایک رک گیا۔ مکان میں سے بھنے گوشت اور شوربے کی خوشبو آ رہی تھی۔ بھوک کی خوفناک شدت نے اسے دیوانہ کر دیا۔ وہ سخت مضطرب اور بے چین ہو گیا اور کسی جنگلی جانور کی طرح بے تاب ہو کر مکان کی طرف جھپٹا۔

مکان کے دروازے پر جا کر وہ گڑگڑانے لگا اور التجا کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں، کچھ میری بھی خبر لو۔ میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔" اس نے دروازے پر دستک دی لیکن جب اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے پوری قوت سے اپنی لکڑی دروازے پر ماری ۔۔۔ اور پھر گڑگڑانے لگا۔ "خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو، دروازہ تو کھولو۔" اس کے باوجود بھی جب اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ کھلی کھڑکی کے پاس گیا اور اب بالکل قریب سے گوشت، چوزے، گوبھی اور شوربے کی خوشبو آئی، اب ضبط کرنا اس کے اختیار سے باہر ہو گیا تھا وہ اچک کر کھڑکی پر چڑھ گیا اور مکان

میں داخل ہوگیا۔ دو آدمیوں کے لیے میز پر کھانے کا سامان رکھا تھا اس نے خیال کیا مکان والے گرجا چلے گئے ہوں گے اور وہاں سے واپس آکر کھانے کے لیے یہ چیزیں چھوڑ گئے ہوں گے۔ چولھے پر نہایت عمدہ اُبلا ہوا گوشت رکھا تھا اور دوسری طرف دو ڈش پر ترکاریوں کا شوربا، ڈبل روٹیاں اور شراب کی دو پوری بھری ہوئی بوتلیں رکھی تھیں۔ رینڈل نے سب سے پہلے روٹی پر ہاتھ مارا اور اتنی طاقت سے اسے توڑا گویا وہ کسی آدمی کا گلا دبا رہا ہو اور پھر کسی درندے کی طرح کسی بھوکے اور حریص آدمی کی مانند، اس نے روٹی کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ لیا اور جلدی جلدی اسے نگلنے لگا لیکن چولھے پر چڑھے ہوئے گوشت کی خوشبو نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے کڑھائی کا ڈھکن ہٹایا اور کانٹے سے گائے کے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا نکال لیا، پھر اس نے گاجر، گوبھی اور پیاز کی ترکاریاں رکابی بھر بھر کے نکالیں اور یہ ساری چیزیں میز پر رکھ کر خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پہلے گوشت کے چار ٹکڑے کیے۔ پھر نہایت اطمینان سے اپنے گھر کی طرح انھیں کھانے لگا۔ ان ترکاریوں کے علاوہ جب وہ بہت سا گوشت بھی کھا چکا تو اسے پیاس لگنے لگی، وہ اٹھا اور دو ڈش پر سے شراب کی ایک بوتل اٹھا لایا۔

جب وہ شراب گلاس میں ڈالنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ برانڈی تھی۔ اچھا ہے اس نے اپنے دل میں کہا، سردی میں ٹھٹھرنے کے بعد یہ شراب میرے بدن اور خون میں آگ لگائے گی۔ اور یہ بہت اچھا ہوگا۔ اس نے تھوڑی سی شراب پی۔ وہ بہت تیز اور نہایت عمدہ تھی۔ شاید اتنے عرصے تک شراب نہ ملنے کی وجہ سے وہ اس کا عادی نہ رہا ہو۔ اس کے باوجود وہ پورا گلاس دو گھونٹوں میں ختم کر گیا ـــــ اب اسے سکون ہوا۔ الکحل کے اثر سے وہ بے خود ہوگیا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ خوشی و مسرت کی لہریں اس کے جسم میں دوڑنے لگی ہیں اور اس پر سرمستی اور بے خودی کا ایک دورہ سا پڑنے لگا۔

مگر وہ اب تک کھاتے جا رہا تھا۔ اگرچہ اب اس کے کھانے میں پہلے کی طرح بے تکا پن نہیں تھا، آہستہ آہستہ وہ شوربے میں روٹی ڈبوتا اور کھا لیتا۔ اس کا بدن جلنے لگا اور اس کی رگیں پیشانی کے آس پاس پھڑکنے لگیں۔ یکایک اس نے گرجا کی گھنٹی سنی۔ نماز ختم ہو رہی تھی۔ اسے فوری خطرے کا احساس ہوگیا۔ اپنی حفاظت کی وہ تدبیر جو غیر محسوس طریقے پر انسان میں ہوتی ہے، اس میں بھی عود کر آئی اور وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ اپنی روٹی کا بچا ہوا ٹکڑا اور شراب کی بوتل اس نے اپنی جیب میں رکھی اور کھڑکی کی طرف دوڑا اور سڑک پر نگاہ ڈالی۔ وہ اب تک سنسان تھی اور کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے نیچے کودا اور سڑک پر چلنے کے بجائے کھیتوں میں ہوتا ہوا جنگل کی طرف بھاگا۔

اب وہ اپنے جسم میں چستی و چالاکی، طاقت و توانائی اور خوشی و مسرت محسوس کر رہا تھا، اپنے کیے پر اسے ذرا بھی ملال اور صدمہ نہ تھا بلکہ وہ خوش اور مطمئن تھا۔ وہ کھیتوں اور باڑوں میں سے اچھلتا کودتا ہوا بھاگا جا رہا تھا جب وہ ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچا تو اس نے دوبارہ اپنی جیب سے شراب کی بوتل نکالی اور ٹھہرے بغیر تھوڑی سی پی لی۔ اب اس کے خیالات میں ہیجان پیدا ہونے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، شراب اور کھانے سے اس کے پیروں میں لچک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کوئی گیت گاتا ہوا برابر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اس وقت وہ ایک گھنی، تاریک اور سرد دلدل کے پاس سے گزر رہا تھا، اس کے پاؤں کے نیچے سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار دیکھ کر اسے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے بچپن کی طرح اس وقت بھی گھاس پر سوئے اور قلا بازیاں لگائے ـــــ

اس کا دماغ بے قابو ہو رہا تھا اور نشے کی وجہ سے وہ یاوہ گوئی کر رہا تھا۔ اس نے گھاس پر خوب قلا بازیاں لگائیں اور پھر کوئی گیت گانے لگا۔

وہ چلتے چلتے ایک ڈھلوان سڑک کے کنارے پہنچا۔ سڑک پر ایک دراز قد لڑکی جا رہی تھی، اس کے پاس دو گھڑے تھے جن میں دودھ بھرا ہوا تھا۔ شاید وہ اپنے گاؤں واپس جا رہی تھی، رینڈل نے اسے دیکھا تو تھوڑا اور آگے جھک گیا اور اس کی آنکھیں اس کتے کی طرح چمکنے لگیں جسے اپنے شکار کا کھوج مل گیا ہو۔ جب لڑکی اس کے قریب آئی تو کھڑی ہو گئی اور اپنا سر اٹھا کر کہنے لگی "کیا تم تھے جو ابھی گا رہے تھے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اپنی جگہ سے سڑک پر کود پڑا۔ حالانکہ وہ سڑک سے تقریباً چھ فٹ بلند جگہ پر تھا۔ جب وہ لڑکی کے سامنے اس طرح یکایک کودا تو وہ سہم گئی اور کہنے لگی میاں تم نے تو

مجھے ڈرا دیا۔"

اس نے لڑکی کا کہنا بالکل نہیں سُنا۔ وہ شراب کے نشے میں بدمست ہو رہا تھا۔ وہ کسی دوسری خواہش کے ماتحت دیوانہ ہو رہا تھا۔ ایک ایسی خواہش جو بھوک سے بھی زیادہ بے تاب کر دینے والی ہے ـــــ جس میں شراب سے بھی زیادہ نشہ ہے۔ جو شراب سے بڑھ کر انسان کے بدن میں آگ پھونک دیتی ہے اور خصوصاً اس آدمی کی خواہش جو دو ماہ سے صبر کیے ہوئے ہو۔ جو دو ماہ سے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کیے ہو، جو شراب پیے ہوئے ہو، جو جوان اور تندرست ہو جس کی رگ رگ میں فطری خواہشات پوری کرنے کے لیے آگ سُلگ چکی ہو۔

لڑکی اسے گھورنے لگی۔ وہ اس سے خوف زدہ ہو رہی تھی، اس کی سُرخ سرخ آنکھیں، تمتمایا چہرہ، کھُلا ہوا منہ اور دراز بازو، ان سب سے وہ ڈر رہی تھی لیکن رینڈل نے ایک لفظ کہے بغیر اس کے شانے پکڑ کر اسے سڑک پر پچھاڑ دیا۔

اس کے دونوں گھڑے دور دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ ان میں بھرا ہوا تمام دودھ زمین پر بہنے لگا۔ وہ چلا چلا کر شور مچانے لگی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ اس سنسان اور اجاڑ جگہ کون اس کی امداد کرے گا، وہ خاموش ہو گئی اور پھر معمولی سا غصہ اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد جب اس نے دیکھا کہ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور وہ مضبوط اور خوبصورت بھی ہے تو وہ مغلوب ہو گئی اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ اٹھی تو اسے اپنے گھڑے اور دودھ کا خیال آیا۔ وہ غصّے سے کانپنے لگی۔ اب اس کی باری تھی۔ اس نے اپنے پاؤں سے لکڑی کی بنی ہوئی کھڑاؤں اتاری اور مطالبہ کیا کہ وہ دودھ کی قیمت ادا کرے ورنہ وہ اس کا سر توڑ دے گی۔

وہ لڑکی کے اس حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ گھبرا گیا اور اُس کی آنکھیں کھُل گئیں، اپنے کیے پر وہ سخت خوف زدہ ہو رہا تھا اس نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن لڑکی نے اس پر پتھروں کی بارش شروع کر دی، کچھ پتھر اس کی پیٹھ پر بھی لگے۔

وہ بہت دیر تک دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گیا، اُس کے پیروں میں سخت درد ہونے لگا۔ اس کے خیالات منتشر ہو چکے تھے اور اس کا دماغ پریشان ہو رہا تھا۔ اسے کسی چیز کا خیال نہیں رہا اور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور فوراً ہی اسے نیند آ گئی لیکن جلد ہی اسے کسی کے کھردرے اور مضبوط ہاتھوں نے جگا دیا۔ اس نے اپنے اوپر دو چمکدار چمڑے کی بنی ہوئی ٹوپیاں جھکی ہوئی دیکھیں وہی دونوں سپاہی جو ایک مرتبہ اسے گرفتار کر چکے تھے اب پھر اس کی مشکیں کس رہے تھے۔

افسر نے خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے رینڈل سے کہا "میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ اور مجھے پھر سے تمھیں گرفتار کرنا پڑے گا۔" رینڈل نے کوئی جواب نہیں دیا اور چُپ چاپ کھڑا ہو گیا اب اگر رینڈل ذرا بھی کوئی حرکت کرے تو وہ اسے مارنے پیٹنے کو تیار تھے ـــــ وہ ان کا شکار تھا۔ جیل کی چڑیا تھی۔ پھر مجرموں کے شکاری بھلا کیسے نکل جانے دیتے۔

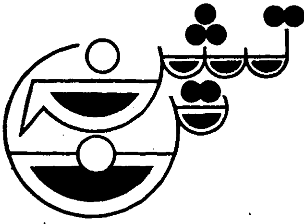
"اچھا چلو" افسر نے حاکمانہ انداز سے کہا اور تینوں روانہ ہو گئے۔

شام ہو چکی تھی اور موسم خزاں کی شفق ماند ہوتی جا رہی تھی۔ اِدھر اُدھر تاریکی کے سیاہ دھبے زمین پر دکھائی دینے لگے تھے۔ آدھ گھنٹے میں وہ گاؤں پہنچ گئے۔ سارے گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ دیہاتی مرد اور عورتیں، لڑکیاں اور لڑکے اس طرح جوش میں تھے جیسے ہر مکان میں چوری ہوئی ہے اور ہر لڑکی کا دامن عصمت تار تار کر دیا گیا ہے۔ وہ گالیوں سے اس کی تکا بوٹی کر دینا چاہتے تھے۔ پہلے ہی دروازے سے اس پر طعنہ زنی شروع ہو گئی اور حاکم ضلع کے مکان تک یہی حال رہا۔ حاکم ضلع اپنے مکان میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ خود اس کے دل میں بھی غصّے اور انتقام کی آرزو شدّت سے پیدا ہو چکی تھی۔ جیسے ہی اُس نے آوارہ گرد کو دیکھا وہ چلّا اٹھا۔

"اچھا! تم آ گئے بدمعاش! اب تمھیں سزا ملے گی ـــ" یہ کہہ کر اس نے خوشی اور مسرت سے ہاتھ ملے اور پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھا تھا کہ تم باز نہیں آؤ گے، میں نے تو سڑک پر دیکھ کر تمھیں پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔" اور پھر اطمینان و سکون کا سانس لے کر کہنے لگا۔

"اچھا بدمعاش! کمینے! حرام خور! ـــ میں تمھیں بیس سال کی سزا دیتا ہوں۔"

خوش ذوق قارئین کے لیے



سی، بی گلفورڈ ★ وسیلہ خاتون

کیتھرائن نے شام کا اخبار کھولا۔ پہلے ہی صفحے پر جلی حروف میں قتل کی یہ ہولناک خبر چھپی ہوئی تھی "آوارہ گرد کے ہاتھوں ایک عورت کا قتل"۔ یہ سرخی پڑھتے ہی اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے بڑی میز کا کونا پکڑ کر بمشکل خود کو سنبھالا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی آندھی چل رہی تھی۔ ایک سوال بار بار اسے جھنجوڑ رہا تھا "کیا یہ اسی رات جیسا کوئی واقعہ ہے جس کا مجھے ذاتی تجربہ ہو چکا ہے؟ اسی جیسا یا اس سے کوئی ملتا جلتا واقعہ؟ ــــ فرق صرف اتنا ہے...؟"

پھر کسی احساس نے اسے شرمندہ کر دیا۔ "نہیں۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ میں نے تو اس رات کی یادیں اپنے حافظے سے کھرچ ڈالی تھیں۔" اور پھر ایک نئے سوال نے سر اٹھایا۔ "لیکن کیا واقعی میں وہ رات بھولنے میں کامیاب ہو گئی ہوں؟ یا وہ یاد دوسری یادوں کے انبار میں اب بھی دبی ہوئی ہے؟"

اسے وہ رات آج بھی اسی طرح یاد تھی جیسے تین مہینے قبل پیش آنے والا واقعہ کل ہی پیش آیا ہو۔ کیتھرائن کے جسم میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا تنفس تیز ہو گیا خوف، دہشت اور سنسنی کے یہ چند لمحات تیزی سے گزر گئے۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی نظریں ایک بار پھر اخبار کی چار کالمی سرخی پر جم گئیں۔ اس نے ہمت کر کے اخبار اٹھایا اور وہ خبر پڑھنے لگی۔ خبر کی سرخی تھی "آوارہ گرد کے ہاتھوں ایک عورت کا قتل۔" مقتولہ کا نام روتھ فیلٹون تھا۔ عمر چھیالیس سال، بیوہ۔ وہ ایک عمارت کی دوسری منزل میں تنہا رہتی تھی۔ دروازے میں خودکار قفل کے علاوہ اندر کی جانب زنجیر بھی لگی ہوئی تھی اس لیے پولیس کو اس کے فلیٹ میں گھسنے کے لیے دروازہ توڑنا پڑا تھا لیکن قاتل نے اندر داخل ہونے کے لیے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ قاتل کھڑکی میں لگا ہوا شیشہ کاٹ کر کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا تھا اور اس کھڑکی تک پہنچنے کے لیے اس نے ایک سیڑھی استعمال کی تھی جو اسے گلی ہی میں مل گئی تھی۔ گلی میں آگے ایک عمارت پر رنگ روغن کیا جا رہا تھا اور کاریگر شام کو کام ختم کر کے سیڑھی وہیں چھوڑ گئے تھے۔ اتفاق کی بات کہ ایک پڑوسی نے قاتل کو اس سیڑھی کے ذریعے واپس جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چلایا بھی تھا لیکن قاتل اس کی چیخ سن کر فرار ہو گیا تھا۔

فلیٹ کے اندر عجیب افراتفری کا منظر تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کوئی چھوٹی موٹی جنگ لڑی گئی ہو۔ پہلی منزل والوں نے شور کی آوازیں بھی سنی تھیں لیکن انھیں غلط فہمی ہوئی کہ روتھ فیلٹون شاید اپنے فرنیچر کی ترتیب بدل رہی ہے اس لیے انھوں نے اس توڑ پھوڑ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی ___ ایک پڑوسی نے مقتولہ کی گھٹی گھٹی سی چیخ بھی سنی تھی لیکن وہ یہ سمجھا کہ ضرور کوئی چیز ادھر ادھر رکھنے کے دوران میں روتھ کے پاؤں پر گر گئی ہے اور تکلیف کی بنا پر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ہو گی۔ کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ بے چاری اپنی زندگی کی جدوجہد اور بچاؤ میں مصروف تھی اور پھر وہ بچاؤ کی جنگ ہار گئی اس کی لاش بے ڈھنگے انداز میں فرش پر پڑی تھی۔ لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اسے ایک نائیلون کے موزے کی مدد سے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا ___ پولیس کو قاتل کی انگلیوں کے نشانات کہیں سے بھی نہیں مل سکے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاتل نے اندر داخل ہونے کے لیے آخر روتھ فیلٹون کی کھڑکی ہی کو کیوں پسند کیا؟ اس کا صحیح جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ مقتولہ کے فلیٹ میں روشنی ہو رہی تھی جس سے قاتل کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس کا شکار گھر میں موجود ہے لیکن اس بات کا علم کہ مقتولہ اپنے فلیٹ میں تنہا رہتی ہے اسے اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک قاتل نے مقتولہ کی نگرانی نہ کی ہو یا اس کے بارے میں معلومات حاصل نہ کی ہوں۔ مقتولہ ایک سپاٹ اور غیر دلکش گھریلو عورت تھی۔ آخر ایسی سپاٹ اور غیر دلکش عورت میں کون دلچسپی لے سکتا ہے؟ ایسا شخص جس میں اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لیے ایک شدید اور جنونی جذبہ موجود ہو کہ مخالفت پر اپنے شکار کو بے دریغ قتل بھی کر دے وہ ایک جنسی دیوانہ ہی ہو سکتا ہے۔

کیتھرائن نے اخبار میز پر پھینک دیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ اپنے نام کے برعکس وہ خود بھی بے حد معمولی اور بے کشش عورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بتیس سال سے تجاوز ہونے کے باوجود اب تک غیر شادی شدہ تھی۔ گو وہ بدصورت نہیں تھی لیکن اس کے چہرے میں مردوں کے لیے کوئی کشش بھی نہیں تھی اس کے لیے اس سے بڑی محرومی کیا ہو سکتی تھی کہ آج تک کسی مرد نے اس کے بدن کے کسی حصے پر ایک مرتبہ نظر ڈالنے کے بعد دوسری مرتبہ نظر نہیں ڈالی تھی اس لیے اسے تین ماہ قبل کی وہ رات آج بھی اچھی طرح یاد تھی جب ایک مرد نے اس کی ذات میں بھرپور دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اخبار میں قتل کی تفصیلات پڑھنے کے بعد وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا اس میں دلچسپی لینے والا مرد بھی کوئی ___؟ وہ کانپ گئی۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور پھر فوراً تین ماہ پہلے کی واردات اس کی نظروں میں گھوم گئی۔

یہ جمعرات کی شب تھی۔ دس بجے کے قریب وہ اپنی خواب گاہ میں بستر پر جلد سو جانے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ ان دنوں دفتر

میں کام کی زیادتی کی وجہ سے صبح اُسے آدھ گھنٹے پہلے ہی دفتر پہنچنا تھا۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور ہوا میں بڑی خوش گوار خنکی تھی۔ اس نے تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں اور آہنی سلاخوں سے پاک کھڑکیوں پر صرف پردے پڑے ہوئے تھے پھر وہ ایک دم بستر سے اٹھی اور ننگے پیر ہی باورچی خانے تک چلی گئی۔ وہاں ابھی تک بلب روشن تھا پہلے اس نے باورچی خانے کی روشنی گل کی، پھر ڈرائنگ روم کی، اس کا مختصر سا فلیٹ تاریکی میں ڈوب گیا اس کی خواب گاہ کا ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کی دھیمی دھیمی خواب ناک روشنی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ واپس اپنی خواب گاہ میں آئی تو اس مرد کو نہ دیکھ سکی جو ایک پردے کے پیچھے کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اور پھر وہ جیسے ہی اطمینان سے اپنے بستر پر بیٹھی وہ اچانک اس کے سامنے آگیا۔ بالکل اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

ایک مرد کو اس طرح غیر متوقع طور پر اپنی خواب گاہ میں اپنے سامنے دیکھ کر اس کے منہ سے کوئی چیخ بھی نہیں نکلی۔ لیکن کیوں؟ اس کے منہ سے کسی قسم کی آواز تو نکلنی چاہیے تھی لیکن شاید اسے اچانک اپنے سامنے ایک دم دیکھ کر وہ اتنی حیرت زدہ ہو گئی تھی کہ اس کے حواس ہی جاتے رہے۔ وہ مرد درمیانے قد کا تھا۔ خود اس سے تقریباً دو انچ لمبا۔ اس کے شانے بھی چوڑے نہیں تھے، اس کے باوجود پہلی ہی نظر میں اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بے حد طاقت ور مرد ہے۔ قوت اور توانائی کی لہریں اس مرد کے جسم سے نکل کر کیتھرائن کے بدن میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک خاص چیز اور بھی تھی۔ بہت ہی خاص جسے وہ آج تین ماہ بعد بے حد غور و فکر کے بعد بھی صحیح طریقے پر بیان نہیں کر سکتی تھی۔ وہ خاص بات تھی۔ ایک قسم کی مردانگی۔

اسے مردانگی تو کہا جا سکتا تھا لیکن مردانہ وجاہت نہیں۔ مردانہ وجاہت تو ایک ایسی چیز تھی جس کا وہ سالہا سال سے بس دور ہی سے مشاہدہ کرتی آئی تھی اور جسے قریب سے دیکھنے کا اسے کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی مردانگی کو جنسِ عریاں، برقی کشش اور وحشیانہ خودسری کا مجموعہ کہا جا سکتا تھا۔

اسے دیکھ کر وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ مرد کا چہرہ تاریکی میں تھا لیکن اسے اس کی نیلی نیلی آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں جو تاریکی میں دھیمی دھیمی یوں چل رہی تھیں جیسے تاریک رات میں جگنو اڑتے پھرتے ہیں۔ اسے پورا یقین تھا کہ اجنبی کی آنکھیں نیلی ہیں اور وہ نیلی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" لیکن کیتھرائن نے یہ سوال اجنبی سے نہیں کیا تھا صرف دل میں سوچا تھا لیکن وہ اس سے یہ سوال کرنا ضرور چاہتی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ وہ کون ہے؟ وہ چور تو نہیں تھا چور کبھی روشن کمروں میں چوری کی نیت سے داخل نہیں ہوتے اس لیے وہ چور تو نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر وہ کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟"

"شور مت مچانا۔" اجنبی نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی آواز بہت دھیمی، بہت ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ پُرسکون تھا پھر بھی صورتِ حال کی نزاکت پوری طرح عیاں تھی۔ "کوئی آواز مت نکالنا ورنہ خود نقصان اٹھاؤ گی۔"

اس تنبیہ پر اس نے سوچا کہ اگر میں خاموش رہی تو کیا وہ مجھ سے نرمی سے پیش آئے گا؟ نرمی ــــ لیکن کس معاملے میں؟ گلا گھونٹنے میں؟ لیکن وہ میرا گلا کیوں گھونٹے گا؟ وہ خاموش رہی۔ لیکن کیا اجنبی کے حکم کی تعمیل میں؟ اس بات کا وہ آج تک فیصلہ نہیں کر سکی تھی ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بہت زیادہ سہمی ہوئی ہو اور اس کا چیخ مارنا بہت زیادہ خوف زدہ ہونے کی علامت ہو۔ یا شاید وہ چیخ ہی نہ سکتی ہو۔

اس مرد نے اس کی طرف اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا دیا کیتھرائن محویت اور اپنے خیالات میں گم ہونے کی وجہ سے اس کے ہاتھ کو حرکت کرتا ہوا نہ دیکھ سکی لیکن اس نے اس کے ہاتھ کی حرکت محسوس ضرور کر لی۔ اس مرد نے اپنی انگلیوں سے اس کے رخسار چھوئے اور وہ انگلیاں پھسلتی ہوئی اس کے کان کی لو تک پہنچ گئیں، پھر وہ نیچے کی طرف پھسل کر گردن تک آگئیں اور شانے تک پہنچ کر رک گئیں۔ اس کی انگلیاں اس کے حلق کی شہ رگ پر آکر رک گئی تھیں۔ صرف چند لمحوں کے لیے، پھر وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئیں۔ وہ انگلیاں بے تابی سے اس کے چکنے بدن پر پھسل رہی تھیں، مچل رہی تھیں، جیسے وہ کسی شے کی تلاش میں ہر طرف بھٹک رہی ہوں۔ مضبوط ہاتھ۔ جن کی انگلیوں سے قوت اور توانائی کی برقی لہریں نکل نکل کر اس کی کھال کے اندر پیوست ہو کر اس کے گوشت کے ریشے ریشے میں گھسی جا رہی تھیں۔ اس کا پورا بدن نامعلوم موسیقی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا لیکن وہ لہریں نشاط انگیز نہیں تھیں ــــ

"خاموش۔" اجنبی کے ہونٹ ہلے اور ہلکی سی سرگوشی ہوئی۔

کیتھرائن نے سر ہلا کر اپنی آمادگی کا اظہار کیا اس کے سامنے اس کے



علاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اجنبی اتنا طاقت ور ہے کہ چاہے تو اپنے ایک ہی ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹ سکتا ہے اس ہاتھ سے جواب بھی اس کے حلق پر موجود تھا۔ آخر وہ کس بات کا انتظار کر رہا ہے؟ اجنبی ذرا سا آگے بڑھا اور اس کا سیدھا ہاتھ اس کی پشت کی طرف پھسلا۔ اب ان ہاتھوں نے اپنی تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا تھا۔

پھر اچانک دروازے پر کسی نے دستک دی ——— وہ دستک بڑی شدت کی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے دستک دینے والا دروازہ توڑ دینے کے موڈ میں ہو۔

"کون ہے؟" اجنبی نے سرگوشی میں پوچھا۔ اس کا وہ ایک ہاتھ جو کیتھرائن کے حلق پر تھا، دستک کی آواز سن کر کانپنے لگا۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا کیوں کہ وہ واقعی نہیں جانتی تھی کہ دروازے پر کون ہے۔ پھر دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اجنبی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ پلٹا اور پھرتی سے بلی کی طرح دبے پاؤں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں بعد وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر نظر آیا اور اچانک اسے رات کی تاریکی نگل گئی۔ پھر وہ جلدی سے کھڑکی کی طرف بڑھی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ اس وقت اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ کس راستے سے اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تھا اور کس راستے سے واپس گیا۔ نیلی آنکھوں والا مرد تیزی سے درخت کے تنے کے سہارے نیچے اتر رہا تھا۔ نیچے اتر کر پھر وہ بھاگتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ وہ بہت بڑا درخت تھا جس کی ایک مضبوط شاخ خواب گاہ کی کھڑکی تک پہنچی تھی۔ وہ اسی شاخ کے ذریعے خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر اسے ہوش آ گیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ باہر عمارت کا منیجر شب خوابی کے لباس میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اسے دیکھ کر منیجر نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ "مس کیتھرائن! آپ ٹھیک تو ہیں؟" منیجر نے کہا۔ "میری بیوی نے تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی کو درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ درخت کی ایک شاخ آپ کے کمرے سے بہت نزدیک ہے اس لیے میں نے سوچا کہ ——— سب ٹھیک۔ خیریت تو ہے؟"

اس نے کوئی جواب دینے سے پہلے چند لمحے سوچا۔ پھر بولی۔ "شکریہ جناب، زحمت کا بہت بہت شکریہ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں" منیجر نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا پھر کندھے اچکاتا ہوا واپس چلا گیا۔

وہ منیجر سے جھوٹ بولی تھی اور اس نے اس واقعے کی پولیس کو بھی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس رات وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکی تھی، وہ تمام رات بستر پر بیٹھی جاگتی اور کانپتی رہی تھی اور اپنے حیرت انگیز ردِعمل پر غور کرتی رہی تھی۔ وہ اس اجنبی کو دیکھ کر آخر چیخی کیوں نہیں تھی؟ اس نے عمارت کے منیجر کو صحیح کیفیت سے مطلع کیوں نہیں کیا تھا؟ اس نے اس واقعے کی پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی تھی؟

اس کی خواب گاہ میں ایک اجنبی کھڑکی کے راستے گھس آیا تھا۔ اس نے اجنبی کو اور اجنبی نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا اور اس حالت میں کہ وہ شب خوابی کا ایک بے حد مختصر لباس پہنے ہوئے تھی پھر اجنبی نے اس کی گردن، حلق بازو اور پشت پر ہاتھ پھیرا تھا اور وہ یہ بات کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ اجنبی نے اسے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچایا تھا۔ کوئی اذیت بھی نہیں دی تھی۔ ہاں اس نے دھمکی ضرور دی تھی۔ اور جب غیر متوقع طور پر دستک ہوئی تو بھی اس کا رویہ شریفانہ رہا تھا اور جب اسے اجنبی کی ذات سے کوئی ضرر نہیں پہنچا تھا تو پولیس کو اطلاع دینے سے کیا فائدہ تھا؟ پھر اسے

پولیس کے اوندھے سیدھے سوالات کے جواب دینے پڑیں گے اس کے بعد اس کے پڑوسی سوالات کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ جب وہ ان کے سامنے سے گزرے گی تو وہ اسے دیکھ کر خاموش ہو جائیں گے اور پھر اس کی عدم موجودگی میں وہ آپس میں سرگوشیاں کریں گے۔ ان حالات میں اس نے خاموش رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ اگر وہ اس واقعے کی پولیس کو اطلاع دے بھی دے جیسا کہ اس کا فرض ہے تو ممکن ہے پولیس اس اجنبی کو گرفتار کر لے لیکن پولیس اس پر کیا الزام لگائے گی؟ یہ کہ وہ چوری کی نیت سے اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔ لیکن اس نے کوئی چیز نہیں چرائی تھی اور اسے کسی قسم کا ضرر بھی نہیں پہنچایا تھا۔ پھر عدالت میں اس شخص پر مقدمہ چلے گا۔ اسے بھری عدالت میں گواہی دینی پڑے گی۔ تمام لوگوں کے سامنے اسے تفصیل سے بتانا پڑے گا کہ اجنبی نے اس کے فلیٹ میں داخل ہو کر اس کے ساتھ کیا کیا حرکتیں کیں۔ نہیں نہیں وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکے گی۔

کیتھران نے ایک جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں۔ یہ واقعہ تین مہینے پہلے پیش آیا تھا لیکن اب حالات مختلف تھے۔ اسے پورا یقین تھا کہ اخبار میں جس آوارہ گرد کا حال چھپا ہے یہ وہی اجنبی ہے لیکن اب وہ محض چور نہیں رہا ہے قاتل بن چکا ہے۔ اب اس کا یہ فرض ہے کہ وہ پولیس کو اس واقعے سے مطلع کر دے اور اسے اجنبی کا مکمل حلیہ بتا دے۔ پولیس اس کے سامنے مشتبہ مجرموں کی تصویریں رکھے گی اور وہ اس کی تصویر دیکھتے ہی پہچان جائے گی۔ اس کی یادداشت بہت تیز ہے۔ اگر پولیس کی فائل میں اس کی تصویر نہ بھی ہوئی تو بھی وہ اپنی یادداشت کی مدد سے اس کا اسکیچ بنا دے گی تاکہ پولیس قاتل کو بآسانی پکڑ سکے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ سو گئی۔ رات بھر اسے اچھی طرح نیند بھی نہیں آسکی اس لیے وہ صبح معمول کے خلاف زیادہ دیر تک سوتی رہی۔ جب وہ صبح بیدار ہوئی تو پولیس اسٹیشن جانے کا خیال بھوت کی طرح اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ وہ نروس ہو گئی۔ اسے کبھی پولیس کے سامنے جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جب وہ پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوئی تو اس کی

ہمت جواب دے گئی۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح وسیع صحن عبور کر کے ایک بڑے ہال میں داخل ہوئی جہاں ایک میز کے پیچھے ایک باوردی نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ "یس مادام؟" نوجوان پولیس افسر نے اسے اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر کہا۔



نوجوان کی تیز، متجسس اور سوالیہ نظریں دیکھ کر اس کے حواس معطل ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ پہلی بار اسے اس بات کا احساس اور افسوس ہوا کہ اس نے یہاں آنے سے پہلے پولیس کو بیان دینے کی ریہرسل کیوں نہیں کر لی تھی۔

"فرمایئے مادام میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" نوجوان افسر نے اکتاہٹ سے کہا۔

کیتھران نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "میرے پاس کچھ اہم معلومات ہیں۔" کیتھران نے ذہن میں اپنا بیان مرتب کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے معلوم ہے کہ روتھ فیلٹون کا قاتل کون ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ تین مہینے پہلے ایک اجنبی میری خواب گاہ میں گھس آیا تھا۔" اس کے آگے اس کا ذہن جواب دے گیا۔ آخر وہ کس طرح اس نوجوان لڑکے کو وہ سب کچھ بتا دے جو اس پر بیت چکی تھی۔

"خاتون میں جانتا ہوں کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے؟" نوجوان افسر نے کہا۔ "آج صبح سے چودہ عورتیں روتھ فیلٹون کے قتل کے سلسلے میں آچکی ہیں۔ ان میں سے کسی نے کچھ دیکھا تھا، کسی نے کچھ سنا تھا۔ کوئی پولیس سے اپنی حفاظت کا مطالبہ کرنے آئی تھی۔ اب آپ بتایئے کہ آپ کا تعلق ان میں کس گروہ سے ہے؟"

وہ کوئی جواب دیے بغیر فوراً باہر نکل آئی تھی۔ وہ ڈرتی ہوئی پولیس ہیڈ کوارٹر سے باہر نکلی تھی۔ اس نے سوچا بھلا اس پولیس افسر کے سامنے کچھ کہنے سے کیا فائدہ؟ جو ایک لفظ سنے بغیر ہی اسے دوسری عورتوں کی طرح جھوٹا تصور کر رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک بازاروں میں

گھومتی رہی۔ پھر اس نے ایک پبلک بوتھ سے اپنے دفتر ٹیلیفون کیا اور طبیعت کی ناسازی کا بہانا کر کے ایک روز کی چھٹی لے لی۔ سارا دن اس نے فلمیں وغیرہ دیکھ کر گزارا اور پھر مقررہ وقت پر گھر پہنچ گئی۔ اس نے شام کے اخبارات دیکھے۔ روتھ فیلٹون کے قتل کے بارے میں تازہ ترین انکشافات شائع ہوئے تھے۔

پولیس کا خیال تھا کہ قاتل مقتولہ کے فلیٹ میں چوری کی نیت سے داخل نہیں ہوا تھا کیوں کہ پورے فلیٹ کا سامان تو ضرور درہم برہم تھا لیکن قاتل نے کسی قیمتی شے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ مقتولہ کی قریبی سہیلیوں کے بیانات سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ مقتولہ کے فلیٹ سے کوئی چیز نہیں چرائی گئی تھی۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا وہ یہ کہ قاتل کوئی مادی شے چرانے کی نیت سے مکان میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی مطلوبہ شے کوئی مادی چیز تھی۔ یعنی مقتولہ کے بدن کی خوشبو چرانا، عیش و نشاط کی چند گھڑیاں حاصل کرنا۔ مقتولہ نے اپنی حفاظت کے لیے جان توڑ جدوجہد کی تھی۔ اس جدوجہد میں ایک طرف تو قاتل اپنے ارادوں میں ناکام رہا تھا، دوسری طرف روتھ فیلٹون اپنی زندگی ہار گئی تھی۔

کیتھرائن غیر یقینی انداز میں خبر کے الفاظ دیکھنے لگی۔ جدوجہد ہاں نرم اور کیف آور مردانہ انگلیوں کے خلاف جدوجہد؟ جن کے لمس کا لطیف تجربہ اسے تین ماہ قبل ہوا تھا، جن سے لطف کی برقی لہریں پھوٹتی تھیں پھر اچانک اسے وہ لمحات یاد آگئے۔ وہ انگلیاں سخت کھردری لیکن نرم۔

پولیس کو مقتولہ کی انگلیوں سے ایک چیز دستیاب ہوئی تھی۔

ایک نیلے رنگ کا دھاگا جو مقتولہ کے ناخن میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ پولیس کو یقین تھا کہ نیلے رنگ کا یہ دھاگا قاتل کی قمیص سے تعلق رکھتا ہے۔

کیتھرائن کو اچانک یاد آیا کہ اس رات بھی اجنبی نے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی، جس کا رنگ اس کی آنکھوں سے مشابہ تھا۔ اس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ بے شک روتھ فیلٹون کا قاتل وہی اجنبی ہے۔

چھ ہفتوں بعد اخبارات میں پھر ایک قتل کی خبر جلی سرخیوں میں شائع ہوئی۔ مقتولہ کا نام انگرڈ تھا۔ عمر چالیس سال۔ وہ ریڈی میڈ کپڑے بنانے کی ایک فیکٹری میں ملازم تھی اور ایک عمارت کی پہلی منزل کے فلیٹ میں تنہا رہتی تھی۔ قاتل کے لیے اس فلیٹ میں داخل ہونا بہت آسان ثابت ہوا۔ اس نے ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا اور ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھول لی اور پھر کھڑکی کے راستے فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ اس مقتولہ نے بھی اپنی آبرو بچانے کے لیے بے حد جدوجہد کی تھی اور وہ ایک مرتبہ بہت زور سے چیخی بھی تھی لیکن اس کی چیخ پر پڑوسیوں کے آنے سے پہلے ہی قاتل انگرڈ کا گلا گھونٹ کر فرار ہو گیا۔

پولیس نے مقتولہ کی لاش دیکھ کر اندازہ لگایا کہ مقتولہ کا گلا ایک ہاتھ سے گھونٹا گیا تھا۔ سیدھے ہاتھ سے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل میں بلا کی قوت ہے۔ چند پڑوسی مقتولہ کی آخری چیخ سن کر بہت عجلت میں اس کے فلیٹ میں داخل ہوئے تھے پھر بھی وہ فرار ہوتے ہوئے قاتل کی صرف ایک جھلک دیکھ سکے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق قاتل درمیانے قد اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ پولیس کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ روتھ فیلٹون اور انگرڈ کا قاتل ایک ہی شخص ہے۔ دونوں مرتبہ قاتل کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوا تھا اور اس نے اپنے پیچھے کہیں بھی انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑے تھے اور اس کی نیت بھی چوری کی نہیں تھی۔ وہ ضرور کوئی جنسی دیوانہ تھا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ کیتھرائن تمام دن بستر پر لیٹی قاتل کے بارے میں سوچتی رہی۔ اخبارات، پولیس اور ریڈیو نے قاتل کو جنسی دیوانہ قرار دے دیا تھا۔ وہ ریڈیو سے تازہ ترین اطلاعات سنتی رہی۔ اخباروں میں قتل کی تفصیلات پڑھتی رہی۔ ان دو وارداتوں کے درمیان صرف چھ ہفتوں کا وقفہ تھا اور بظاہر دونوں ایک ہی قاتل کی وارداتیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک جنسی دیوانے کی وارداتیں جو راتوں کی خاموشی میں ایسی عورتوں پر حملہ کرتا ہے جو اپنے مکانوں میں تنہا رہتی ہیں۔ پولیس کو تحقیقات میں بڑی دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ انھیں درجنوں ٹیلیفون اور خطوط موصول ہوئے تھے، درجنوں خوف زدہ عورتوں نے پولیس سے حفاظت کی درخواست کی تھی۔ ہر طرف سے قاتل کے بارے میں معلومات موصول ہو رہی تھیں لیکن یہ ساری تفصیلات اور یہ ساری معلومات تنہا رہنے والی عورتوں کی اختراع تھیں۔ انھیں جب اور جہاں بھی کوئی مرد نیلی قمیص میں نظر آتا، وہ فوراً پولیس سے رجوع کرتیں۔

اس وقت پولیس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ قاتل کے حلیے کا تھا۔ اسے کوئی بھی شخص قاتل کے اصل حلیے سے اب تک آگاہ نہیں کر سکا

تھا۔ پولیس نے بہت سے مشتبہ لوگوں کو پکڑ کر ان سے طرح طرح کے سوالات کیے، ان پر ہر حربہ آزمایا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

کیتھرائن اپنی خواب گاہ میں لیٹی چھت کی طرف تکے جا رہی تھی۔

اس کا ذہن بے ترتیب خیالوں میں بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ روتھ فیلٹون نے باقاعدہ مزاحمت اور جدوجہد کی تھی اور انگرڈ نے چیخ ماری تھی لیکن دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ایک ہی نکلا تھا یعنی دونوں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ قاتل نے ان دونوں عورتوں کو شور مچانے، چیخنے اور آواز نکالنے کے خلاف تنبیہ ضرور کی ہوگی اور انھیں دھمکی دی ہوگی کہ اگر انھوں نے آواز نکالی تو نتائج خطرناک ہوں گے اس کے باوجود ایک عورت نے مزاحمت اور جدوجہد کی اور دوسری نے چیخ ماری اور اب دنیا والے اس اجنبی کو دیوانہ کہہ رہے ہیں لیکن حقیقتاً وہ دیوانہ نہیں ہے، اذیت پسند بھی نہیں ہے۔ فطری طور پر قاتل بھی معلوم نہیں ہوتا۔ یہ انتہائی قدم اس نے مجبوری کے عالم میں اٹھایا ہوگا۔ کیتھرائن کو اپنے ان احساسات اور خیالات پر یقین کی حد تک اعتماد تھا لیکن وہ دنیا کو اس حقیقت سے کس طرح آگاہ کر سکتی تھی؟

تیسرا قتل ہونے کے بعد کیتھرائن نے قاتل کی گرفتاری کے لیے عملی قدم اٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا۔ اس مرتبہ جب وہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوئی تو اس کی چال میں خود اعتمادی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگوں میں کوئی کمزوری محسوس نہیں کی۔ اسے نوجوان افسر سے گفتگو کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ خود کو اس تجربے کے لیے اچھی طرح تیار کر کے آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ تجربہ اس کے لیے ناخوشگوار ضرور ہوگا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

تیسرے قتل نے پولیس ہیڈکوارٹر میں ہلچل مچا رکھی تھی کیتھرائن نے بڑی مشکل سے سارجنٹ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ابھی اس نے اپنی کہانی کا بس ذرا سا حصہ سنایا تھا کہ سارجنٹ پھرتی سے اٹھا اور چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو پولیس کے دو اعلا افسر اس کے ساتھ تھے۔

کیتھرائن نے انھیں اس رات کے بارے میں تفصیل سے ایک ایک بات بتا دی۔ ذرا بھی نہیں جھجکی اور کہیں بھی نہیں اٹکی۔ اس نے بتایا کہ اجنبی کس طرح اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے اس کے ساتھ کیا کیا کیا، پھر دروازے پر کسی نے دستک دی اور دیکھتے ہی دیکھتے اجنبی کس طرح فرار ہو گیا۔

ان دو اعلا افسران میں سے ایک افسر ذرا غصیلا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا: "تم نے پولیس کو فوراً اطلاع کیوں نہیں دی؟ تین عورتیں قتل کی جا چکی ہیں!"

لیکن دوسرا افسر بہت نرم دل تھا۔ وہ کیتھرائن کی حالت سمجھ رہا تھا اور اسے اس سے ہمدردی بھی تھی۔ "گرم ہونے کی ضرورت نہیں ہے جیک!" اس نے اپنے ساتھی سے کہا: "اس وقت ہمیں مس کیتھرائن کے تعاون کی ضرورت ہے۔" پھر مس کیتھرائن سے مخاطب ہوا: "اچھا مس کیتھرائن ہمیں اس وقت قاتل کے حلیے کی شدید ضرورت ہے۔ کیا آپ ہمیں اس کا بالکل صحیح حُلیہ بتا سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" کیتھرائن نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔ پھر اس نے نہایت تفصیل اور جُزرسی سے قاتل کا حلیہ بیان کر دیا۔ خاص طور پر اس کی نیلی نیلی چمک دار آنکھیں، اس کا لباس، اس کا قد، اس کی جسامت، اس نے ایک ایک بات بتا دی۔ وہ کئی گھنٹے پولیس کی فائل میں لگی ہوئی تصویریں دیکھتی رہی۔ ان میں سے کوئی تصویر بھی اس اجنبی کی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قاتل کوئی پرانا عادی مجرم نہیں ہے۔

"لیکن مس کیتھرائن اگر وہ آپ کے سامنے آجائے تو کیا آپ اسے شناخت کر لیں گی؟" نرم دل افسر نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں۔ کیا میں اسے بھول سکتی ہوں؟"

کچھ دیر دونوں پولیس افسروں میں صلاح مشورے ہوتے رہے پھر انھوں نے کیتھرائن کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ "مس کیتھرائن! آپ نے ہمیں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ ہمارے لیے بے حد قیمتی ہیں لیکن ان سے ہم صرف ایک صورت میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ یوں کہ پہلے ہم عوام کو قاتل کے مکمل حلیے سے آگاہ کر کے ان سے تعاون کی درخواست کریں، ہم کسی کو آپ کے نام اور پتے سے آگاہ نہیں کریں گے لیکن قاتل فوراً اندازہ لگا لے گا کہ پولیس کو یہ معلومات کس نے فراہم کی ہیں۔ اسے اس بات کا بھی احساس ہو جائے گا کہ اگر ہم نے اسے پکڑ لیا تو صرف آپ ہی اسے شناخت کر سکتی ہیں۔ آپ کے سوا کوئی بھی اسے شناخت نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ آپ کی اور صرف آپ کی شہادت اسے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتی ہے اور یہ صورتِ حال آپ کے لیے بے حد خطرناک اور تشویشناک بھی ثابت

ہوسکتی ہے۔"

"جناب! اس کا مجھے اچھی طرح احساس ہے" کیتھرائن نے جواب دیا۔ "لیکن اس قاتل کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔ میں پولیس کے جس طرح بھی کام آسکتی ہوں، تیار ہوں۔"

"ہم آپ کے تعاون کے لیے بے حد ممنون ہیں مس کیتھرائن! اور آپ کی حفاظت کرنا بھی ہماری ذمے داری میں شامل ہے۔ آپ ہماری واحد گواہ ہیں اس لیے آپ کو کچھ عرصے کے لیے ہماری حفاظت میں یہیں قیام کرنا پڑے گا۔"

کیتھرائن نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔ اخبارات اور عوام نے پولیس کے ساتھ تعاون کیا۔ مجرم کے حلیے کی خوب خوب تشہیر کی گئی۔ پولیس نے کئی آدمیوں کو گرفتار بھی کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی وہ اجنبی نہ نکلا۔ اسے پہلے ہی شبہ تھا کہ وہ بے حد چالاک شخص ہے۔ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگے گا۔

ایک ہفتے بعد اسے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن اس کے مکان پر تین سادہ لباس والے جاسوس متعین کر دیے گئے۔ ہر جاسوس آٹھ گھنٹے پہرا دیتا تھا۔ چوبیس گھنٹے اپنے فلیٹ میں جاسوس کی موجودگی پر بھی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ایک جاسوس رات کے وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتا تھا اور وہ خود ڈرائنگ روم سے ملحق اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھول کر رات کو سوتی تھی تاکہ جاسوس اس کی خواب گاہ کی نگرانی کر سکے لیکن تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں۔ کیتھرائن کو شروع ہی سے پولیس کی ناکامی کا یقین تھا۔ یہ سلسلہ تین ہفتے تک چلتا رہا۔ اس دوران شہر میں قتل کی کوئی نئی واردات بھی نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے ناکام ہو کر پولیس یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ قاتل شہر چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس آخر کب تک اس کی حفاظت کر سکتی تھی۔ تین ہفتے بعد انھوں نے اس کے گھر سے سادہ لباس والے جاسوس بھی ہٹا لیے۔ انھوں نے ایسا کرتے ہوئے کیتھرائن سے معذرت چاہی، اس کے بھرپور تعاون کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس کے بعد بھی اس کے گھر پر نظر رکھیں گے۔ خاص طور پر رات کے وقت اس علاقے میں پولیس کی ایک جیپ گشت کرتی رہے گی۔ انھوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر دے یا کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگوا لے لیکن اس نے ان کی یہ درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ضد دیکھتے ہوئے پولیس نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

جب یہ سب چلے گئے اور وہ اپنے مکان میں تنہا رہ گئی تو وہ اپنے اس منصوبے کے بارے میں غور کرنے لگی جو اس نے بہت پہلے سے بنا رکھا تھا اور جس کے لیے وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ اب وہ موقع آگیا تھا۔ وہ بے چینی سے رات ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

وہ رات بہت سرد تھی لیکن اس نے اپنی خواب گاہ کی کھڑکی کھول دی جو درخت کی شاخ کے قریب تھی جہاں سے وہ اجنبی پہلی مرتبہ اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے اس اجنبی کا بہت دنوں تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ہر رات کھڑکی کھولنی ہوگی۔ وہ لیمپ جلا کر شب خوابی کا مختصر ترین لباس پہن کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گئی تاکہ اجنبی کو باہر ہی سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ابھی جاگ رہی ہے اور باقی کمروں کی تاریکی سے وہ سمجھ جائے گا کہ وہ اپنی خواب گاہ میں سونے کی تیاری کر رہی ہے۔ سرد ہوائیں اس کے نیم برہنہ بدن سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہر جھونکے پر اس کے بدن میں کپکپی سی دوڑ جاتی تھی لیکن اسے سرد ہواؤں کی کوئی پروا نہیں تھی۔



آپ نے انگریزی کے مشہور ادیب سی بی گلفورڈ کی یہ خوب صورت کہانی پڑھ لی۔ ممکن ہے آپ اس تحریر سے سرسری گزر گئے ہوں اور یورپ کی عام جرائم رپورٹوں کی طرح اس کا تاثر قبول کیا ہو۔ میری درخواست ہے کہ اسے آپ دوبارہ پڑھیں، یہ ایک منفرد اور تاثر انگیز تحریر ہے۔ محسوس کرنے والے اسے محسوس کریں گے، جنھوں نے ساری عمر تشنگی میں گزار دی ہے اور جو اس رنگ رنگ دنیا میں بڑے محروم اور مظلوم لوگ ہیں، وہ گلفورڈ کی اس کہانی میں خود کو محسوس کریں گے۔ یہ محروم اور تشنہ لوگوں کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ان لوگوں کا احاطہ کرتی ہے جو ہجوم میں رہتے ہوئے بھی تنہا ہیں۔ کیتھرائن کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے، وہ ایک زمانے سے ایک شخص کی تلاش میں ہے۔ ایک شخص جو کبھی اس کے قریب نہیں آیا۔ اور جب آیا تو دور چلا گیا۔ وہ اسی کی منتظر ہے کہ اسی ایک شخص نے اسے قریب سے دیکھا تھا، ایسی نگاہوں سے۔ جن سے وہ عمر بھر محروم رہی تھی۔

(مدیر)



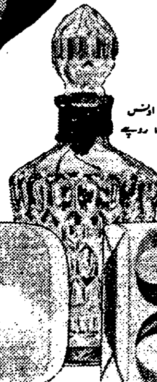
"... میرے حسن کا سنگھار - معطّر اور ملائم جھاگ والا انٹرنیشنل لکس!"

حسین فلمسٹار دانی کہتی ہے۔



انٹرنیشنل لکس کے معطر اور ملائم جھاگ سے حسن کی جاذبیت پائیے۔ یہ نرمی اور نزاکت سے رنگ و روپ کو دوبالا کرتا ہے۔

پیرس کی دلفریب خوشبو، لندن کا دیدہ زیب ریپر اور روم کی دلکش سڈول بناوٹ —— انٹرنیشنل لکس سفید، سبز اور گلابی رنگوں میں انتخاب کیجیے۔



وزن ۳۰ء ۳ اونس
قیمت ۲۵ء ۱ روپے

انٹرنیشنل لکس
دنیا بھر کے فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن





LTS.L.193.72.UD

LINTAS 81





ضیا تسنیم بلگرامی



کمال الدین علی شاہ نامی ایک بزرگ مکہ معظمہ سے خوارزم پہنچے اور یہاں سے اکتا کر ملتان چلے آئے۔ یہ خاندان قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ ملتان کے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی آمد سے کچھ عرصے پہلے منگول فاتح چنگیز خاں صحرائے گوبی سے نکل کر چین، ماورالنہر اور خوارزم کے بسنے والوں کو خاک اور خون اور ان کی تہذیبی علامتوں کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر چکا تھا۔ جو لوگ اس کی سفاکی سے بچ گئے۔ انھوں نے اپنی جان اور عزت و آبرو بچانے کے لیے دور دراز علاقوں کا رُخ کیا۔ انھی لوگوں میں مولانا حسام الدین نامی ترمذ کے ایک بزرگ بھی تھے جو ماورالنہر سے بھاگ کر ملتان کے قلعہ کوٹ کروڑ میں آ کر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ دو مختلف سمتوں سے آنے والے خاندانوں میں سے ترمذی خاندان میں ایک لڑکی تھی اور مکہ معظمہ سے آنے والے قریشی خاندان میں شیخ وجیہہ الدین نامی لڑکا تھا۔ دونوں خاندانوں نے ایک دوسرے کو بہت پسند کیا اور قریشی باپ نے اپنے بیٹے کی شادی ترمذی خاندان میں کر دی۔ اس رشتۂ مناکحت سے ۵۷۸ھ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا پیدا ہوئے۔

ابھی بہاء الدین زکریا بارہ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ انھوں نے باپ کی کمی اور غم کو سیر و سیاحت سے دُور کیا پہلے خراسان گئے پھر بخارا چلے گئے۔ ابھی یہ اپنی عمر کے پندرہ برس کو بھی نہ پہنچے تھے کہ بڑے بڑے علما ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنے لگے۔ یہاں سے رخصت ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے اور دل کی گہرائیوں اور جذبات کی شدت سے مناسکِ حج بجا لائے ——— یہیں شیخ کمال الدین یمنی نامی بزرگ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ بزرگ وہاں حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ یہاں حضرت زکریا ملتانی نے پچاس سال سے زائد کا عرصہ علمِ حدیث کا درس لینے میں گزار دیا۔ اور ساتھ ہی گرد و پیش مدفون اولیاء اللہ، انبیائے کرام اور زندہ مشائخ کی زیارت سے بھی طمانیتِ قلب حاصل کرتے رہے۔

مکہ معظمہ کے بعد آپ بغداد تشریف لے گئے، وہاں شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ شہاب الدین سہروردی اپنی نوعمری ہی میں تصوّف پر عوارف المعارف نامی شاہکار کتاب لکھ چکے تھے۔ شیخ نے زکریا ملتانیؒ کو ایک نظر دیکھا اور ان میں جو کچھ بھی تھا کشف سے شیخ پر ظاہر ہو گیا۔ شیخ الشیوخ سہروردیؒ کے آس پاس بیسیوں صاحبانِ حال و قال موجود تھے لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا حضرت زکریا ملتانیؒ سے موازنہ کیا جا سکتا۔

شیخ سہروردیؒ کی خدمت میں رہتے ہوئے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ حضرت زکریا ملتانیؒ عشا کی نماز ادا کر کے حجرے سے باہر نکلے تو تاروں بھرے آسمان کو دیکھ کر خالقِ کائنات کی عظمت سے سینے کو شق ہوتا محسوس کیا۔ مشرق میں اُفق سے ذرا اوپر زرد چاند جس کا کچھ حصہ جھڑا ہوا تھا، سر اُٹھائے دنیا کو دیکھ رہا تھا اور دنیا کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں منہ چھپائے سونے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ حضرت زکریا ملتانیؒ دیر تک دل ہی دل میں خالقِ ارض و سما کی مدح و ثنا میں مصروف رہے۔ پھر تہجد کا وقت آ گیا۔ آپ نے تہجد میں رات کا بیشتر حصہ گزار دیا۔ فجر سے ایک گھنٹے پہلے بستر پر پہنچے، نیند نے غلبہ کیا۔ سوتے ہی جو منظر سامنے آیا اور پھر بعد میں جب اس کی تعبیر سامنے آئی تو حضرت سہروردیؒ کی بارگاہ کے بہت سے بزرگ رشک و حسد کی آگ میں جل بھن گئے۔

آپ نے خواب میں دیکھا، ایک نہایت منوّر اور شاندار مکان میں آپ داخل ہوئے ہیں، آپ نے وہاں حضرت رسُولِ مقبولؐ کو موجود دیکھا، رسُولِ مقبولؐ کے روبرو حضرت شیخ الشیوخ سہروردیؒ نظریں جھکائے ادب سے کھڑے ہوئے تھے۔ رسُولِ مقبولؐ کے داہنی طرف ایک الگنی بندھی ہوئی تھی، اور اس الگنی پر کئی خرقے لٹکے ہوئے تھے۔

رسول مقبولؐ نے حضرت شیخ سہروردیؒ کو آواز دی "شہاب الدین! ادھر ہمارے قریب آؤ۔!"

شہاب الدین سہروردیؒ نہایت ادب سے چل کر رسول اللہؐ کے قریب پہنچ گئے۔

رسول اللہؐ نے دریافت کیا۔ "بہاء الدین زکریا کہاں ہے؟"

شہاب الدین نے جواب دیا۔ "حضور! اپنے حجرے میں ہوگا!"

آپؐ نے حکم دیا۔ "اُسے بلا کر یہاں لاؤ، ہمارے رُوبرو!"

حضرت سہروردیؒ حکم کی تعمیل میں منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر اُلٹے قدموں چل کر مکان سے باہر نکلے اور زکریا ملتانی کو ساتھ لے کر رسول اللہؐ کے پاس دوبارہ پہنچ گئے۔ حضرت سہروردیؒ نے زکریا کو حکم دیا "زکریا! یہ بارگاہِ نبویؐ ہے، ادب سے جھک کر تعظیم بجا لاؤ!"

زکریا فرطِ عقیدت اور افراطِ جوش سے رسول اللہؐ کے روبرو جھک گئے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا "زکریا! اس کی کوئی ضرورت نہیں، سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

جب زکریا سیدھے ہوگئے تو آپ نے حضرت شیخ سہروردیؒ سے فرمایا "شہاب الدین! زکریا کو وہ خرقہ پہنا دو جو الگنی کے انتہائی سرے پر سب سے قیمتی نظر آتا ہے۔"

شہاب الدینؒ میں انکار کی کیا مجال تھی، وہ قیمتی خرقہ الگنی سے اتار کر حضرت زکریا ملتانی کو پہنا دیا۔

اس کے بعد حضرت زکریا کی آنکھ کھل گئی تو ایسا لگا جیسے پورا حجرہ ناقابلِ بیان اور ناقابلِ تعریف خوشبو سے مہک رہا ہے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہاں ابھی ابھی رسول اللہؐ ضرور تشریف فرما رہے ہوں گے اور یہ خوشبو اور یہ مہک انہی کے وجودِ اطہر سے خارج ہوئی ہوگی۔

خواب سے بیدار ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مسجد سے اللہ اکبر کی آواز آنے لگی۔

فجر کی نماز پڑھ کر ابھی حضرت زکریا بیٹھے ہی تھے کہ حضرت شہاب الدین سہروردی کے ایک مُرید نے ادب سے عرض کیا کہ "حضرت آپ کو شیخ یاد فرما رہے ہیں!"

حضرت زکریا ملتانی جب اُس خاص مکان میں تشریف لے گئے جہاں شہاب الدین سہروردی اُن کا انتظار فرما رہے تھے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ وہی مکان تھا جہاں رات کے پچھلے پہر رسولِ مقبولؐ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی طرح ایک طرف الگنی پر مختلف نوع کے خرقے لٹکے ہوئے تھے اور انھی میں ایک طرف کنارے پر وہ خرقہ بھی موجود تھا جو رات کو حضرت رسُولِ مقبولؐ نے انھیں عطا فرمایا تھا۔

حضرت سہروردیؒ زکریا ملتانی کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ "بابا بہاء الدین! تم کہاں ہو؟ ہم تو دیر سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

حضرت زکریا ملتانی نے فرمایا۔ "حضرت! یہ ناچیز تو حضور کا پیام پاتے ہی چل پڑا تھا۔ بس آنے میں جتنی دیر بھی لگی ہو۔"

حضرت شہاب الدین سہروردی نے بڑھ کر الگنی سے خواب کا معروف خرقہ الگنی سے اتار لیا اور پھر حضرت زکریا ملتانی کو پہناتے ہوئے فرمایا۔ "بابا بہاء الدین!" پھر الگنی پر لٹکے ہوئے خرقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سارے خرقے حضرت رسُول مقبولؐ کے ہیں اور میری حیثیت ایک واسطے کی ہے۔ تمھارے لیے رسُول مقبولؐ نے جو حکم صادر فرمایا تھا اس کی تعمیل میں یہ خرقہ پہنا دیا گیا ہے!"

آس پاس وہ مرید بھی موجود تھے جنھوں نے حضرت شیخ الشیوخ کی خدمت اور اللہ کی اطاعت و ریاضت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار دیا تھا اور جو ان خرقوں کے طالب تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بہاء الدین زکریا ملتانی نامی ایک ایسے مُسافر کو ایک خصوصی خرقہ بارگاہِ مرشد سے عطا ہو گیا ہے جسے شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں رہتے ہوئے صرف سترہ دن گزرے ہیں، تو رشک و حسد کی آگ نے انھیں مشتعل کر دیا۔ انھوں نے بیک زبان شکایتاً کہا۔ "حضرت! گستاخی معاف! ہم خاکسار اور حضرت کے در مُرشدی کے ناصیہ فرسا کچھ پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں؟"

حضرت سہروردیؒ نے مُشفقانہ انداز میں انھیں دیکھا اور حرفِ شکایت زبان پر لانے کی اجازت دے دی۔

شاکی مریدوں نے عرض کیا۔ "حضرت! ہم آپ کے خادم اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے کے باوجود اب تک خرقوں کے عطیات سے محروم ہیں اور ایک شخص جسے اس بارگاہ میں آئے ابھی سترہ ہی دن گزرے ہیں خرقۂ خصوصی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ آخر اس میں کیا رمز ہے؟"

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ مسکرائے اور جواباً فرمایا۔ "لوگو! تمھاری مثال اُس لکڑی جیسی ہے جس میں پانی کی تری پائی جاتی ہے اور جسے آگ مشکل ہی سے پکڑ سکتی ہے لیکن یہ ہندی فقیر خشک لکڑی کی طرح ہے جسے آگ فوراً پکڑ لیتی ہے۔ اس کے دل میں اللہ کے عشق اور رسولؐ کی محبت کا سوز پایا جاتا ہے اسی لیے اس کو یہ خرقہ عطا ہوا۔" اس کے بعد آپ نے زکریا ملتانی کو حکم دیا۔ "بابا بہاء الدین! تم ملتان واپس جاؤ کیونکہ اس ملک کے باشندوں کی ہدایت تم پر فرض کی گئی ہے، وہ تمھارے منتظر ہیں۔"

حضرت زکریا ملتانی سے ذرا فاصلے پر شہاب الدین سہروردیؒ کے بھانجے شیخ ابراہیم عراقی بیٹھے ہوئے تھے۔ عراقی اپنے سوزِ دروں کا اظہار شاعری کے ذریعے کیا کرتے تھے حضرت زکریا ملتانی اُن کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ عراقی بھی صوفیوں کی وضع قطع میں شہاب الدین سہروردی کی مجلس میں موجود رہا کرتے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی کی خواہش تھی کہ عراقی بھی اُن کے شریکِ سفر ہوں لیکن زبان سے حرفِ مدعا عرض نہ کر سکے اور عراقی کو بغداد ہی میں چھوڑ ا خود ملتان روانہ ہو گئے۔

کسی نے حضرت شہاب الدین سہروردی سے شکایت کی کہ "حضرت! آپ کا بھانجا عراقی ایک نعل بند کے لڑکے پر عاشق ہو گیا ہے اور وقت کا بیشتر حصہ اس کے روبرو بیٹھ کر گزار دیتا ہے!"

حضرت سہروردی نے عراقی کو اپنے روبرو طلب کیا اور ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "عراقی! تو کس حال میں ہے کیا تو نہیں جانتا کہ اہلِ نظر تجھ پر حرف زن ہیں۔ کیا تجھے دوئی بہت زیادہ پسند ہے؟"

عراقی نے انکسار سے عرض کیا۔ "حضرت! وہ دوسرا کہاں ہے جس کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں؟"

حضرت سہروردی دل ہی دل میں شرمندہ سے ہو گئے اور اپنی زبان بند کر لی مدرسے میں طلبہ کا ہجوم تھا۔ عراقی انھیں پڑھا رہے تھے باری باری طالبِ علم اُٹھتے اور عراقی سے کچھ پوچھ کر اپنی جگہ پر واپس چلے جاتے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ چند آزاد رو اور قلندرانہ مزاج آدمی اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کے چہرے داڑھی مونچھ اور ابرو کے بالوں سے پاک تھے اُن کی عجیب وضع قطع تھی انھی میں ایک نہایت خوبصورت جوان بھی تھا۔ عراقی اسے دیکھتے ہی تلملا گئے' درس و تدریس کا سلسلہ تو موقوف ہوا اور عراقی ان کی خاطر تواضع میں لگ گئے۔ یہ آزاد منش کئی دن عراقی کے مہمان رہے۔ آخر ایک دن انھوں نے اجازت چاہی اور خراسان روانہ ہو گئے۔ عراقی نے جیسے تیسے تین دن اس حسین جوان کی مفارقت میں گزار دیے لیکن جب جُدائی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو خود بھی ان قلندروں کی تلاش میں بغداد سے نکل کھڑے ہوئے اور آخر انھیں پا بھی لیا اور ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ خود بھی ان کے ساتھ ساتھ رہنا اور گھومنا پھرنا چاہتے ہیں۔

کسی قلندر نے عرض کیا۔ "جناب! آپ ٹھیرے مردِ بزرگ۔ آپ کی لوگ بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ ہم قلندر لوگ چار ابرو کا صفایا کرنے والے، ہمارا آپ کا ساتھ کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہم میں تو وہ شامل ہو سکتا ہے جو ہماری ہی طرح داڑھی مونچھ اور ابروؤں کا صفایا کرا سکے"

عراقی نے بے پس و پیش جواب دیا۔ "جناب! آپ کیوں فکر کرتے ہیں، ہم چار ابرو کی صفائی پر بھی راضی ہیں۔"

اس کے بعد عراقی نے وہی کیا' جس کا قلندروں کی جانب سے اظہار ہوا تھا۔ داڑھی مونچھ اور ابروؤں کا صفایا کرا دیا اور قلندروں جیسی شکل بنا کر اُن کے ہمسفر ہو گئے۔ اتفاق کی بات یہ لوگ سیر و تفریح کرتے ہوئے ملتان میں داخل ہو گئے اور یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ یہ سب سے پہلے حضرت بہاء الدین زکریا کی خانقاہ میں پہنچے۔ عراقی کا خیال تھا کہ حضرت زکریا ملتانی اس حلیے اور لباس میں پہچان نہیں سکیں گے لیکن حضرت زکریا نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا اور اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان قلندروں میں کسی حسین و جمیل قلندر پر عراقی عاشق ہو گئے ہیں تو انھیں بہت دُکھ ہوا اور انھوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ عراقی کے دل سے یہ کثافت نکال پھینکیں گے۔

حضرت زکریا ملتانیؒ ابھی گمراہ عراقی سے کوئی بات بھی نہ کر سکے تھے کہ پتہ چلا عراقی قلندروں کی جماعت میں شامل ہو کر ملتان چھوڑ گئے۔

حضرت زکریا ملتانی کو اس خبر سے دُکھ پہنچا اور انھوں نے خدا سے دعا کی۔ "بار الٰہا! تو عراقی کو اس عاجز کے پاس واپس فرما۔"

ابھی یہ دعا ختم ہی ہوئی تھی کہ آسمان گرد و غبار میں چھپ گیا' دن میں اتنی تاریکی پھیلی کہ لوگ سمجھے شاید قیامت آ گئی ہے۔ عراقی کے ساتھی قلندروں نے معلوم نہیں کیوں یہ سوچا کہ ملتان واپس چلا جائے۔ یہ لوگ افتاں و خیزاں حضرت زکریا ملتانیؒ کی بارگاہ میں داخل ہوئے۔ انھی میں عراقی بھی شامل تھے۔

حضرت زکریا ملتانی نے اس خوبصورت قلندر کو دیکھا جس پر عراقی سو جان سے فدا ہو چکے تھے۔ تنہائی میں عراقی کو لے جا کر سوال کیا۔ "عراقی یہ تجھے کیا ہو گیا ہے' کیا تیری شرم بالکل جاتی رہی؟"

عراقی نے ادب سے عرض کیا۔ "حضرت آپ تو دل کی اصل کیفیت سے واقف ہیں پھر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں واقعی اس قلندر کے حُسن و جمال میں کھو گیا ہوں؟ ہرگز نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے لیکن اب تو تُو ہوش میں آجا۔"

عراقی نے جواب دیا۔ "حضرت! آپ بلاوجہ لوگوں کو شک میں مبتلا نہ کریں جو حقیقت ہے اس کا اظہار فرما دیں۔"

زکریا ملتانی نے کچھ سوچتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "عراقی ہم نے تو تجھے کسی نہ کسی طرح یہاں تک کھینچ بلایا۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو یہاں تک اپنے ارادوں سے پہنچا ہے؟ ہرگز نہیں' تجھے تو ہم نے کسی بہانے سے

یہاں تک بُلایا ہے!"

اس کے بعد حضرت زکریا نے عراقی کو سینے سے لگا لیا، سینے کا سینے سے ملنا تھا کہ عراقی کا سینہ پاک صاف ہو گیا، دوئی مٹ گئی اور اللہ کی محبّت نے جگہ بنالی۔

عراقی مستقلاً یہیں رہ پڑے۔ یہیں انھیں ایک حجرہ رہنے کے لیے بھی عطا ہوا۔ حضرت زکریا ملتانی اُن کی روحانی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے لگے۔ پھر عراقی کے حال پر حضرت زکریا ملتانی کی نوازشیں یہاں تک بڑھیں کہ حضرت زکریا نے اپنی ایک لڑکی کی شادی عراقی سے کر دی۔

عراقی شاعری کرتے اور اطاعت و ریاضت میں لگے رہتے۔



لاہور میں ہندوستان کا فرماں روا قطب الدین ایبک چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سمیت زمین پر گرا اور انتقال کر گیا۔ اس کی وصیت کے بموجب شمس الدین التمش ہندوستان کا فرماں روا بن گیا۔ ملتان میں مرحوم بادشاہ قطب الدین ایبک کا داماد ناصر الدین قباچہ خود کو اس منصب کا سب سے بڑا حقدار سمجھتا تھا۔ اُس نے التمش کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ ملتان کا قاضی شرف الدین اصفہانی اور حضرت زکریا ملتانی دونوں ہی ناصر الدین قباچہ کے مخالف تھے۔ دونوں نے التمش کو علیحدہ علیحدہ خط لکھے اور اس میں اس بات کا بطورِ خاص ذکر کر دیا کہ قباچہ کو جلد از جلد اس کی حکم عدولی اور بغاوت کی سزا ملنی چاہیے۔

اتفاق کی بات کہ یہ دونوں خطوط پکڑے گئے اور قباچہ نے دونوں خطوں کے لکھنے والوں کو اپنے دربار میں طلب کر لیا۔ اُس نے زکریا ملتانی کو تو اپنے پہلو میں بٹھایا اور قاضی اصفہانی کو برابر بٹھا لیا۔ اُس وقت مارے غصّے کے اُس کا بُرا حال تھا۔ اُس نے دونوں خطوط نکالے اور حضرت زکریا کا خط اُن کے حوالے کیا اور قاضی اصفہانی کا خط اُن کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر قاضی صاحب کو رعب دار آواز میں حکم دیا۔ "خط بآوازِ بلند پڑھا جائے۔"

قباچہ کے سامنے دُور تک درباری کھڑے ہوئے تھے اور اُس کے دائیں بائیں شمشیر زن اور تلوار باز تلواریں سونتے تیار تھے۔

قباچہ نے قاضی اصفہانی کو دوبارہ حکم دیا۔ "خط سنایا جائے۔"

قاضی اصفہانی نے خوفزدہ اور کپکپاتی آواز میں اپنا خط پڑھنا شروع کیا۔

"سلطان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملتان کا حاکم ناصر الدین قباچہ، اُن کے خلاف سازشیں کر رہا ہے اور فوجی قوت میں محض اس لیے اضافہ کر رہا ہے کہ سلطان پر حملہ آور ہو کر اسے تختِ دہلی سے دستبردار کر دے۔ قباچہ خود کو قطب الدین ایبک مرحوم سلطان کا داماد ہونے کے سبب ہند کی حکومت کا جائز مستحق سمجھتا ہے۔ قباچہ ملتان میں نیکیوں کے نفوذ اور برائیوں کے سدِّباب میں نہ صرف ناکام رہا ہے بلکہ اس کے زیرِ سایہ برائیاں پرورش پا رہی ہیں اور نیکیاں دم توڑ رہی ہیں۔"

قباچہ نے مشتعل ہو کر ڈانٹ دیا۔ "بس کر نمک حرام قاضی! اور اب اپنے انجام کے لیے تیار ہو جا!"

قاضی نے جلاّدوں کی طرف دیکھا جو ناصر الدین قباچہ پر کنکھیوں سے نظریں جمائے کسی حکم کے منتظر تھے۔ قباچہ نے سیاہ کپڑے والے، چھدری داڑھی اور سانولی رنگت جلاّد کو حکم دیا۔ "تعمیل برائے کیفرِ کردار!"

جلاّد کا شمشیر والا ہاتھ بلند ہوا، قاضی نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور تلوار کی ضرب سے بچنے کے لیے اعضا کے خود کار نظام کے ماتحت، مدافعت کے انداز میں اُن کی گردن ایک طرف جھک گئی لیکن اُسی لمحے جلاّد کی تلوار گدّی سے گزر کر حلق سے پار ہو گئی، دھم کی آواز سے جسم فرش پر گر کر پھڑکنے لگا اور سر لڑھک کر ان کے پھڑکتے جسم سے ٹکرا کر دُور جا گرا۔ خون کے فوارے نے فرش رنگین کر دیا۔

چاپلوس درباریوں نے بیک آواز شور کیا۔ "فنا فی النار سقر!"

اب حضرت زکریا ملتانی کی باری تھی۔ قاضی کی طرف سے فارغ ہو کر قباچہ اُن کی طرف متوجہ ہوا اور پہلے جیسے دُرشت لہجے میں انھیں مخاطب کیا۔ "اور تم نے بھی قطب الدین ایبک کے غلام اور ہند کے تاج و تخت کے غاصب شمس الدین التمش کو اسی قسم کا ایک خط اپنی تحریر میں روانہ کیا تھا؟"

حضرت زکریاؒ نے بے خوف آواز میں جواب دیا۔ "ہاں ہم نے بھی لکھا تھا۔"

قباچہ نے حضرت زکریاؒ کا خط ان کی طرف بڑھا دیا اور حکم دیا۔ "اسے بآوازِ بلند پڑھ کر سب کو سناؤ!"

حضرت زکریا ملتانیؒ نے قلندرانہ شان سے جواب دیا۔ "تو اسے کیوں اپنے درباریوں کے روبرو پڑھوانا چاہتا ہے۔ کیا تجھے اپنے انجام کا علم نہیں، کیا تو چاہتا ہے کہ ہم تجھے تیرے عبرت ناک انجام سے اسی وقت مطلع کر دیں۔" پھر آپ نے درباریوں اور جلاّدوں کی طرف دیکھا، وہ بھی اس عظیم ہستی کے پیرو یا معتقد تھے اور اُن کے دلوں میں ناصر الدین قباچہ کے خلاف نفرت کی مشعلیں جل اٹھی تھیں۔ حضرت زکریا ملتانی نے فرمایا۔ "لوگو! قباچہ کہتا ہے کہ ہم اپنا وہ خط جو ہندوستان کے ولی بادشاہ شمس الدین التمش کو قباچہ کے خلاف لکھا تھا، پڑھ کر سُنا دیں، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اس

خط کے سنانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ خط ہم نے ہی لکھا تھا اور قباچہ کے خلاف لکھا تھا اور اس میں قاضی اصفہانی کے خط سے زیادہ تلخ اور ناقابلِ برداشت باتیں لکھی گئی ہیں، قباچہ میں اگر ہمت ہے تو وہی حکم جو قاضی مظلوم کے حق میں چند لمحے پہلے صادر ہوا تھا، ہمارے لیے بھی صادر کردے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ ایسا نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر قباچہ خواہش کرے تو ہم ابھی اسی وقت اس کے بھیانک انجام کا نوشتۂ تقدیر پڑھ کر سنا سکتے ہیں!"

قباچہ خوفزدہ ہوکر حضرت زکریا ملتانی کو دیکھنے لگا۔ اُس نے مرتعش آواز میں دریافت کیا۔ "حضرت! کیا آپ کو ہمارے مستقبل کا علم ہے؟"

"ہاں ہے!" حضرت زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ "اگر تو اس سے واقف ہونا چاہتا ہے تو ہم بحکمِ ایزدی اس کا اظہار بھی کرسکتے ہیں!"

قباچہ نے کمزور آواز میں دریافت کیا۔ "حضرت! آپ کا بڑا کرم ہوگا، ہم اپنے انجام سے واقف ہونا چاہتے ہیں!"

حضرت زکریا ملتانی نے پُررعب آواز میں کہنا شروع کیا۔

"قاضی اصفہانی کا خونِ ناحق رائیگاں نہیں جائے گا، تُو نے قاضی کو خاک و خون میں لٹایا ہے تو پروردگارِ عالم تجھے تند و سرکش امواج کے حوالے کردے گا۔ قضائے مبرم تیرے تعاقب میں ہے تو گور و کفن سے بھی محروم رہے گا۔"

دربار پر سناٹا طاری تھا، قباچہ نے خوفزدہ آواز میں زکریا ملتانیؒ سے عرض کیا، "حضرت! کیا اس سزا میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن ہے؟"

حضرت زکریا نے جواب دیا۔ "نہیں جو دوسروں پر رحم نہیں کرتے، اُن پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا!"

دربار برخاست ہوگیا۔ حضرت زکریا ملتانی اپنی خانقاہ میں واپس آگئے۔

کچھ دنوں بعد شمس الدین التمش کی فوجیں قباچہ کی سرکوبی کو حرکت میں آگئیں۔ فوج کی قیادت التمش کا وزیر قوام الدین محمد کر رہا تھا، اُس وقت قباچہ اُچ میں مقیم تھا، خود التمش نے اُچ کا محاصرہ کرلیا۔ قباچہ یہاں سے فرار ہوکر بھکر پہنچا، بھکر کا قوام الدین نے محاصرہ کرلیا۔ اسی دوران قباچہ کو یہ خبر مل گئی کہ اُچ کو التمش نے فتح کرلیا۔ قباچہ نے مایوس اور افسردہ ہوکر زر و جواہر کا جو ذخیرہ اُس کے پاس موجود تھا، اپنے بیٹے بہرام شاہ کے ہاتھ التمش کی خدمت میں روانہ کرکے معافی کا طالب ہوا اور خود دریائے سندھ میں کشتیوں کے ذریعے پناہ گاہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، اُس کے ساتھ خاندان کے دوسرے لوگ بھی تھے۔ اُن کی کشتیاں تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھیں، ایک گرداب قباچہ کا منتظر تھا، جب اس کی کشتی گرداب کے قریب پہنچی تو بھنور نے اسے بچا دیا اور کشتی لہرا کر ذرا دور ہٹ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے تند و سرکش موجوں نے اُسے کھینچ کر پھر بھنور کے دہانے پر پہنچا دیا موجوں کے مدوجزر ہلکورے کشتی والوں کو دہشت زدہ کر رہے تھے۔

قباچہ کے کانوں میں حضرت زکریا ملتانی کی آواز گونج رہی تھی۔

"قضائے مبرم تیرے تعاقب میں ہے، پروردگارِ عالم تجھے تند و سرکش موجوں کے حوالے کردے گا۔ اُن پر رحم نہیں کیا جائے گا جو دوسروں پر رحم نہیں کرتے!"

بے تاب بھنور نے کشتی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور قباچہ کی کشتی تنکے کی طرح اس میں چکر کھانے لگی۔ کشتی والوں کی چیخیں فضا میں بلند ہوئیں۔ "بچاؤ، بچاؤ، مدد، مدد!"

قباچہ نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن کشتی کے تند و تیز چکروں نے اسے گرا دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ کشتی دریا کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔ اور پھر ذرا دیر بعد نہ وہاں کشتی تھی نہ بھنور۔ بھنور نے مشیتِ ایزدی پوری کردی تھی۔ اس کے بعد قباچہ کی لاش تک کا پتہ نہ چلا۔



عبداللہ نامی قوال روم سے مُلتان پہنچا۔ اُسے اپنی آواز اور فن پر ناز تھا۔ اُس نے حضرت زکریا ملتانی کے شیخ حضرت شہاب الدین سہروردی کو بھی اپنی آواز اور فن سے متاثر کیا تھا۔ یہ حضرت زکریا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ "حضرت! میری آواز اور فن سے حضرت شیخ سہروردی تک لطف اندوز ہوچکے ہیں۔ اب یہ خاکسار آپ کی خدمت میں باریاب ہے، اگر اجازت ہو تو کچھ آپ کو بھی سُنائے۔"

حضرت زکریا ملتانی نے انکسار سے جواب دیا۔ "جب تجھے حضرت شیخ الشیوخ نے سُنا ہے تو یہ عاجز بھی سُنے گا۔"

رات گئے حجرے میں محفلِ سماع منعقد ہوئی۔ عبداللہ قوال نے جب یہ شعر پڑھا کہ

مستاں کہ شراب ناب خوردند
از پہلوئے خود کباب کردند

تو حضرت زکریا کی حالت غیر ہوگئی۔ محفل میں روشن شمع کو اپنی آستین سے بجھا دیا اور پھر تاریکی میں حضرت زکریا ملتانی پر جو وجدانی کیفیت طاری ہوئی ہے اس کا تفصیلی علم کسی کو بھی نہ ہوسکا۔

خود قوال کا یہ بیان تھا کہ وہ حالتِ وجد میں کئی بار میرے قریب آئے لیکن میں اُن کا جسم نہ دیکھ سکا، بس دامن کی جھلک سی دیکھ سکا اور کچھ پتہ نہ تھا کہ حضرت زکریا اُس وقت بہ نفسِ نفیس محفلِ سماع میں موجود بھی تھے یا نہیں۔

دوسرے دن قوال کو بہت کچھ دے کر رخصت کیا۔ یہاں سے رُخصت ہو کر بابا فرید گنج شکرؒ کے پاس اجودھن چلا گیا اور اجودھن سے فیض یاب ہو کر دہلی روانہ ہو گیا۔ واپسی میں پھر اجودھن آیا اور کچھ دن بابا فرید کی خدمت میں رہ کر ملتان جانے کی اجازت چاہی۔ قوال اب تک جتنا کما چکا تھا اُس کی فکر دامن گیر تھی، اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں راہ میں لُٹ نہ جاؤں۔ اُس نے اپنے اس اندیشے کا بابا فرید پر اظہار کیا۔ "بابا! راستہ پُرخطر ہے، یہ غلام آپ کی دعاؤں کا اُمیدوار رہے!"

بابا فرید نے جواب دیا، "چند میل کے فاصلے پر تجھے ایک تالاب ملے گا، بس وہ تالاب ہی ہمارے علاقے کی حد ہے۔ ہم وہاں تک تو تیری ذمہ داری قبول کر لیں گے، اُس کے بعد تو جانے اور بابا زکریا ملتانی جانیں کیونکہ اس تالاب کے بعد ان کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔"

عبداللہ قوال نے جھک کر زمین کو بوسہ دیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جب وہ مذکورہ بالا تالاب کے کنارے پہنچا، رہزنوں کی ایک جماعت نے نمودار ہو کر قوال کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ اُن کی برہنہ تلواریں قوال کا خون چاٹنے کے لیے بے قرار نظر آ رہی تھیں، اُسے یاد آیا کہ یہ حدود زکریا ملتانی کی ہیں۔ اُس نے انتہائی دُکھ اور افسوس سے سوچا کہ یہاں تو حضرت زکریا ملتانی بھی موجود نہیں، پھر اُن سے مدد کس طرح طلب کی جا سکتی ہے!"

اُس نے آنکھیں بند کر کے خود کو رہزنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا لیکن جب دیر تک رہزنوں نے اُس پر حملہ نہیں کیا تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں تو میدان ہی صاف تھا، نہ رہزن تھے نہ کوئی اور، یہ سب کہاں چلے گئے۔ قوال کو کچھ پتہ نہ تھا۔

یہ قوال ملتان پہنچا، اور حضرت زکریا سے ملنے کا خواہشمند ہوا۔ اُس وقت قوال نے بالکل سُرخ لباس پہن رکھا تھا جو حضرت زکریا کو سخت ناپسند تھا۔ جب قوال نے حضرت زکریا کو سلام کیا تو آپ نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور کہا "عبداللہ! تو نے یہ کیسا شیطانی لباس زیب تن کر رکھا ہے!"

عبداللہ قوال کو یہ بات ناگوار گزری اور ترش لہجے میں بولا۔ "حضرت! یہ عجیب بات ہے کہ آپ انھیں کچھ نہیں کہتے جن کے خزانے سر بہ مُہر ہیں اور جن سے حاجت مند ایک پائی بھی نہیں پا سکتے، میرے معمولی لباس کو خواہ مخواہ ہدفِ ملامت بنا رہے ہیں!"

زکریا ملتانی نے غصّے میں جواب دیا۔ "عبداللہ! کیا تو یہ سب کچھ اپنے ہوش میں کہہ رہا ہے؟ ہمیں تیرے لباس کی کم قیمتی یا گرانمائیگی سے کوئی بحث نہیں، ہم تو اس رنگ کی بات کہہ رہے تھے کہ یہ صالح انسانوں اور مردوں کا رنگ نہیں ہے۔" پھر رہزنوں والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تو اس بے چارگی اور اضطراب کو بھول گیا جو ہماری حدود میں داخل ہو جانے کے بعد رہزنوں کے حملہ آور ہونے سے تجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ ناشکرے انسان! آخر تیری عقل کہاں چلی گئی، حرص و ہوا کے پتلے! کیا تو نہیں جانتا کہ ناشکروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیسا سلوک کرتا ہے!"

عبداللہ قوال گڑگڑا کر قدموں میں گر گیا اور دیر تک رو رو کر معافی مانگتا رہا۔ حضرت زکریا نے اُسے معاف کر دیا اور حلم و انکسار کی تلقین کر کے رُخصت کر دیا۔

ایک بحری جہاز عدن کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، اُس کے سارے مُسافر تاجر تھے اور جہاز میں نہایت قیمتی سامان اور مال و دولت کا انبار تھا۔ ابھی عدن کافی دُور تھا کہ طوفان کی سرکش ہواؤں نے جہاز کو اِدھر اُدھر پھینکنا شروع کر دیا۔ جہاز کے عملے نے طوفان سے بچنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ جہاز کے مستول پر جو بادبان لہرا رہے تھے، مستول کے ٹوٹ جانے سے جہاز میں آ گرے اور ہر وہ تدبیر ناکام ہو گئی جو جہاز کو تباہی یا غرقابی سے بچا سکتی تھی۔ اس جہاز میں خواجہ کمال الدین شیروانی بھی موجود تھے جو حضرت بہاء الدین زکریا کے مخلص ترین ارادتمندوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ خواجہ کمال الدین کی آنکھیں بھر آئیں اور رو رو کر کہنے لگے۔ "بابا زکریا! تم ملتان میں ہو اور تمہارا یہ ارادتمند ذرا دیر بعد سمندر کی تہہ میں چلا جائے گا جہاں آدم خور مچھلیاں اُسے اپنی غذا بنا لیں گی اور افسوس کہ تمہیں اپنے ارادتمند کی اس عبرت ناک موت کا علم بھی نہ ہو سکے گا۔"

اس ہنگامہ شور و پکار میں خواجہ کمال الدین نے دیکھا کہ ایک طرف سے حضرت زکریا ملتانیؒ خواجہ مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ خواجہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بار بار بابا زکریا کو دیکھا وہ بہ نفس نفیس خواجہ کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ بولے خواجہ! ابھی تو کیا کہہ رہا تھا کہ تیرا جہاز سمندر میں غرق ہو جائے گا اور تو سمندر کی تہہ میں موجود آدم خور مچھلیوں کی غذا بن جائے گا۔" پھر سنجیدگی سے فرمایا "لا تقنطوا من الرحمۃ اللہ" (اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو)"

جب خواجہ کمال الدین سے حضرت زکریا ملتانی مخاطب تھے۔ جہاز کے دوسرے لوگ بھی اُن کے قریب آ گئے۔ کسی نے خواجہ سے پوچھا۔ "جناب! یہ کون بزرگ ہیں۔؟"

خواجہ نے جواب دیا "حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی!"

ایک بدحواس بوڑھے تاجر نے پوچھا "یہ کیا کہتے ہیں؟"

خواجہ نے جواب دیا "یہ فرماتے ہیں کہ تمہارا جہاز نہیں ڈوبے گا تم سب اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہوا۔"

اس بوڑھے نے مزید استفسار کیا۔ بولا "یہ اب تک کہاں تھے، ہمارے ساتھ تو جہاز میں بیٹھے نہ تھے یہ اس وقت کہاں سے آ گئے؟"

خواجہ نے جواب دیا۔ "یہ تم انہی سے پوچھ لو!"

بوڑھے تاجر نے حضرت زکریا سے پوچھا۔ "حضرت! اب تک آپ کہاں تھے؟"

حضرت زکریا نے جواب دیا۔ "یہیں تمہارے آس پاس۔ ہم کثافتوں سے پاک لوگ جب اور جہاں چاہیں آ جا سکتے ہیں۔ زمان و مکان اور بُعد و فصل ہمارے یہاں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

پھر لوگوں نے حضرت زکریا ملتانی کو ہوا میں تحلیل ہو جاتے دیکھا۔ لوگ حیرت زدہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور جب انہیں ہوش آیا تو پتہ چلا کہ تند و تیز ہوائیں تھم چکی تھیں اور بغیر بادبان کا جہاز رواں دواں عدن کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔

جب یہ قافلہ عدن میں بخیر و عافیت اُتر گیا تو تاجروں نے نہایت خلوص و عقیدت سے باتفاق یہ طے کیا کہ سبھی اپنے اپنے مال و دولت کا تہائی حصہ حضرت زکریا ملتانی کی خدمت میں ملتان روانہ کر دیں گے۔

لوگوں نے حضرت زکریا کا حصہ الگ کیا اور فخر الدین گیلانی نامی بزرگ کے ذریعے اسے ملتان روانہ کر دیا۔ فخر الدین گیلانی جب حضرت زکریا کی خدمت میں باریاب ہوئے تو یہ دیکھ کر اور زیادہ حیران ہوئے کہ بابا زکریا اُس وقت بھی اُسی لباس میں تھے جس لباس میں اُنہیں طوفان میں پھنسے جہاز میں دیکھا گیا تھا۔

حضرت زکریا ملتانی نے اس مال اور دولت کو مستحقین اور حاجت مندوں میں تین دن کے اندر تقسیم کر کے ختم کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی مجموعی قیمت تقریباً ستر لاکھ تنکہ تھی۔ فخر الدین گیلانی حضرت زکریا ملتانی سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنا سب کچھ راہ خدا میں دے دیا اور بابا زکریا کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے یہاں پانچ سال رہ کر مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔ آج بھی فخر الدین گیلانی کے مزار پر لوگ جاتے ہیں اور سکونِ قلب حاصل کرتے ہیں۔



حضرت زکریا ملتانیؒ فجر کی نماز مولانا قطب الدین کاشانی کی اقتدا میں ادا کیا کرتے تھے۔ مولانا کاشانی ماوراالنہر سے آئے تھے اور اپنے وقت کے علامۂ زماں تھے۔ مولانا نمازِ فجر پڑھ کر درس و تدریس میں لگ جاتے تھے۔ حضرت زکریا ملتانی کا مرتبہ بھی اُن پر عیاں تھا۔ ایک دن مولانا نے حضرت زکریا سے پوچھا۔ "حضرت! آپ تو صاحبِ عالم ہی ہیں اور آپ کو جو مرتبہ خدا نے عطا کیا ہے اُس میں آپ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا پھر آپ ہماری اقتدا میں نماز کیوں ادا فرماتے ہیں؟"

حضرت زکریا ملتانی نے جواب دیا۔ "رسُولِ مقبولؐ نے فرمایا تھا کہ علماء نائبِ رسُول ہیں۔ ہم اسی قول کے احترام میں تمہاری اقتدا کرتے ہیں!"

ایک دن حضرت زکریا ملتانی جب نماز کے لئے مسجد میں پہنچے تو مولانا ایک رکعت نماز ادا کر چکے تھے۔ حضرت زکریا دوسری رکعت میں شریک ہو گئے۔ جب مولانا نے دوسری رکعت میں بیٹھ کر التحیات شروع کی تو حضرت زکریا سلام سے پیشتر ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بقیہ نماز پوری کی۔ نماز کے بعد مولانا نے تلخی سے پوچھا۔ "حضرت! آپ میرے سلام سے پیشتر ہی اُٹھ کر کیوں کھڑے ہو گئے؟"

حضرت زکریا نے جواب دیا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ جس وقت ہم نے امام کی اقتدا توڑی تھی اُس وقت امام وسوسۂ دینوی کا

شکار ہوچکا تھا!"

مولانا نے پُوچھا "یہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا؟"

حضرت زکریا نے جواب دیا "نورِ باطن سے!"

مولانا نے درشتی اور عالمانہ غرور سے کہا "جو روشن، نورِ شریعت کے مُطابق نہ ہو وہ ظلمت ہے۔"

حضرت زکریا نے جواب دیا "حضرت رسُولِ مقبولؐ کا فرمان ہے کہ کبھی متکبر کے غرور کا جواب غرور سے دینا عبادت میں داخل ہے، اب ہم بھی تمہارے عالمانہ غرور کے جواب میں، تمہاری اقتدا میں نماز نہیں پڑھیں گے!"

اُس کے بعد حضرت زکریا نے مولانا کاشانی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی۔



حضرت زکریا ملتانی نے اپنی عمر کے آخری حصے میں بھوک اور روزے کی ریاضت سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ ان کے باورچی خانے میں قسم قسم کا کھانا پکتا تھا اور مسافروں اور مہمانوں کو کھلا کر یا اُن کے ساتھ کھا کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ انسان کو چاہیئے کہ عام دنیا داروں کی طرح کھانے پینے کی لذّاتِ دنیوی سے فائدہ اُٹھائے مگر خدا کو نہ بھولے۔

ایک بار حضرت زکریا ملتانی نے بابا فرید کو کسی شخص کے لئے معذرت کرتے ہوئے کہا:

میانِ ما و شما عشق بازی ست

بابا فرید نے اس معذرت کا جواب یوں دیا:

میانِ ما و شما عشق ست، بازی نیست

حضرت زکریا ملتانی بلا کے پُرجوش انسان تھے، انھوں نے جس جوش سے اسلام کی تبلیغ کی اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ چند سالوں میں مُلتان کی حالت بدل کر رکھ دی۔ ہر طرف مدرسے اور مسجدیں نظر آنے لگیں۔ مُلتان پورے ہندوستان کے لئے فیوض و برکاتِ رُوحانی کا منبع بن گیا۔ ملتان کا مدرسہ اسلام کا مرکزی دارالعلوم قرار پایا۔ یہاں دینی اور دنیوی علوم اور فنون کی تعلیم مُفت دی جاتی تھی۔ حضرت زکریا ملتانی اس دارالعلوم کے مہتمم اعلیٰ تھے، یہاں اس برصغیر کے علاوہ عراق، شام اور حجاز تک سے لوگ علم حاصل کرنے آتے تھے اور یہ ہزاروں کی تعداد میں ہوا کرتے تھے۔ مُفت تعلیم، مُفت رہائش، کتابیں، سیاہی، قلم، کاغذ اور درس و تدریس کی جُملہ اشیا مُفت فراہم کی جاتی تھیں۔

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اندر مکان میں آرام فرما رہے تھے۔ اُن کے صاحبزادے صدرالدین عارف باہر کھڑے تھے، ایک شخص آیا اور صدرالدین عارف کی طرف ایک لفافہ بڑھا دیا، بولا "صاحبزادے! یہ خط بہاء الدین زکریا کو پہنچا دو۔"

بیٹے نے یہ لفافہ باپ کے حوالے کر دیا اور خود باہر آگیا، وہاں وہ اجنبی شخص اب موجود نہیں تھا۔ صدرالدین عارف ابھی اس اجنبی کو تلاش ہی کر رہے تھے کہ مکان کے چاروں گوشوں سے آوازیں بلند ہوئیں "دوست بہ دوست رسید۔"

صدرالدین گھبرا کر اندر پہنچے اور باپ کے سرہانے پہنچ گئے۔ نامہ کھلا ہوا سینے پر رکھا تھا اور حضرت بہاء الدین زکریا رحلت فرما چکے تھے۔ بیٹے نے اس نامے کو پڑھنا چاہا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں کس نے کس کو کیا لکھا تھا۔

ٹھیک اس وقت جب حضرت بہاء الدین زکریا نے وفات پائی تھی، بابا فرید گنج شکر اجودھن میں لوگوں سے کہہ رہے تھے۔

"بھائی بہاء الدین زکریا اس بیابانِ فنا سے شہرستانِ بقا کو رخصت ہو چکے۔"

اتنا کہہ کر بابا فرید بے ہوش ہوگئے۔ ہوش میں آنے پر بابا فرید نے اپنے مُریدوں کی صفیں دُرست کیں اور خود امام بن کر حضرت بہاء الدین زکریا کی نماز غائبانہ ادا فرمائی۔ داراشکوہ کی سفینۃ الاولیا کے مطابق آپ کی عمر سو سال سے زائد تھی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ بدن کی سلامتی طعام میں، رُوح کی سلامتی ترکِ گناہ میں اور دین کی سلامتی رسُولِ مقبولؐ پر درود بھیجنے میں ہے۔

آپ کے جن مُریدوں نے بڑی شہرت حاصل کی اُن میں آپ کے بیٹے صدرالدین عارفؒ، پوتے رکن الدین ابوالفتح کے علاوہ سیّد جلال الدین منیر شاہ سرخ بخاری اور سندھ کے لعل شہباز قلندر بہت مشہور ہیں۔

آج بھی قلعے کی اونچی سطح پر، ۷ صفر المظفر کو مُلتان میں حضرت بہاء الدین زکریا کا عُرس بڑی شان سے منایا جاتا ہے جس میں برصغیر کے دونوں حصوں سے آ آ کر ان کے عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔ عُرس کے علاوہ عام دنوں میں بھی زائرین کی بڑی تعداد یہاں حاضر رہتی ہے۔



عرب نوجوان جابر بن یوسف الباقر کو اپنی زندگی میں ایسے غیر معمولی واقعات و حادثات سے سابقہ پڑا جنھیں عقل تسلیم کرنے سے گریزاں رہتی ہے۔ جابر بن یوسف ایک وجیہہ، جذباتی، ضدی اور شگفتہ مزاج نوجوان تھا۔ آکسفورڈ میں تعلیم کے دوران اس کی ملاقات انگلستان کی حسین ترین لڑکی فلورا سے ہوئی مگر جابر اپنی تمام تر وجاہت، ذہانت اور مہارت کے باوجود اُس کا التفات حاصل نہ کرسکا۔ آخر فارغ التحصیل ہونے کے بعد جابر بیروت واپس آگیا۔ یہاں اس کا باپ پولیس کے ایک اعلا عہدے پر فائز تھا۔ بیروت میں ایک دن اچانک جابر کو فلورا نظر آئی۔ جابر بے تابانہ اُس سے ملا لیکن اُس کی غیر متوقع اور پُراسرار آمد کا مقصد معلوم نہ کرسکا۔ پھر جابر نے بڑے پُرتپاک اور پُرجوش انداز میں فلورا کو پورا بیروت گھمایا اور اس دوران میں برابر اُسے اپنے سے قریب لانے کی کوششیں کرتا رہا۔ جابر کی مہمان نوازی اور حُسنِ سلوک سے فلورا بے حد متاثر ہوئی لیکن لیے دیے رہی۔ اُس کے محتاط رویّے نے جابر کی آتشِ شوق اور بھڑکا دی۔ بیروت میں چند روز قیام کے بعد فلورا کو ڈربن جانا تھا۔ اُس نے جابر کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ جابر کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ وہ فوراً تیار ہوگیا۔ حُسنِ اتفاق سے اُنھی دنوں جابر کے باپ نے اُسے ایک بند سرکاری لفافہ لے کر ہانگ کانگ جانے کی ہدایت کی۔ جابر ہانگ کانگ روانہ ہونے کے بجائے فلورا کے ساتھ ڈربن جانے کے لیے بحری جہاز میں سوار ہوگیا۔ جہاز میں سفر کے دوران میں ایک دفعہ جابر نے فلورا کو ایک پستہ قد اجنبی مسافر سے رازدارانہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو اُس کی طرف سے مشکوک ہوگیا لیکن مصلحتاً خاموش رہا۔ ایک دن وہ بے خیالی میں ریلنگ کے قریب ایک بدہیئت اور بوڑھی افریقی ساحرہ سے ٹکرا گیا۔ ساحرہ عجیب و غریب قسم کے ہار، مالائیں اور زیورات پہنے ہوئے تھی۔ ٹکر لگنے سے اُس کے گلے میں پڑی ہوئی ایک مالا ٹوٹ کر نیچے گر پڑی اور اُس میں لٹکی ہوئی نیولے کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی۔ بوڑھی ساحرہ کی حالت ایک دم متغیر ہوگئی۔ وہ افریقی زبان میں مقدس جاراکا کے نام سے جابر کو بددعائیں دینے لگی اور زیرِ لب کچھ بڑبڑاتی ہوئی اچانک سمندر میں کود گئی۔ اس حادثے نے لوگوں کے دل دہلا دیے۔ اسی شام جہاز ایک زبردست سمندری طوفان میں گھر گیا۔ تباہی کی آندھیاں چلنے لگیں۔ جہاز میں افراتفری پھیل گئی۔ انسانوں کی چیخ پکار نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وسیع و عریض جہاز ایک حقیر تنکے کی طرح سمندر میں ڈول رہا تھا۔ اور جب بہت دیر بعد یہ ہولناک طوفان تھما تو جہاز غرق ہوگیا تھا اور بیشتر مسافر سمندری اژدہوں کی خوراک بن چکے تھے۔ جابر اور فلورا کے علاوہ صرف نو افراد زندہ بچے تھے جو ایک حفاظتی کشتی میں سوار کسی نامعلوم منزل کی طرف چلے جارہے تھے۔ راستے میں سیاہ فام حبشی مسافر تومغا نے بھوک کی شدت سے بے تاب ہوکر اپنے ساتھی یہودی مسافر کو قتل کر ڈالا اور اس کے کچے گوشت سے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔ سرنگاداس اور اس کی خوب صورت کنواری بیٹی سرپتا کے سوا دوسرے تمام بھوکے مسافروں نے بھی تومغا کی تقلید کی اور آدم خور درندوں کی طرح یہودی کی لاش پر ٹوٹ پڑے۔ تومغا نے بڑی سفاکی سے یہودی کی بے نور آنکھیں نکال لیں اور کچھ جادوئی کلمات ادا کرتے ہوئے انھیں سمندر میں اُچھال دیا اور کہنے لگا "میں نے کشتی کو آنکھیں دے دی ہیں۔ اب ہم جلد ہی کسی جزیرے میں پہنچ جائیں گے۔" دوسرے روز نوجوان انگریز طالب علم تومغا کے عتاب کا شکار ہوگیا۔ ان میں ایک ڈاکٹر بھی تھا جو تومغا کی دہشت انگیزی دیکھ کر دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اُسی روز ملاح جعفر بھی چل بسا اور پھر جب خدا خدا کرکے کشتی خشکی کے قریب آئی تو تومغا پر وحشت طاری ہوگئی اور وہ بھی پُراسرار طور پر کہیں غائب ہوگیا۔ یہ حرماں نصیب قافلہ پے در پے کلفتیں برداشت کرتا ہوا خشکی پر پہنچ گیا۔ مگر وہاں ایک اور مصیبت کھڑی تھی۔ ساحل پر رنگ ڈھنگ اور بدہیئت حبشیوں نے انھیں گھیر لیا اور نیزے برسانے لگے۔ اس اُفتاد سے مصری تاجر کمال موقع پر جاں بحق ہوگیا۔ جنگلیوں نے زندہ بچنے والے بدنصیبوں کو ایک جھونپڑی میں لے جاکر قید کردیا۔ جابر افریقی زبان میں کچھ شُد بُد رکھتا تھا۔ اس نے جنگلیوں سے سُنا کہ اب ان قیدیوں کی قسمتوں کا فیصلہ مقدس اقابلا کرے گی اور اس سے پہلے انھیں جنگلیوں کے سردار شوالا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ زنداں کی پہلی رات فلورا بہت دہشت زدہ تھی۔ جابر تسلی دیتا ہوا اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ کر سوگیا۔ رات گئے اچانک اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور یہ دیکھ کر سخت سراسیمہ ہوا کہ فلورا وہاں موجود نہیں تھی۔

فلورا کی گُم شدگی نے جابر کے ہوش و حواس معطّل کردیے۔ سرنگاداس کے سوا تمام لوگ غافل سو رہے تھے۔ سرنگا کی جیب میں ہمیشہ ایک مورتی رکھی رہتی تھی۔ اُس نے مورتی نکال کر نہایت اطمینان اور احترام سے اُسے چُوما اور جابر کو تشفی اور دلاسے دینے لگا مگر جابر کا اضطراب و اضطرار کم نہ ہوا۔ وہ بڑی بے چینی سے اُٹھ کر جھونپڑی کے دروازے تک گیا۔ وہاں حبشی پہرے داروں کی سرگوشیوں سے جابر پر یہ دہشت ناک انکشاف ہوا کہ فلورا کو قبیلے کے طاقت ور سردار شوالا نے اپنے لیے منتخب کرکے اغوا کرالیا ہے۔ جابر غصّے اور بے بسی کے عالم میں سر کے بال نوچنے لگا۔ اسی طرح نہ معلوم کتنا وقت گزر گیا۔ پھر فلورا غیر متوقع طور پر دوبارہ جھونپڑی میں پہنچا دی گئی۔ فلورا کی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ چہرے کے سوا اُس کے سارے بدن پر بچھوؤں جیسے بے شمار چھوٹے چھوٹے زرد کیڑے رینگ رہے تھے۔ توشا اور نیری نامی دو سیاہ فام برہنہ دوشیزائیں اُس کی نگرانی پر مامور تھیں۔ اپنی محبوبہ کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر جابر کا خون کھول اُٹھا مگر اس کا بوڑھا ساتھی سرنگاداس اشتعال انگیز حد تک ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ سخت سے سخت مصیبت بھی اُسے برہم، برافروختہ اور خوف زدہ نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک صاحبِ اسرار آدمی تھا۔ اُس کی ہر بات میں کوئی راز تھا، کوئی بھید

گذشتہ قسطوں کے مکمل خلاصے کے ساتھ

اقابلا

۸ جابر بن یوسف الباقر



تھا جس کی تہ تک جابر جیسے ذہین شخص کی عقابی نگاہیں بھی پہنچنے سے قاصر تھیں۔ سرنگا نے جابر کو جذبات پر قابو پانے اور پُرسکون رہنے کی تلقین کی اور مشورہ دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سیاہ فام دوشیزاؤں کو مٹھی میں لے کر اس خطرناک جزیرے اور اس ننگِ انسانیت قبیلے کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرلے تاکہ ان معلومات کی روشنی میں کوئی مناسب قدم اُٹھایا جاسکے۔ اگرچہ یہ ایک دقیق اور پُرپیچ مہم تھی لیکن جابر آکسفورڈ اور بیروت کا سند یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محنتی نوجوان بھی تھا، اُس نے غیر معمولی تگ و دو کے بعد آخر یہ مہم سر کرلی۔ تیکھے نقوش والی سانولی دوشیزہ توشا سے جابر کو معلوم ہوا کہ مقدس [illegible] جارا کاکا کی نمائندہ ہے اور یہاں کی مطلق العنان حکمراں ہے۔ دُور کسی غار میں اس کا عظیم الشان قصر ہے۔ اُس نے قبیلے پر دو سردار شوالا اور کالاری نامزد کردیے ہیں۔ شوالا تمام حشرات الارض کا مختار ہے اور ...ے وغیرہ کالاری کے تصرف میں ہیں۔ شوالا نے فلورا کو اپنے لیے منتخب کرلیا ہے اور اس کی تطہیر کے لیے یہ زرد رنگ کے کیڑے اس کے بدن پر متعین کردیے ہیں۔ یہ پُراسرار کیڑے عورت کے شباب کی عمر ...تے ہیں، حسن نکھارتے ہیں اور بدن کو لذت انگیز اور معطر بنادیتے ہیں۔ جابر نے نہایت تعجب کے ساتھ یہ بھی سُنا کہ جس شخص کے پاس جارا کاکا کی مقدس کھوپڑی ہوتی ہے وہ افضلیت اور ...از کا مستحق ٹھہرتا ہے اور نحوستیں اُس سے دُور رہتی ہیں۔ ان معلومات کے معاوضے میں جابر نے نوعمر توشا کو پہلی بار ایک نئی لذت سے روشناس کرایا۔ وہ سرشار ہوگئی۔

دوسرا دن زبردست آلام و مصائب لے کر آیا۔ سفر کی صعوبتوں اور ناقابلِ یقین سانحوں کے تسلسل سے جابر کے مہربان ساتھی ڈاکٹر جواد کا ذہنی توازن اور مخدوش ہوگیا تھا۔ حبشیوں نے نہایت تعجب خیز اور انسانیت سوز طریقے سے ڈاکٹر کا علاج کیا۔ اسے ایک درخت کے ساتھ کس کے باندھ دیا گیا۔ اور حبشی طبیب نے ہتھوڑی اور چھینی کی مدد سے اس کے سر پر کاری ضربیں لگائیں۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر جابر اور اُس کے دُوسرے ساتھی اپنی فلک شگاف چیخیں نہ روک سکے۔ اس دہشت گردی کے بعد تمام قیدیوں کی پیٹھوں پر لکڑیوں کے بڑے بڑے وزنی گٹھر لاد دیے گئے اور انہیں خار دار جنگلوں میں میلوں بھوکا پیاسا چلوایا گیا۔ اسی اثنا میں ایک مسافر شیخ طاہر اچانک ہذیان بکتا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ فاصلے کے بعد غش کھاکر گر پڑا اور نہایت پُراسرار طریقے سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ اُس کے مُردہ سینے پر جارا کاکا کی کھوپڑی خود بخود منقش ہوگئی تھی۔ پہرے دار حبشیوں نے کھوپڑی کا نقش دیکھا تو بیک آواز چیخے اور دردناک آہ و بکا کرتے ہوئے گھنی جھاڑیوں میں بھاگ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ سیاہ بخت مسافر پھر گھیر لیے گئے اور انہیں دوبارہ جھونپڑی میں قید کردیا گیا۔ جابر ہر قیمت پر وہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے کئی منصوبے بنائے۔ سرنگا سے مشورے کیے۔ آخر رات کے وقت توشا اور زیری سے خوش فعلیوں کے بعد وہ باہر نکلا۔ اُس نے نہایت احتیاط، ہوشیاری اور بے جگری سے دو پہریداروں کو ہلاک کردیا۔ پھر راستے کے عجیب و غریب حادثات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا اُس اندھیرے غار میں پہنچا جہاں وہ طبیب رہتا تھا جس نے ڈاکٹر جواد کا وحشیانہ علاج کیا تھا۔ طبیب کے گلے میں بھی جارا کاکا کی کھوپڑی پڑی رہتی تھی۔ جابر نے نہایت مستعدی اور چابکدستی سے طبیب کو ہلاک کرکے کھوپڑی قبضے میں لے لی۔ اب وہ کسی قدر محفوظ تھا۔ وہ رات بھر جنگلوں اور میدانوں میں بھٹکتا رہا۔ صبح صادق کے وقت یکا یک لاتعداد حبشیوں کی چیخ پکار کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ایک سیارے کی طرح تیزی سے اِدھر اُدھر چکر لگانے لگا۔ زبردست دوڑ دھوپ کے بعد اُسے ایک غار ملا۔ کوئی اور چارہ نہ دیکھ کر وہ اندر گھس گیا۔ مگر یہ ایک تاریک سُرنگ تھی۔ جابر ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس ویران اور تاریک سُرنگ میں ایک کھنکدار نسوانی قہقہے نے اس کا استقبال کیا۔ جابر دہشت زدہ ہوگیا۔ باہر سے حبشیوں کا خوفناک شور و غوغا موت کے پیغام کی طرح سُنائی دے رہا تھا اور اندر یہ پُراسرار نسوانی قہقہے۔

اس بلائے ناگہانی سے جابر عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہوگیا۔ تاریک غار کے اندر ایک پُراسرار طلسمی فضا اور باہر شور مچاتے ہوئے موت کے عفریت۔ اُس نے سُرنگ کی گہری تاریکی میں ہر جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس دہشت میں اُس کے طباع ذہن نے فوراً ایک فیصلہ کیا۔ وہ جھکتا، ٹکراتا، گرتا پڑتا غار کے اندر بڑھنے لگا۔ وہ کوئی سُرنگ تھی۔ کافی اندر جاکر اُس کے دو راستے ہوگئے۔ اُس نے یوں ہی بائیں راستے پر قدم رکھ دیا۔ اسی لمحے ایک لطیف نسوانی آواز نے اُسے ٹھہرنے کا حکم دیا اور جب جابر نے آواز کی سمت نشانہ باندھ کر نیزا پھینکا تو وہ دیوار سے ٹکرا گیا اور پھر دلکش نسوانی قہقہوں سے سُرنگ گونجنے لگی اور یک بیک تمام سُرنگ روشن ہوگئی۔ ساتھ ہی کسی نے نہایت مترنم لہجے اور فصیح و بلیغ عربی میں اُسے مخاطب کیا۔ آقا بلا کی عظمت کے گُن گائے اور جابر کو سیدھے ہاتھ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے حکم کی تعمیل کی اور اندر جاکر اُسے پتھروں کا بنا ہوا ایک عالی شان دروازہ نظر آیا۔ جابر نے غیر ارادی طور پر وہاں لگی ہوئی ایک فولادی زنجیر کھینچ لی اور دروازہ آہستہ آہستہ کھُل گیا۔ جب وہ اندر داخل ہُوا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ کسی قدیم یونانی طرز کے آراستہ و پیراستہ محل میں تھا۔ محل میں کوئی ذی رُوح موجود نہیں تھا۔ صرف وہی نسوانی آواز اُس پر فردِ جرم عائد کررہی تھی۔ جابر نے اُس آواز کی عدالت میں صفائی پیش کی اور بہت رد و قدح کے بعد وہ آواز مجسم شکل میں ظاہر ہوئی۔ اُس نے اس سے پہلے اتنی حسین لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اُس کے حُسن میں گم ہوگیا اور سب کچھ بھول بیٹھا کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔ وہ آقا بلا کی ادنا کنیز ژولین تھی۔ جابر نے کچھ ایسی وارفتگی اور جوش کا مظاہرہ کیا کہ ژولین پگھلنے لگی اور جارا کاکا کی کھوپڑی جابر سے الگ رکھوا کر وہ اُس کے سینے میں سما گئی لیکن جلد ہی ایک جھٹکے سے جابر کو علیحدہ کرکے کسی نامعلوم زبان میں گڑگڑانے لگی۔ اُس کی فریاد رائیگاں گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا سُرخ مرمریں بدن راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔ جابر اس طلسمی تماشے سے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور غش کھاکر گر پڑا۔ جب اُس کی آنکھ کھُلی تو وہ اپنی جھونپڑی میں تھا۔ سرتیا، سرنگا، توشا اور زیری اُس کے پاس جارا کاکا کی کھوپڑی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ سرنگا کے اصرار پر اُس نے اپنی روداد سُنائی۔ پھر جب خوفناک شوالا عجیب ہیئت کذائی سے جھونپڑی میں آیا تو جابر کے گلے میں جارا کاکا کی کھوپڑی دیکھ کر سخت مشتعل ہوگیا۔ اُس نے جابر کو کھوپڑی اُتارنے کا حکم دیا جسے جابر نے سرنگا کے اشارے پر مسترد کردیا۔ شوالا نے غالباً اپنی برتری اور قوت کا اثبات کرنے کیلیے جھونپڑی سے باہر موت کا ایک خونیں ڈراما کھیلا۔ حسین توشا کو جابر سے تعلق پیدا کرنے پر آدم خور چیونٹیوں کے حوالے کردیا گیا جنہوں نے لمحوں میں اُس کا جسم چاٹ لیا۔ سرتیا یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہوگئی اور شوالا نے جابر کو دو دن کی مہلت دی کہ وہ اس عرصے میں جارا کاکا کی کھوپڑی اُس کے حوالے کردے۔ رات کو زیری سے کچھ اور معلومات حاصل کرنے کے لیے جابر نے اُسے اپنی جانب ملتفت کرنا چاہا۔ وہ اُس کی آغوش میں در آئی لیکن اُس نے جابر کے مجنونانہ جذبات یہ کہہ کر رد کردیے کہ جارا کاکا کی کھوپڑی کی موجودگی میں یہ ہوس کاری جائز نہیں ہے۔ بدمست جابر کھوپڑی اُتار دیتا مگر سرنگا آڑے آگیا۔ اُس نے زیری کو خود سے علیحدہ کردیا۔ رات کو اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ زیری کھوپڑی اُتارنے کی کوشش کررہی تھی۔ جابر غصے سے بے قابو ہوگیا مگر اسی اثنا میں دروازہ ایک دھماکے سے کھُلا اور بھڑکتی ہوئی آگ کے ایک پُراسرار گولے نے زیری کو لپیٹ میں لے لیا اور اُسے جلا کر بھسم کردیا۔ ابھی اس لرزہ خیز واقعے کو دیر نہیں ہوئی تھی کہ سُریلی سرتیا ہذیانی انداز میں جابر کے روکنے کے باوجود جھونپڑی سے باہر بھاگ گئی۔ جب جابر نے سرنگا کو جگا کر یہ وحشت اثر خبر سُنائی تو وہ بھی بدحواس ہوگیا۔ اُس نے جیب سے مُورتی نکال کر کوئی منتر پڑھا۔ وہاں ایک عورت نمودار ہوئی۔ سرنگا نے اُس کے پاؤں چھُو کر کچھ کہا۔ عورت نے اُس کا جواب دیا۔ یہ زبان جابر کی سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر عورت حیرت انگیز طور پر غائب ہوگئی اور سرنگا حیران و سراسیمہ جابر سے شدید اصرار کرنے لگا کہ وہ اُسے اُس سُرنگ تک لے چلے جہاں وہ کل رات گیا تھا۔

جابر آسانی سے تیار ہو گیا۔ فلورا کو تنہا چھوڑ کر رات کے وقت ایسے پُر اسرار حالات اور پُر خطر جنگل میں ژولین کے غار تک پہنچنا کسی مہم سے کم نہ تھا۔ انھوں نے بڑی چابک دستی سے دونوں پہرے داروں کو ہلاک کیا اور فلورا پر ایک الوداعی نظر ڈال کر بے تحاشا بھاگتے ہوئے وسیع اور گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ وہاں جا کر اُنھیں احساس ہوا کہ اس تاریک جنگل میں آگے بڑھنا اور غار تلاش کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے وہ رات کو جنگل کے کنارے میلی قطار کے درختوں پر چڑھ گئے۔ سورج طلوع ہونے کے بعد انھوں نے اپنا سفر پھر شروع کیا مگر تلاشِ بسیار کے باوجود انھیں وہ غار نہیں ملا۔ چنانچہ وہ ساحل کی طرف چلے۔ بہت دنوں بعد انھوں نے کھلے آسمان کے نیچے غسل کیا اور دوسری سمت سے جنگل میں دوبارہ داخل ہوئے۔ اس بار بھی انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور جب وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے تھے تو انھیں اچانک کچھ پُراسرار نسوانی قہقہے سنائی دیے۔ وہ دونوں سراسیمہ ہو کر اس خوب صورت آواز کی سمت تلاش کرنے لگے۔ پھر جابر نے سرنگا سے واپسی کے لیے اصرار کیا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، اس نے سرنگا کا جسم پتھر کے بے جان مجسمے میں تبدیل ہوا دیکھا۔ اِدھر سرنگا کا بُت تھا، اُدھر پُر اسرار نسوانی قہقہے۔ دوسری طرف تعاقب میں آنے والے حبشیوں کی پُر شور آوازیں۔ جابر دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگا اور ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر نشیب میں گر گیا اور گرتا چلا گیا۔ وہ ایک غار تھا۔ اس غار میں جزیرۂ توری کا کاہنِ اعظم سمورال سکونت پزیر تھا۔ سمورال اُسے اپنی عبادت گاہ میں لے گیا۔ وہاں کا سارا منظر بڑی تھا۔ دیواروں پر ایستادہ کھوپڑیاں، پنجر، کالے علم اور جادو کے کام آنے والی چیزیں، ایک کرجھاؤ، جارا کا کا کی مقدس کھوپڑیاں اور مالائیں وغیرہ۔ سمورال سیاہ جسم کا ایک تنومند حبشی تھا۔ اس نے جابر کو پناہ دی اور اس نے میرے ساتھ جزیرۂ توری کی تمام دُشمن آبادی سے مختلف سلوک کیا۔ کاہنِ اعظم کی حیثیت اس علاقے میں قابلا کے بعد سب سے زیادہ مقدس و محترم تھی۔ اور یہی ایسی جگہ تھی جہاں جابر بن یوسف الباقر کو حوادث سے نجات مل سکتی تھی۔ جابر نے سمورال، اس کی نوجوان لڑکی ترام اور اس کے بیٹے جبرال کے دل میں گھر کرنے کے لیے مہذب دنیا کی تمام خوش اخلاقی کے مظاہرے کیے۔ جابر نے ان کی چیزیں سنواریں، کھانے پکائے۔ اور ترام کے اجنبی بدن کو جذبات کا شعور بخشا۔ اس نے ان تینوں کو ضبطِ نفس کی حیرت انگیز مشقیں کرتے دیکھا، ان کی عبادتیں دیکھیں۔ اور کڑھاؤ کے تیل میں اپنے ساتھیوں کی حالتِ زار کا منظر دیکھا۔ اسے معلوم ہوا کہ سریتا کو کالاری نے اغوا کیا ہے اور سرنگا خود کو جنگل میں چھپائے ہوئے ہے۔ دونوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ جابر چوالیس دن تک اس غار میں چھپا رہا اور ترام سے کسی قدر ــ کسی قدر قریب آ گیا۔ کاہنِ اعظم کے دونوں بچے اس سے مانوس ہو گئے مگر غار کے شب و روز کی یکسانیت سے اس کا دل اُکتا گیا تھا۔ اس نے کئی بار کاہنِ اعظم سے باہر جانے کی اجازت طلب کی مگر کاہنِ اعظم نے ہر بار انکار کر دیا۔ آخر ایک دن جب سمورال اقابلا کی طلبی پر دو دن کے لیے اُس کی بارگاہ میں گیا ہوا تھا تو جابر وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس دوران میں جارا کا کا کی کھوپڑی سے کام لینے کے بہت سے طریقے اسے معلوم ہو چکے تھے چنانچہ وہ بے خوف و خطر ایک حبشی کی مدد سے کالاری کی جھونپڑی میں جا پہنچا۔ سریتا برہنہ حالت میں وہاں نڈھال پڑی تھی اور دو حبشی لڑکیاں اس کی نگرانی پر مامور تھیں۔ جارا کا کا کی کھوپڑی دیکھ کر وہ دونوں لڑکیاں پیچھے ہٹ گئیں، اور جابر نے سریتا سے فرار ہونے کے لیے اصرار کیا۔ اسی اثنا میں کالاری شیر کی طرح وہاں آ گیا اور اس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر جابر کو زیر کر دیا۔ کالاری شدید طیش کے عالم میں تھا۔ وہ سریتا پر جھپٹ پڑا لیکن جابر نے اسے اس وحشیانہ اقدام سے باز رکھنا چاہا۔ ان دونوں میں کوئی فیصلہ یقیناً ہوتا اور یہی کہ جابر کا کام تمام ہو جاتا مگر اچانک سرنگا کی دیوی نمودار ہوئی اور اُس نے کالاری کو سریتا کے پاس سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ دیوی کی آمد پر کالاری اور مشتعل ہو گیا۔ اس نے اپنے درندوں کو مدد کے لیے پکارا اور زمین پر گھٹنوں کے بل گر کر کوئی جادوئی عمل کیا۔ سیاہ فذات کی ایک آندھی دیوی کے سر پر منڈلانے لگی لیکن دیوی پُرسکون رہی۔ کالاری چیختا چنگھاڑتا پھرنے لگا۔ جابر نے اسے دیوی میں اُلجھے دیکھ کر اس کے گلے میں پڑی ہوئی جارا کا کا کی کھوپڑی کھینچ لی۔ جابر کے اس اچانک اقدام پر کالاری بدحواس ہو گیا اور جابر نے کمال پھرتی سے ایک حبشی کا نیزا کھینچ کر کالاری کے سینے میں گھونپ دیا۔ وہ تڑپ کر مر گیا۔ دیوی غائب ہو گئی۔ کالاری کا بندر اُچک کر جابر کے کاندھے پر چڑھ بیٹھا۔ جابر نے سریتا کو اپنی پیٹھ پر لادا اور بے تکان اُلٹے پاؤں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ حبشی شور مچاتے ہوئے جابر کا تعاقب کر رہے تھے۔

پیچھے حبشیوں کا ہجوم اور کالاری کا بندر کا ہو عجیب و غریب آوازوں سے اسے خوف زدہ کر رہے تھے مگر جابر برہنہ ہندی دوشیزہ سریتا کو پشت پر لادے بے تکان بھاگتا رہا اور آخر سمورال کی اقامت گاہ تک پہنچ گیا۔ تعاقب کرنے والے حبشی غار کے دہانے پر رہ گئے۔ وہ سریتا کو جزیرۂ توری کے سب سے محفوظ مقام پر لے آیا تھا لیکن جب کاہنِ اعظم کی لڑکی ترام نے اس سے اچانک غائب ہو جانے پر بازپُرس کی اور اس کے ساتھ سریتا کی موجودگی خشمگیں نگاہوں سے دیکھی تو جابر کو اُسے سمجھانے میں بڑی مشکل پیش آئی۔ ترام ایک سیدھی سادی اور صاف دل لڑکی تھی۔ وہ جابر کی گرم نگاہوں سے پگھل کر رہ گئی اور پوری رات جابر نے ترام کے پہلو میں بسر کی۔ قریب تھا کہ ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے اور وہ دونوں جذبات میں بہہ جاتے کہ اچانک جزیرۂ توری کے دوسرے بڑے آدمی کاہنِ اعظم سمورال کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ ترام مچھلی کی طرح تڑپ کر جابر سے علیحدہ ہو گئی۔ جابر سمورال کے سامنے کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا مگر سمورال اس کی دہشت نظر انداز کر کے اسے اپنی عبادت گاہ میں لے گیا اور ایک حیرت انگیز انکشاف کیا کہ چونکہ جابر نے غیر متوقع طور پر کالاری پر فتح پائی ہے، اس لیے روایت کے مطابق کالاری کا منصب جابر کو سونپ دیا جائے گا۔ یہ انکشاف سن کر جابر دنگ رہ گیا۔ اُسے سمورال کی صحیح الدماغی پر شبہ ہوا۔ یہ اعزاز قبیلے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی اجنبی کو نصیب ہوا تھا۔ سمورال نے کہا کہ سرداری کے لیے اُسے ابھی کچھ اور امتحانوں سے گزرنا ہو گا۔ اس کا لہجہ بدل گیا تھا، انداز میں شفقت اور نرمی آ گئی تھی۔ اُس نے جابر کو کچھ دُور رس نصیحتیں کیں اور سرداری کے نشیب و فراز سمجھائے۔ جابر نے سمورال کو پہلی مرتبہ نرم دیکھ کر سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر ترام کو اُس سے مانگ لیا۔ کچھ جھجک کے بعد کاہنِ اعظم نے یہ درخواست قبول کر لی اور ترام ایک عجیب و غریب تقریب میں جابر کے سپرد کر دی گئی۔ سریتا یہ سب ہنگامے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جابر سرشاری و بیخودی اور تہذیب و تربیت کا ایک ہفتہ گزارنے کے بعد سمورال کا مسکن چھوڑ کر ترام کے ساتھ شاہانہ انداز میں باہر نکلا۔ ابھی تک ایک اژدہام غار کے دہانے پر اس کا منتظر تھا۔ اسے جلوس کی صورت میں کالاری کی جھونپڑی تک لے جایا گیا اور درندوں کے خون میں نہلا کر برہنہ کر دیا گیا۔ مسلسل تین روز تک سرداری کا عظیم الشان جشن منایا گیا۔ قبیلے کی عورتوں نے اُس کے برہنہ جسم کے بوسے لیے۔ سمورال ان تقریبات میں جابر کی رہنمائی کرتا رہا تھا۔ ایک بوڑھا شخص لابلش کالاری کے بعد اب جابر کا نائب تھا۔ اس نے اور سمورال نے اُسے جزیرۂ توری کے دوسرے سردار شوالا کی طرف سے باخبر رہنے کی ہدایت کی۔ پھر اُسے یہ معلوم ہوا کہ بوڑھا سرنگا شوالا کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کی لڑکی سریتا کو کاہنِ اعظم نے اُس کے حوالے کر دیا ہے اور وہ اب شوالا کے تصرف میں ہے۔ فلورا کے بعد شوالا نے یہ اُسے دوسری چوٹ دی تھی۔ جذباتی جابر بن یوسف شوالا سے اپنی محبوبہ فلورا اور سریتا کی بازیافت کے لیے منصوبے بنانے لگا۔ لابلش نے اُس سے صبر و تحمل کی درخواست کی۔ شوالا ایک طاقت ور، تجربے کار اور سیاہ علوم کا ماہر سردار تھا۔ جابر نے ایک دن اُسے اپنی حدود میں مدعو کیا اور نہایت متانت سے فلورا کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ شوالا اس بات پر برہم ہو گیا۔ اُس نے فلورا کو واپس کرنے سے انکار کر دیا اور سخت اشتعال کے عالم میں رخصت ہو گیا۔ ترام بے چینی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ جابر سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر جب اُس نے زبان کھولی تو اچانک شدید تکلیف اور درد سے تڑپنے لگی۔ جابر طبی امداد کے لیے دوسرے کمرے میں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہاں ژولین کھڑی تھی اور اسے فوراً اقابلا کی بارگاہ میں چلنے کا حکم دے رہی تھی۔

اقابلا کے نادیدہ حسن و جمال اور آزمودہ جاہ و جلال سے جابر زبردست ہیجانی کیفیات میں مبتلا تھا۔ اسے معلوم نہیں کہ یہ پُرہول سفر کس طرح طے ہوا۔ ژرولین لے ایک غار نما ماکل مں کی ا مد آرائش زمانۂ قدیم کے شاہی محلات سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ یہاں بے شمار شمشاد قد دوشیزاؤں نے جھک کر ژرولین کا خیر مقدم کیا۔ یہاں کی ہر چیز تصور ا سے بڑھ کر ... اور ... ماحول کی شگفتگی نے جابر کے دل سے ڈراؤنے وسوسے کسی حد تک کم کر دیے۔ مختلف راہداریوں، ایوانوں اور عجائبات سے گزار کر ژرولین اسے اقابلا کے قصر میں پہنچا رخصت ہو گئی۔ قصر کی طلائی دیواروں سے یکایک گھنٹیوں کی نہایت دلکش موسیقی نشر ہونے لگی اور ساتھ ہی ایک سحر انگیز نسوانی آواز نے بڑے دبدبے سے جابر کو مخاطب کیا مگر جابر نے ا طلسمی آواز سے متاثر ہونے کے باوجود ذہانت، ہوش و حواس اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہی اوصاف اس کی کامرانی اور فتح مندی کا باعث تھے۔ اس نے نہایت تعظیم اور جرأت کے ساتھ اس پُر اسرار سمت سے گونجتی ہوئی آواز کو لبیک کہا اور اپنی گزارشات کے جواب میں اس کی طرف سے حوصلہ افزا کلمات سن کر اقابلا کے دیدار کا اشتیاق ظاہر کر دیا۔ اسی وقت نرم و گدا فرش سے ایک سنگی میز سنہرا جگ اور پیالے کر نمودار ہوئی اور جابر نے آواز کی ہدایت کے مطابق جگ میں بھرا ہوا نفیس، خوشبو دار اور خوش ذائقہ مشروب پیالے میں انڈیل کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ دفعتاً نور کے ایک ہالے سے جابر کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ اس نے اپنی بصارت زائل ہوتی ہوئی محسوس کی۔ اب عظمت و جلال کی پیکر اقابلا کا نادر جلوہ اس کی نگاہوں کے عین مقابل تھا۔ جابر نے محسوس کیا کہ اقابلا کے نورانی وجود کی بے پناہ دلکشی اور مقناطیسی کشش کے اظہار کے لیے عربی جیسی پُرمایہ زبان بھی بے رنگ اور کم مایہ ہے۔ جابر نے بیداری کے عالم میں اپنے شانے اور بالوں بھرے سینے میں اقابلا کا لطیف لمس ایک رنگین خواب کی طرح محسوس کیا۔ وہ انتہائی سرشار و مسرور ہونے کے باوجود اقابلا کی بارگاہ کے آداب سے غافل نہیں تھا۔ اقابلا نے اسے براہِ راست تخاطب کی سعادت نہیں بخشی۔ دوشیزہ اشمارہ اقابلا کی نائب اور ترجمان تھی۔ اس نے جابر کو اچانک طلبی کی وجوہ بتاتے ہوئے تاریک برِ اعظم کے قوانین پر روشنی ڈالی اور شوالا کے سلسلے میں اس کی حدود سے تجاوز کرنے پر تنبیہہ و تہدید کی۔ جابر نے بڑی تعظیم سے شروع سے آخر تک جزیرۂ توری کے علاقے میں اس پر کیے جانے والے مظالم کی دردناک روداد سنائی، اور فلورا کے معاملے میں شوالا کے غاصبانہ رویّے کی نشان دہی کی۔ اقابلا جابر کی شستہ گفتگو اور منطقی استدلال سے محظوظ ہوئی اور اس کی طرف سے اشمارہ نے یہ اعلان کیا کہ جابر اور شوالا کے درمیان ایک مقابلہ منعقد کیا جائے گا اور اس مقابلے میں جو فریق فتح مند ٹھہرے گا اسے شکست خوردہ حریف سے اس کے تصرف کی کوئی بھی چیز طلب کرنے کا حق ہوگا۔ جابر کو مقابلے کی یہ تجویز خندہ پیشانی سے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ یہ اقابلا کا حکم تھا۔ اس نے محض جسمانی طاقت تک مقابلہ محدود رکھنے کی گزارش کی کیونکہ شوالا کچھ کالی طاقتوں کا بھی مالک تھا جن سے جابر محروم تھا۔ یہ درخواست کچھ پس و پیش کے بعد قبول کر لی گئی۔

غنودگی اور بے خبری کے عالم میں اقابلا کے قصر سے واپسی کے بعد جابر کئی دن تک انہی مسحور کن تصورات میں غرق رہا اور اس نے طے کر لیا کہ وہ کسی طرح بھی اقابلا کا قرب ضرور حاصل کرے گا حالانکہ یہ ایک مشکل کام تھا۔ مقابلے سے پہلے ایک روز رات گئے اچانک بوڑھا سرنگا بپھرے ہوئے جابر سے آملا۔ جابر کو کاہنِ اعظم اور ابالیش کی تنبیہات کے پیشِ نظر سرنگا کی طرف سے چوکنا رہنا تھا مگر اس نے سرنگا کی مخلصانہ اور دوستانہ باتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے ہاں ٹھہرا لیا۔

اقابلا کے حکم پر کاہنِ اعظم نے جابر اور شوالا کے سنسنی خیز مقابلے کا نہایت غیر جانب داری اور احتیاط سے انتظام کیا۔ مقابلے کے روز ایک بڑے میدان میں دونوں فریق اور ان کے قبیلوں کے افراد کا پُرشور اژدہام تھا۔ یہ جزیرۂ توری کا ایک یادگار دن تھا۔ ایک بلند اور ممتاز مقام پر اقابلا اپنے تمام کر و فر اور جاہ و جلال کے ساتھ رونق افروز ہو گئی۔ اس کا بدن سبز پتوں میں ڈھکا ہوا تھا صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ کاہنِ اعظم سموراں ایک طرف مؤدب کھڑا تھا۔ دونوں قبیلوں کے لوگ اشتیاق اور تذبذب میں ایک اہم اور دلچسپ فیصلے کے منتظر تھے۔ سرنگا بار بار اپنی مورتی نکال کر چوم رہا تھا۔ شوالا نے مقابلے سے پہلے جابر کو مرعوب کرنے کے لیے اپنے خادموں کو نہایت بے دردی اور سفاکی سے قتل کر ڈالا۔ جابر نے بھی اسے سہمانے کے لیے کچھ نفسیاتی حربے استعمال کیے۔ ایک عجیب ہیجان سا دونوں طرف طاری تھا۔

حسن و جمال کی ملکہ اقابلا نے ہاتھ کی جنبش سے اعلانِ جنگ کیا تو شوالا کسی خونخوار درندے کے مانند مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پر تولنے لگا۔ اسے شاید اقابلا کا یہ فرمان گراں گزرا تھا کہ جنگ کے دوران میں فریقین محض جسمانی طاقتوں پر اکتفا کریں اور پُراسرار ماورائی طاقتوں کے استعمال سے گریز کریں۔ وہ اس فرمان کو جانب داری کا رنگ دے رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے سموراں سے بدزبانی بھی کی تھی مگر کاہنِ اعظم کے جلال کے آگے وہ چپ ہو گیا تھا۔ اس نے سموراں سے معافی بھی طلب کر لی تھی، اقابلا کا تنبیہی اشارہ شعلے کے روپ میں نمودار ہو کر شوالا کو یہ باور کرا گیا تھا کہ اس کی مزید حماقت ناقابلِ برداشت ہو گی مگر شوالا کی نگاہوں میں اضطراب تھا اور اس کا چہرہ قہر و غضب کی عکاسی کر رہا تھا۔

جسامت اور قد و قامت کے اعتبار سے میرا حریف بلاشبہ مجھ پر حاوی نظر آتا تھا۔ چنانچہ میں نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی اور اپنی جگہ قدم جما کر شوالا کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ میدان میں ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ دونوں قبیلوں کے افراد کی نظریں اپنے اپنے سرداروں پر جمی ہوئی تھیں۔ شوالا کچھ دیر تک بازو پھیلائے قہر و غضب سے مجھے گھورتا رہا اور اپنے حلق سے خرخر، خوں خوں کی آوازیں خارج کرتا رہا۔ پھر اچانک اس نے جست لگائی۔ میں پوری طرح تیار تھا۔

شوالا کے جست لگاتے ہی میں تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ نتیجہ ظاہر تھا، شوالا اپنی جھونک میں وار خالی جانے کی وجہ سے زمین پر گرا مگر پھر جس انداز میں اس نے بجلی کی سی تیزی سے قلابازی کھا کر خود کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا، وہ حیرت انگیز تھا، میں اس کی پھرتی اور تیزی دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اب وہ مجھے خوفناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے غالباً اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کس طریقے کی جنگ آزمائی کا ارادہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ دوسری بار اس نے وحشیانہ انداز میں جست لگانے کے بجائے آہستہ آہستہ کھسک کر مجھے گھیرنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ نظریں ایک دوسرے پر مرکوز تھیں اور دونوں ہی قدم جما جما کر آگے بڑھ رہے تھے۔ فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ خود تازہ دم رہ کر شوالا کو کسی طرح تھکانے لگا دوں لیکن میں نے شوالا کی ذہنی استعداد کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ ایک چالاک اور عیار شخص ثابت ہوا۔ وہ میرا ارادہ بھانپ گیا تھا اس لیے اس نے اچھل کود بند کر دی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جلد از جلد زیر کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ میرا ذہن تیزی سے وہ نفسیاتی حربے سوچ رہا تھا جو ایسے موقعوں پر عموماً آزمائے جاتے ہیں۔ شوالا نے بائیں جانب قدم اٹھاتے اٹھاتے اچانک دائیں جانب قدم اٹھایا۔ مجھے بھی اسی طرز پر اپنا رخ بدلنا پڑا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا رخ بدلتا، شوالا تیزی سے جھک کر اچھلا اور میرے اوپر آ گیا اور اس کی بھرپور لاتیں میرے سینے پر پڑیں تو میں الٹ گیا، میری نگاہوں کے سامنے اچانک اندھیرا پھیل گیا لیکن یہ وقت تکلیف محسوس کرنے کے بجائے اپنے بچاؤ کا تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے بائیں جانب دو تین کروٹیں لیں اور تیزی سے اٹھ گیا۔

شوالا کے قبیلے کے افراد اپنے سردار کے پہلے حملے کی کامیابی پر اچھل اچھل کر مسرّت کا اظہار کر رہے تھے۔ شوالا اب دوبارہ پینترا بدل کر میرے سامنے آ چکا تھا۔ بار بار وہ اپنا جسم دائیں بائیں جھٹک کر میری توجہ اور ثابت قدمی مجروح کرنے کی کوشش کر رہا تھا، میں پوری احتیاط سے اس کے جسم کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہا تھا۔ چند ثانیوں تک ہم دونوں ایک دوسرے پر حملے کے مواقع ڈھونڈتے رہے پھر اچانک میں تیزی سے آگے بڑھا، شوالا یہ جان کر کہ میں اس پر حملہ کر رہا ہوں، بجلی کی سی تیزی سے اچھل کر میری طرف آیا، مجھے اسی بات کا انتظار تھا، جیسے ہی شوالا نے جست لگائی میں نیچے جھک گیا، پھر اس پھرتی سے اٹھا کہ شوالا ہوا میں قلابازی کھا کر دوسری جانب جا پڑا۔ اس بار میرے قبیلے کے افراد نے خوشی سے چیخنا شروع کر دیا۔ میری ہمتیں جوان تھیں اور میری توجہ نعرہ ہائے تحسین سے زیادہ اپنے حریف کی سرکوبی کی طرف تھی۔ شوالا کو سر کے جھٹکے سے فضا میں اچھال کر میں تیزی سے پلٹا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے زمین سے اٹھنے سے پیشتر ہی داب لوں لیکن شوالا کے جسم میں بجلی بھری تھی۔ وہ زمین پر گرتے ہی یوں اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی پُراسرار قوت نے اسے پکڑ کر اٹھا دیا ہو۔ مجھے مجبوراً پینترا بدلنا پڑا۔ شوالا میرے حملے کی کامیابی پر اور زیادہ خوں خوار ہو گیا۔ اس کی وحشت اور دیوانگی میں اور اضافہ ہو گیا

"جابر!" شوالا کی ہانپتی ہوئی آواز گونجی "تم اپنی زندگی سے کب تک لڑو گے، شوالا ناقابلِ تسخیر ہے۔"

"انتظار کرو شوالا! اس کا فیصلہ ابھی ہوا جاتا ہے کہ آسمان کس کا منتظر ہے" میں نے ہٹتے ہوئے کہا۔

میرے جواب نے اسے اور غضبناک کر دیا، اس سے پیشتر کہ میں اور کچھ کہتا، اس نے جھکائی دے کر حملہ کیا اور اپنی جھونک میں مجھے زمین پر گرا دیا، وہ حملہ اسقدر شدید تھا کہ میرے قدم اکھڑ گئے۔ پھر شوالا نے مٹھی باندھ کر ایک بھرپور ضرب میرے پیٹ پر لگائی میری آنکھوں میں شعلے رقص کرنے لگے اور جب دوسرا گھونسا میری گُدّی پر لگا تو میں چکرا گیا۔ شوالا نے دو حملوں کے بعد اکڑوں بیٹھ کر میرے اوپر سوار ہونے کی خطرناک کوشش کی، اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو میرے فرشتے بھی اس کا بھاری بھرکم جسم ہٹانے سے قاصر رہتے۔ میں نے اوسان بحال کرتے ہوئے تیزی سے ٹانگیں اٹھا کر پشت کی جانب قلابازی کھائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شوالا کو اس بار میرے بچ نکلنے کی امید نہیں تھی اس لیے وہ ایک پل کے لیے ششدر ہوا، اس ایک پل میں میں نے لپک کر ایک بھرپور مکا اس کے منہ پر مارا۔ اس کے سیاہ چہرے پر خون کی ایک پتلی سی لکیر پھوٹ نکلی، شوالا نے میرا دوسرا وار بچانے کی خاطر سر کے بل قلابازی کھائی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

ہم ایک بار پھر فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ شوالا کی ٹھوڑی خون آلود تھی۔ میں نے اسے غصہ دلانے کے لیے کہا۔ "شوالا کا اقبال بلند رہے۔ اسے اپنا خون صاف کرنے کے لیے کچھ دیر کی مُہلت دی جاتی ہے۔"

"یہ خون شوالا اب تیری کھال سے صاف کرے گا،" شوالا دانت پیس کر کسی زخمی تیندوے کی طرح دونوں ہاتھوں کا دائرہ وسیع کر کے آگے بڑھنے لگا۔

میں بہت محتاط انداز میں اس کی پیش قدمی کا جائزہ لے رہا تھا، شوالا نے حملہ کیا اور میں خوبصورتی سے بچا گیا۔ وہ غصے میں سر جھٹک کر پلٹ پڑا اس کے ہونٹوں سے رستا ہوا خون اب اس کے کشادہ سینے تک پہنچ چکا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دونوں طرف کے افراد دم بخود کھڑے اس خونیں جنگ کا انجام دیکھنے کے منتظر تھے۔ شوالا پھر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا پھر اچانک اس نے ایسا حربہ استعمال کیا جس کی کم از کم مجھے توقع نہ تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے اس نے دفعتہً زمین سے مٹی اُٹھائی اور اسے میری جانب پھینک دیا۔ میری آنکھیں درد و کرب سے بند ہونے لگیں، ٹھیک اسی لمحے شوالا کا وزنی جسم میرا توازن بگاڑ گیا۔ میں لڑکھڑا کر چاروں خانے چت گرا اور میرے کروٹ لینے یا دفاع کا کوئی اور طریقہ اختیار کرنے سے پہلے شوالا اچھل کر میرے پیٹ پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پلک جھپکتے میں اس طرح جکڑ کر اپنے گھٹنوں کے درمیان پھنسا لیے کہ میرا جنبش کرنا دشوار ہو گیا۔ موت کو اتنی جلد قبول کرنے پر میں آمادہ نہیں تھا مگر موت میرے قریب تھی اور جب موت کے قُرب کا اندازہ ہو جائے تو کوئی غیر معمولی توانائی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے پُورے جسم کی طاقت لگا کر ٹانگیں اُٹھا کر شوالا کا بوجھ ہٹانا چاہا لیکن مجھے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ شکست کا احساس میرے اعصاب جھنجوڑ گیا، مخالف قبیلے کے افراد نے خوشی سے ناچنا شروع کر دیا۔

"جابر!" شوالا سرد لہجے میں بولا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ تم غلطی کر رہے ہو۔ اب کیا خیال ہے؟ کہو تو ایک ہی وار میں تمھیں چیونٹی کی طرح مسل دیا جائے۔"

"مجھے تم سے اتنی پست حرکت کی توقع نہیں تھی۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ جزیرۂ توری کا ایک سردار اس قدر اوچھی اور رکیک حرکت کا مرتکب ہو گا۔ تم نے میری آنکھوں میں مٹی ڈال کر ایک طرح سے میری برتری تسلیم کر لی ہے۔" میں نے حقارت سے کہا۔

"اس جنگ میں سب جائز ہے،" شوالا نے زہرخند سے جواب دیا پھر کرخت آواز میں بولا۔ "اب تمھاری شکست یقینی ہے جابر! کاہنِ اعظم سمورال بھی تمھیں شوالا کے عتاب سے نہیں بچا سکتا۔ تم بہت دیر میں قابو میں آئے۔ کوئی اجنبی یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ تم نے تو بہت اچھے دن گزار لیے۔"

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بار شوالا کے شکنجے سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ گو اس نے مجھے زیر کرنے کے لیے ایک رکیک حرکت کی تھی لیکن میں مقابلے کی اس شق سے قطعاً واقف نہیں تھا کہ آزادانہ جنگ میں یہ حرکت بھی جائز سمجھی جا سکتی ہے؟ ورنہ میں خود بھی یہ طریقہ اختیار کرتا۔ ایک لمحے میں بہت سی باتیں میرے ذہن میں گھوم گئیں میں نے سوچا کیا میں ذلت و رسوائی کی موت مارا جاؤں گا؟ کیا جزیرۂ توری کی وہ روایت پوری ہو گئی جس کے مطابق یہ زمین اجنبیوں کو راس نہیں آتی؟ کیا میں اب آقابلا کے شرربار جلوے سے دست بردار ہو جاؤں؟ کیا آقابلا کے سامنے اس طرح میری توہین مقدر تھی؟ آہ جس ماہ وش نے مجھے اپنے حسنِ جہاں سوز کے نظارے سے نوازا تھا وہ میری موت کا یہ افسوسناک منظر بھی دیکھے گی۔ کیا کاہنِ اعظم سمورال اپنی دخترِ ترام کے لیے میری مدد کو نہیں آئے گا؟ شوالا میرے سینے پر چڑھا ہوا مسکرا رہا تھا اور میں اس کے بھاری جسم کے نیچے اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ میری تمام تمنائیں میرے سینے میں گھٹ رہی تھیں۔ ایک لمحہ، وہ جاں کنی کا اذیت ناک لمحہ۔ اس ایک لمحے میں ان گنت حسرتیں ابھریں اور معدوم ہو گئیں۔ میں نے ایک بار پھر پوری طاقت سے زور لگایا لیکن شوالا کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ میں کراہ کر رہ گیا۔ پھر میں نے سوچا۔ مقابلے کی رُو سے جب تک میں شکست کا اقرار زبانی طور پر نہیں کر لیتا، شوالا اسی طرح میرے سینے پر بیٹھا رہے گا اور میں اسے بیٹھا رہنے دوں گا لیکن جہاں اس نے پینترا بدلنے کی کوشش کی، میں اسے خود سے علیحدہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

"میں شوالا ہوں۔ میرا نام شوالا ہے۔ میں اس جزیرے کا

سب زندہ

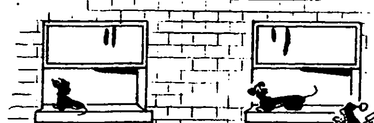
طاقت ور سردار ہوں۔ میری گرفت اتنی کمزور نہیں ہوتی۔ میرا شکار میرے ہاتھوں سے بچ کر کہیں نہیں جاتا۔" شوالا نے وحشت ناک لہجے میں کہا۔ "اب تم اپنی شکست تسلیم کرتے ہو یا اور سختی کرنا پڑے گی؟"

"شکست کا اعتراف بہادروں کا شیوہ ہے۔" اگر تم نے ایمان داری سے مجھے زیر کیا ہوتا تو میں بخوشی اپنی شکست تسلیم کرلیتا لیکن یاد رکھو میں اپنی آخری سانس تک تم سے مقابلہ جاری رکھوں گا" میں نے نفرت سے جواب دیا۔

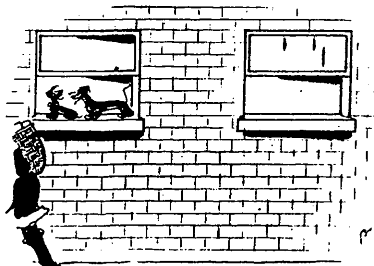
شوالا کا ردِعمل اور اذیت ناک ثابت ہوا۔ اس نے گھٹنوں کے بل اُٹھ کر اپنا وزن ایک جھٹکے سے نیچے گرایا۔ میں تکلیف کی شدت سے بلبلا اُٹھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا کلیجا حلق کے راستے باہر نکل پڑے گا۔ مجھے چہار سمت اندھیرا نظر آنے لگا۔ شوالا بار بار اپنا عمل دہرا رہا تھا، مجھے اپنا دل سینے کی گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ موت کا رُوح فرسا تصور سرد لہر کی صورت میرے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میری توقعات کے خلاف بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ شوالا ایک بار گھٹنے کے بل اُٹھا تو اس طرح اچھلتا ہوا میرے سر کی پشت سے دور جا گرا جیسے اسے کسی ماورائی طاقت نے اچھال کر زمین پر پھینک دیا ہو۔ یہ موقع میرے لیے غنیمت تھا۔ میں اسی لمحے کا منتظر تھا کب شوالا اٹھے اور کب میں اس کی طرف لپکوں۔ میں نے کھوئے ہوئے اوسان مجتمع کیے اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا، شوالا ابھی تک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت میرے اور شوالا کے درمیان زمین سے ایک شعلہ بلند ہوکر غائب ہوگیا۔ میں نے چونک کر آقا بلاکی طرف نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر جاہ و جلال برس رہا تھا۔ وہ اپنی مسند پر کھڑی ہوئی تھی، اس کا سارا بدن پتّوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اُف اس کی آنکھیں، وہ سُرخ آنکھیں میں ان کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے شعلے اُبل رہے تھے۔ پورے ماحول پر ہولناک سناٹا طاری ہوگیا۔

ابھی میں حالات کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ پورا میدان یوں لرز رہا تھا جیسے زلزلے کے جھٹکے لگ رہے ہوں۔ قبیلے کے دونوں طرف کے افراد زمیں بوس ہوگئے اور بار بار اپنے سرزمین پر









مارنے لگے۔ وہ اچانک پیدا ہونے والی اس خوفناک صورت کو آسمانی عتاب سمجھ کر دیوتاؤں کی خدمت میں سجدہ ریز ہو رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ کیا ہوا؟ پھر آسمان پر بجلی کا شدید کڑاکا ہوا اور بادلوں کی گرج سے پورا ماحول کانپ اٹھا۔ میں نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو لرزہ براندام ہو گیا۔ سیاہ ذرّات کا بھنور تیزی سے چکراتا ہوا نیچے کی سمت آ رہا تھا۔ یہ بھنور میں ایک مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ مقدس جارا کا کا کا عتاب تھا۔ مگر کس پر نازل ہونے والا تھا؟ میں سرتاپا لرز اٹھا۔ میری نظر سیاہ ذرّات کے بھنور پر جمی ہوئی تھی جس میں اب بار بار خوف ناک شعلے بھی نمودار ہو رہے تھے۔

آقابلا اور کاہنِ اعظم کی نظریں آسمان کی جانب تھیں، جہاں سیاہ ذرّات اور کوندنے والے شعلوں کی جنگ جاری تھی۔ پھر اچانک شعلے بھڑکنا بند ہو گئے۔ ذرّات کا بھنور خاصا نیچے آ گیا تھا۔ میرے دل میں ہول اُٹھ رہے تھے۔ آنے والے لمحات نہ جانے کس کے حق میں تباہی لانے والے تھے؟ سیاہ ذرّات کا بھنور نیچے آ چکا تھا۔ وہ آقابلا کی مسند کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ میں نے آقابلا کی گردن خم ہوتے دیکھی۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"اے جارا کا کا کی مقدس رُوح!" کاہنِ اعظم سوراں کی آواز بلند ہوئی۔ "آقابلا تیرے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتی ہے۔ تیرے احسانات بے شمار ہیں۔ تیری نوازشات انتہا ہیں۔ آقابلا اس سلطنت کی حکمراں کی حیثیت سے عہد کرتی ہے کہ ابد تک تیرے جلال کی اسی طرح پرستش ہوتی رہے گی۔ تیرا قیام آسمانوں میں ہے، آسمان جو تیری مِلک ہیں اور سارے احترام تیرے لیے واجب ہیں۔ کوتاہی کرنے والے تیری سزا کے مرتکب ہیں سب کچھ تیرا ہے کہ تو امین ہے۔"

آقابلا کا خوبصورت ہاتھ دراز ہوا اور کاہنِ اعظم خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی، جیسے آقابلا ریت کے ان ذرّات سے مخاطب ہو۔ اس کا بلند ہاتھ نیچے کی طرف گیا ہی تھا کہ سیاہ ذرّات کے بادل اُوپر کی جانب بلند ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ناقابلِ فہم منظر سامنے آ گیا۔ جس مقام سے ذرّات کی یلغار اوپر کی جانب بلند ہوئی تھی، وہاں اب شیشے کا ایک قدِ آدم جار نظر آ رہا تھا۔ اس جار میں ایک حسین عورت بند تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے سرنگا کی وہ مورتی یاد آ گئی جسے میں متعدد بار قریب سے دیکھ چکا تھا۔ عورت کی شکل ہوبہو مورتی سے ملتی جلتی تھی اور وہ ہندی لباس پہنے ہوئے تھی۔ جار کے اندر وہ بہت متوحش نظر آ رہی تھی۔ میں نے نظریں گھما کر دُور کھڑے ہوئے سرنگا کو دیکھا، اس کا چہرہ بوڑھا اور زرد ہو چکا تھا۔ یقیناً جار میں مقید عورت سرنگا کی وہ دیوی تھی جس کی مورتی وہ بڑی عقیدت سے اپنے پاس رکھتا تھا اور والہانہ انداز میں جس کا تذکرہ کرتا تھا۔ جارا کا کا کی مقدس رُوح نے اسے کیوں قید کر لیا تھا؟ اور آقابلا نے جنگ کیوں بند کر دی تھی؟ کیا وہ مجھے شکست خوردہ تسلیم کر چکی تھی؟ میرا ذہن عجیب عجیب اندیشوں میں گھر گیا۔ اسی وقت، سرنگا کی دلدوز چیخ نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ میں نے اسے آسمان کی جانب ہاتھ پھیلائے دیکھا۔ سیاہ ذرّات کا بھنور اب چکراتا ہوا دوبارہ نیچے آ رہا تھا، اس کا رُخ سرنگا کی جانب تھا۔

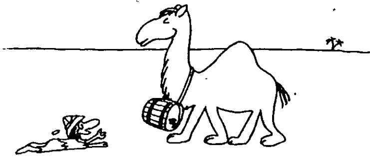
"نہیں نہیں" سرنگا ہذیانی انداز میں چیخا۔ "اے مقدس آقا، مجھے معاف کر دے۔ اپنے دوست کی مدد کرنا میرے مذہب میں داخل ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا، مجھے معاف کر دے اے مقدس رُوح! یہ بوڑھا تجھ سے ہاتھ پھیلائے درخواست گزار رہا ہے۔"

سرنگا کی چیخ پکار اور اس کی آہ و زاری سُن کر میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ جنگ بندی اور آسمانی عتاب کی کیا وجہ تھی۔ سرنگا کی مشکوک شخصیت بھی صاف ہو گئی۔ اس بوڑھے ہمدرد نے مجھے شوالا کے ہاتھوں زیر ہوتا دیکھ کر اپنی دیوی کے ذریعے میری مدد کرنا چاہی تھی اور یہ دیوی ہی کی طاقت کا کرشمہ تھا کہ اس نے شوالا سے مجھے نجات دلائی لیکن اعلان کے مطابق اس جنگ میں ماورائی طاقتوں کا استعمال ممنوع تھا۔ ظاہر ہے، آقابلا کو یہ مداخلت پسند نہیں تھی۔ اس کے اشارے پر جارا کا کا کی رُوح نے دیوی کو جار میں مقید کر دیا تھا۔ ساری گتھیاں سُلجھ چکی تھیں۔

سرنگا بے تحاشا چیخ رہا تھا لیکن سیاہ ذرّات کا بھنور مسلسل اس کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ پھر سرنگا نے خود کو اس آفت سے بچانے کے لیے کھلے میدان میں پاگلوں کی طرح دوڑنا شروع کر دیا۔ قبیلے کے تمام افراد موت و زندگی کی یہ آنکھ مچولی انگشت بدنداں دیکھ رہے تھے۔ سرنگا اپنی پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا اور سیاہ ذرّات کا بھنور اس کے تعاقب میں تھا۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ ایک جگہ سرنگا لڑکھڑا کر گرا تو سیاہ ذرّات کے بھنور نے ایک آن میں اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرنگا نرغے میں آ چکا تھا۔ اور اس پر وہ مصیبت میری خاطر نازل ہوئی تھی، میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ صرف اسے دیکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ سیاہ ذرّات کا یہ لشکر سرنگا کو اپنے ساتھ اُڑا لے جائے گا اور میں سرنگا کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ میری نظروں کے سامنے سیاہی کے وہ خوفناک بادل تھے جو سرنگا کو اپنے دائرے میں لے کر ادھر اُدھر پھیل جاتے تھے۔ پھر جب وہ طوفانِ بلاخیز اُوپر کی جانب بلند ہوا اور آناً فاناً نظروں سے دُور ہو گیا تو میرے دل کے نہاں خانے میں اُمید کی ایک شمع روشن ہوئی۔ سرنگا زمین پر بے سُدھ پڑا ہوا تھا لیکن اس کی جلد کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا اور پورے جسم پر جگہ جگہ بڑے بڑے آبلے نظر آ رہے تھے۔ سرتیا اب تک دم بخود کھڑی تھی۔ وہ چیختی ہوئی بھاگی اور سرنگا کے جسم سے لپٹ کر تڑپنے لگی۔ میرا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر سرنگا کو دیکھوں کہ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے؟ اور سرتیا کی دل جوئی کروں جس کی فلک شگاف چیخیں دل دہلائے دے رہی تھیں لیکن اس وقت شوالا کے سامنے سے ہٹنے کا کوئی موقع نہیں تھا، میری یہ حرکت نہ جانے کس نگاہ سے دیکھی جاتی میں ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ننگ دھڑنگ حبشی آگے بڑھے اور انھوں نے سرنگا اور سرتیا دونوں کو اُٹھا کر آقابلا کے قدموں میں ڈال دیا۔ سرتیا نے اب شور کرنا بند کر دیا تھا۔ شاید آقابلا کے رعب اور دبدبے نے اسے مرعوب کر دیا تھا یا خوف و دہشت نے اسے سکتے کی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا۔

اس ہولناک سناٹے میں کاہنِ اعظم کی گرج دار آواز اُبھری۔





"جزیرۂ توری کے لوگو!" کاہنِ اعظم نے مقدس آقابلا کا اشارہ پا کر بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔ "مقدس اور عظیم آقابلا کی حکمرانی تا ابد تم پر قائم رہے، مقدس جارا کا تمھیں اپنے حفظ و امان میں رکھتے، قبیلے کے دو معزز سرداروں کی جنگ کیوں روکی گئی تھی، یہ نکتہ تم پر منکشف ہو چکا ہے۔ اب میں مقدس آقابلا کے حکم سے دونوں سرداروں کو دوبارہ جنگ شروع کرنے کی ہدایت کرتا ہوں۔"

"کاہنِ اعظم۔ اے عظیم سموراں!" شوالا نے اپنی جگہ سے بلند آواز میں کہا۔ "اگر میری فریاد مقدس آقابلا کی شان میں گستاخی نہ سمجھی جائے تو مجھے کہنے دیا جائے کہ میں اس جنگ میں اپنی برتری ثابت کر چکا ہوں۔ مقدس آقابلا نے خود اس جنگ کا مشاہدہ کیا ہے۔ میری درخواست ہے کہ اب فیصلہ کر دیا جائے کہ کس نے کس پر برتری حاصل کی۔ میں یہ درخواست اس بنیاد پر کر رہا ہوں کہ سرنگا کی دیوی نے مداخلت بعد میں کی تھی، میں جابر بن یوسف کو اس سے پیشتر ہی بے بس کر چکا تھا۔ اگر دیوی نے مداخلت نہ کی ہوتی تو میں اپنے حریف کو شکست تسلیم کرنے پر آسانی سے مجبور کر سکتا تھا۔ بہر حال مقدس آقابلا کا فیصلہ قانون کا درجہ رکھتا ہے۔"

سموراں نے آقابلا کی طرف دیکھا۔ آقابلا نے ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا پھر سموراں نے شوالا کو مخاطب کیا۔ "شوالا! اس جنگ میں یہ شرط بھی ہے کہ حریف جب تک اپنی شکست کا اقرار نہ کر لے یا اس میں جواب دینے کی سکت ختم نہ ہو جائے، اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا۔"

سموراں کا جواب سن کر میرے عزائم میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ مجھے خدشہ تھا کہ چونکہ شوالا کا احتجاج کسی حد تک حق بجانب ہے اس لیے وہ مقدس آقابلا کو میرے خلاف فیصلہ کرنے پر نہ مجبور کر دے۔ لیکن مقابلے کی ایک نازک شرط کی وجہ سے مجھے رعایت مل گئی۔ یہ آخری موقع تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ آقابلا کی جانب سے یہ دوسری عنایت تھی۔ مجھے یہ عنایت تازہ دم کر گئی۔ میں نے شوالا کو دیکھا۔ وہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میرے لیے اب محتاط رہنا ضروری تھا۔ ویسے ایک بار موت کے منہ سے نکلنے کے بعد اب مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ قسمت مجھ پر مہربان ہے اور جنگ کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ پھر بھی میں پوری طرح محتاط تھا۔ شوالا نے جب دوسری بار حملہ کیا تو میں نے اچھل کر ایک جانب ہٹتے ہوئے پاؤں سے لنگی لگائی۔ شوالا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں نے حیرت انگیز برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جست بھری اور شوالا کی پشت پر پوری قوت سے اچھل کر نیچے گرا۔ شوالا کی ہڈیاں چٹخ گئیں۔ وہ کربناک آواز میں چلایا۔ میں نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا اور پے در پے اس کی گدی پر گھونسے رسید کیے۔ پھر ایک خطرناک خیال کے پیش نظر میں نے شوالا کا سیدھا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر اچانک اتنی شدت سے جھٹکے مارے کہ کہنی کے پاس کا جوڑ ٹوٹ گیا۔ شوالا کے حلق سے نکلنے والی بھیانک چیخوں سے سارا میدان گونج رہا تھا۔ پھر میں نے اس کا سیدھا ہاتھ چھوڑ کر الٹا ہاتھ پکڑ لیا لیکن اس بار میں اسے گرفت میں نہیں لے سکا کیونکہ شوالا دہاڑتا ہوا نیچے سے تڑپا تو اس کا ہاتھ میرے قابو میں نہ رہ سکا۔ توازن کا بگڑنا تھا کہ دوسرے جھٹکے میں شوالا نے مجھے دوسری طرف پھینک دیا۔ میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی لیکن اتنی دیر میں شوالا بھی اٹھ چکا تھا۔ اس کا چہرہ غضبناک ہو رہا تھا۔ سیدھا ہاتھ کہنی کے پاس سے جھول رہا تھا لیکن اشتعال کی شدت نے درد کی تکلیف ابھرنے نہیں دی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے خون ہی خون نظر آرہا تھا۔

"جابر!" وہ اکھڑی اکھڑی آواز میں بولا۔ "شوالا کی زبان شکست کا اقرار کرنا نہیں جانتی۔ تم میری زندگی میں مجھے زیر نہ دیکھ سکو گے۔ میرا ایک ہاتھ بھی تمھاری موت کا سبب بن سکتا ہے۔"

"تمھارا یہ فیصلہ دانشمندی کے منافی ہے۔" میں نے احترام سے اسے مخاطب کیا۔ "اے معزز شوالا! بازی الٹ چکی ہے۔ میری طاقت کا اندازہ تم نے کر لیا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے بچے کھچے جسم پر قناعت کرو اور شکست تسلیم کر لو۔"

"شکست" شوالا نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا۔ "شکست؟ جابر بن یوسف! سنو میں دل سے کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کروں گا میرے ساتھ میرے لوگ نہیں ہیں۔ تمھیں رعایت دی گئی ہے۔ تمھیں عظیم طاقتوں نے نوازنے کی کوشش کی ہے۔ شوالا کی نظریں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ میری بستی میں تمھاری طاقت کو دخل نہیں ہے۔"

"تم اس وقت شدید تکلیف سے دوچار ہو شوالا!" میں نے دانستہ ہمدردی کا اظہار کیا۔ "موجودہ کیفیت میں مقابلہ جاری رکھنا تمھارے لیے مناسب نہ ہوگا۔ تم اگر چاہو تو میں مقدس آقابلا کے حضور یہ درخواست کرنے پر آمادہ ہوں کہ تمھاری صحت مندی تک مقابلہ ملتوی کر دیا جائے۔"

"شوالا اس رعایت پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ سنبھلو جابر! میں عذاب ہوں، میں قہر ہوں۔" شوالا نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا، پھر آندھی اور طوفان کی طرح لپکتا ہوا میری جانب جھپٹا۔ میں اپنی جگہ پوری طرح مستعد تھا۔ شوالا نے جیسے ہی قریب آکر حملہ کیا میں نے زمین پر بیٹھ کر تمام تر چابکدستی سے اس کا الٹا ہاتھ تھاما اور قلابازی کھا گیا۔ میرے ساتھ ہی شوالا بھی ربر کی گیند کی طرح فضا میں دائرے کی صورت میں گھوم کر چاروں خانے چت گر گیا اور بلبلانے لگا۔ میرے قبیلے کے افراد خوشی سے ناچنے لگے مگر دشمن کو حقیر سمجھنا غلط تھا اس لیے میں نے احتیاطاً دوبارہ حملہ کیا۔ شوالا پر دوبارہ قابو پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ زمین پر تڑپ رہا تھا۔ کاہن اعظم نے مجھے روک دیا اور آقابلا کی مسند کے قریب سے شوالا کے پاس آیا، اسے غور سے دیکھا اور پھر آقابلا کے پاس جا کر کچھ کہا۔ مجمع

میں اس کی آواز گونجی۔

"جابر بن یوسف! مقدس آقابلا کے فیصلے کے مطابق تمھیں فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ مقدس آقابلا کی ہمدردیاں عظیم شوالا کے ساتھ ہیں۔"

کاہنِ اعظم کا اعلان سُن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے دوبارہ زندگی پائی ہو۔ میرا سینہ فخر سے تن گیا۔ میں نے تشکر کے جذبات سے طاقت کی عظیم دوشیزہ آقابلا کی جانب دیکھا۔ وہ اپنی مسند پر بڑے پرسکون انداز میں جلوہ افروز تھی۔ اس کا چہرہ چونکہ پتوں سے ڈھکا ہوا تھا اس لیے میں اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ ہاں اس کی آنکھیں، وہ قیامت آنکھیں، ایک طرح کی مسرت ظاہر کر رہی تھیں۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی اور مجھے اپنے لیے جذبے تلاش کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی۔ شوالا زمین پر بے سُدھ پڑا تھا، اس کے نائب نے قریب جا کر اسے اُٹھایا اور اس کی شکست کی اطلاع دی۔ وہ چیخنے لگا۔ اس نے احتجاج کے طور پر کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے زخمی ہاتھ میں شدّت کی تکلیف ہے۔ کاہنِ اعظم نے میرے قبیلے کے اُچھلتے ناچتے، غل غپاڑا کرتے ہوئے افراد کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی تاکید کی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "جابر بن یوسف الباقر! اس مقابلے میں فتح یاب ہونے کے بعد تم جزیرۂ توری کے ایک برتر سردار کی حیثیت سے تسلیم کر لیے گئے ہو۔ اعلان کے مطابق اب تم شکست خوردہ سردار سے اپنی پسند کی کوئی بھی چیز طلب کرنے کا حق رکھتے ہو۔"

"اے عظیم کاہن! مقدس آقابلا کا غلام صرف اُس کی قربت کا طلب گار ہے، اس کی خوشنودی کا جویا ہے۔" میں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آقابلا کی طرف گھومتے ہوئے انتہائی ادب و احترام سے کہنا شروع کیا۔ "میں اس عنایت کا شکر گزار ہوں کہ مقدس آقابلا نے مجھے شکست خوردہ سردار سے اپنی پسند کی کوئی شے طلب کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اگر عظیم ملکہ کے نازک احساسات پر یہ گزارش بارِ نہ گزرے تو میں عرض کروں کہ ایک فاتح کی سب سے بڑی مسرت اس کی فتح ہے۔ شکست خوردہ سردار سے کچھ طلب کرتے ہوئے مجھے ایک بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ میرے لیے یہی انعام بہت ہے کہ میں اس سلطنت کے ایک جزیرے میں برتر سردار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہوں۔ ایک اجنبی کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی۔" یہ کہہ کر میں نے آقابلا کی طرف دیکھا۔ میرا جواب سن کر اس کی خوبصورت آنکھوں کی پتلیاں متحرک ہوئیں اور کاہنِ اعظم نے اس کا اشارہ پا کر دوبارہ گردن ہلائی، پھر میری طرف نظر اٹھا کر مخاطب ہوا۔ "جابر بن یوسف! مقدس آقابلا کو تمھارے جواب نے متاثر کیا ہے۔ تم نے اعلا ظرفی اور شجاعت کا ثبوت دیا ہے لیکن اعلان کے مطابق تمھیں اپنی پسندیدہ شے کا اظہار کرنا ہوگا۔ اگر تم براہِ راست شوالا سے کچھ طلب کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہو تو اپنی درخواست مقدس آقابلا کے حضور پیش کر دو، وہ تمھیں اپنے فرمان سے مطلوبہ شے مرحمت کر دے گی۔"

میں نے گردن جھکا کر کچھ سوچنا شروع کر دیا۔ پھر میں نے ایک عزم کے ساتھ اونچی آواز میں بولنا شروع کیا۔ "کاہنِ اعظم! میں اپنی عظیم و جلیل حکمراں سے ہندی دوشیزہ سرتیا کو اپنے دوست سرنگا کے لیے طلب کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔"

میں نے دیکھا کہ میرا غیر متوقع جواب سن کر آقابلا اور سموال نے کسمساہٹ سے پہلو بدلا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ جزیرۂ توری کی عظیم حکمراں کے لیے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا۔ کاہنِ اعظم سموال اپنی جگہ خاموش کھڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی اس امر کی غمازی کر رہے تھے کہ اسے بھی میری طلب سے خوشی نہیں ہوئی۔ ایسے عالم میں جب سرنگا جاراکا کی مقدس رُوح کا ہدف بن چکا تھا میرا سرتیا کو طلب کرنا بے محل تھا۔ مجمع پر موت کا سکوت طاری تھا۔ چند ثانیے تک مکمل خاموشی رہی۔ پھر مقدس آقابلا اپنی مسند سے اٹھی۔ قبیلے کے تمام افراد کی گردنیں جھک گئیں۔ میں سراسیمہ اور وحشت زدہ ہو کر آقابلا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سبز پتوں میں دنیا کا سب سے حسین اور سرو قد بدن چھپائے کھڑی تھی۔ اس نے پہلی بار مجھے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں گھبرا گیا اور دیوانہ وار اس کی مسند کی طرف دوڑا۔ آنے والے لمحوں کا خوف مجھ پر غالب تھا۔

ویسے میں نے کوئی غلط چیز طلب نہیں کی تھی۔ میں شوالا کے تصرف کی کوئی بھی چیز طلب کر سکتا تھا۔ وہ چاہے سرتیا ہو یا فلورا۔ سرنگا نے اس وقت میری مدد کی کوشش کی تھی جب میں شکست کے قریب تھا۔ اگر اس نے دوستی کا حق ادا نہ کیا ہوتا اور بروقت اپنی دیوی کو شوالا کی پسپائی کے لیے نہ بھیجا ہوتا تو کیا عجب تھا کہ میں ہار جاتا۔ اقابلا کی قربت کا حسین تصور اب میری زندگی کی سب سے شدید آرزو تھی شکست کی صورت میں یہ آرزو میرے سینے میں گھٹ کے رہ جاتی۔ پھر میں اس پری وش کے سامنے سربلندی سے کس طرح جاتا؟ ممکن تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس جمال افروز دیدار سے محروم ہونا پڑتا۔ شوالا کے مقابلے میں میری حیثیت کم تر ہو جاتی، عرصۂ حیات مجھ پر تنگ ہو جاتا اور مستقبل کا وہ حسین خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا، جس کے بارے میں میں نے بہت سے خوبصورت منصوبے بنائے تھے اور نہ جانے کیا کیا ہوتا۔ اگر مجھے شکست ہو جاتی تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ لیکن سرنگا جسے میں اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا، عین وقت پر میری بربادیوں کے آڑے وقت پر میرے کام آ گیا تھا۔ اس نے خود اذیت اٹھائی اور مقدس جارا کا کا کی روح کا جبر سہا۔ خدا جانے وہ غریب زندہ بھی تھا یا مر چکا تھا۔

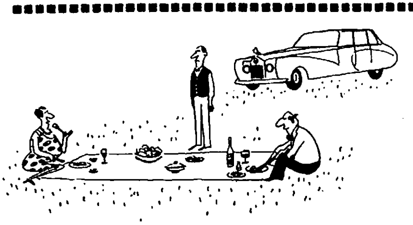
میں اقابلا کے قریب پہنچ کر ایک فاصلے پر رک گیا۔ اب میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور ذہنی کیفیت متزلزل تھی۔ میں اس کی سحری گفتاری کا منتظر تھا۔ وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی اقابلا کی سحر انگیز نظروں نے میرے جسم کا احاطہ کیا اور مجھے جھرجھری آ گئی مجھے اپنا وجود لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

"سیدی جابر!" کاہنِ اعظم کی بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں گونجی۔ "تم کوئی غلطی تو نہیں کر رہے ہو؟ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم فلورا کو طلب کرنا چاہتے تھے؟"

"مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔" میں نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"تمھیں سوچنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اسے مقدس اقابلا کی عنایتِ خسروانہ سمجھو۔" کاہنِ اعظم نے کہا۔

"بے شک میری زندگی اسی کی مرہونِ منت ہے۔" میں نے دبی آواز میں کہا۔ "تاہم سرنگا نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دوستی کا حق نبھایا ہے اس لیے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میری درخواست ہے کہ سرتیا کو سرنگا کے حوالے کر دیا جائے۔"



"مگر سرنگا ایک بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ کاہنِ اعظم میری حمایت کریں گے کیوں کہ سرتیا سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ میں سرتیا کو طلب کر رہا ہوں۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ سرنگا زندہ ہے؟ جارا کا کا کی مقدس روح نے اس پر عتاب نازل کیا ہے۔" کاہنِ اعظم نے کہا۔

"میری خواہش ہے کہ وہ زندہ ہے۔ مقدس جارا کا کا کی روح کا عتاب میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں لیکن میرے خیال میں سرنگا وہ پہلا شخص ہے جسے سیاہ ذرات نے زمین پر چھوڑ دیا۔ شاید جارا کا کا کی مقدس روح نے اس کے ساتھ کوئی رعایت برتی ہے۔" میں نے ادب و احترام سے کہا۔

"مقدس اقابلا تمھاری فراست اور زود فہمی سے متاثر ہوئی ہے۔" سمرال نے کہا۔ "تمھارا قیاس درست ہے کہ سرنگا زندہ ہے، لیکن جارا کا کا کی مقدس روح نے تمھارے ہندی دوست کو جو سزا دی ہے وہ اس سے آسانی سے نجات نہیں پائے گا۔ مقدس اقابلا تمھاری خواہش کے مطابق سرتیا کو سرنگا کے حوالے کرتی ہے۔ وہ دونوں تمھارے جھیلے میں قیام کر سکتے ہیں۔"

"ایک اجنبی کے ساتھ مسلسل ان نوازشوں نے وطن کی محبت اس کے دل سے دور کر دی۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میری قسمت مجھے اس علاقے میں کھینچ لائی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی بہترین مساعی کام میں لاؤں گا۔ میں اس علاقے کو خوشحال بنانے اور اس کے باسیوں کو سربلند رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ مقدس ملکہ کی قربت کا حصول میری زندگی کا مقصد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک دن اس مقصد میں کامیاب ہو کر رہوں گا۔" میں نے ایک جوشیلا بیان

ملک شاہ سلجوقی کے پیر میں موچ آگئی تھی، وہ بہت پریشان تھا، اس نے اپنے ندیم عمر خیام کو اپنی تکلیف سے مطلع کرتے ہوئے لکھا۔

"میرے پاؤں میں موچ آگئی ہے، جس کی وجہ سے امورِ سلطنت رُک گئے ہیں، اس لیے تم کسی اچھے اور حاذق طبیب کو میرے پاس بھیج دو۔"

خیام نے جواب میں لکھا۔

"ظلِ الٰہی! امورِ سلطنت میں پیر کے بجائے سر استعمال فرمائیے، طبیب تو آتا ہی رہے گا۔"

دیا اور لطف و کرم کے اس مجسمے کو دل کی گہرائیوں سے دیکھا۔" جابر بن یوسف الباقر تازندگی مقدس آقابلا کی خوشنودی کا مطیع رہے گا۔ جابر بن یوسف حسن و جمال کی دیوی کے آگے اپنی تمام محبتیں اور عقیدتیں نچھاور کرتا ہے۔"

"مقدس آقابلا تمھاری زبان کی تاثر آفرینی سے خوش ہے۔ وہ فلورا کے سلسلے میں تمھیں زبان کھولنے کی اجازت دیتی ہے" کاہنِ اعظم نے مقدس آقابلا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کوئی شبہ نہیں کہ یہ جنگ میں نے فلورا ہی کے حصول کے لیے لڑی تھی لیکن میں اعلان کے مطابق اپنی ایک پسندیدہ شے کا اظہار کر چکا ہوں۔ اس لیے مزید کوئی چیز طلب کرتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ عظیم شوالا میری اس جسارت پر احتجاج کرے۔"

"سیدی جابر! یہاں کا ہر ذرہ آقابلا کا تابع ہے۔ آقابلا مقدس و عظیم ہے، وہ چاہے تو شوالا کو ختم کر دے، وہ چاہے تو شوالا سے سب کچھ چھین لے۔ اس کے فیصلے کے خلاف دل میں کوئی خیال لانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ فلورا کے سلسلے میں تمھیں زبان کھولنے کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ سرتیا کو شوالا نے حاصل نہیں کیا تھا۔ اسے اس بستی کے کاہن نے سرزنگا کے حوالے کر دیا تھا جو اس وقت شوالا کے پاس تھا۔" کاہنِ اعظم نے آقابلا کی ترجمانی کی۔

"یہ درست ہے تاہم شوالا اسے اپنی ملک تصور کرتا ہے۔ میں اپنی عظیم ملکہ کے ادنا اشارے پر اپنی جان بھی پیش کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔ میں عرض کروں گا کہ یہ فیصلہ فلورا پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ہم دونوں سرداروں میں سے کسے منتخب کرتی ہے۔ اس بات سے میرے سکون کا سامان ہو جائے گا۔"

"تمھاری درخواست قبول کی جاتی ہے" کاہنِ اعظم نے پُروقار لہجے میں جواب دیا۔ "سیدی جابر! یہ تم پر منحصر ہے کہ اپنی دانش مندی، تدبر، عقیدت اور پرستش سے مقدس آقابلا کی قربت سے ہم کنار ہو۔" پھر کاہنِ اعظم نے حکم دیا۔ "فلورا کو حاضر کیا جائے۔"

کاہن کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ اس کی تعمیل میں مشکل پانچ منٹ لگے فلورا کو آقابلا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میں نے بہت دنوں بعد اپنی اُس محبوبہ کا جلوہ دیکھا جس کے لیے میں نے یہ طویل سفر اختیار کیا تھا اور اس اجنبی بستی کے اسرار میں گرفتار ہو گیا تھا۔ فلورا کے حسن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کا سرخ و سفید رنگا ہوا بدن نگاہیں خیرہ کیے دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ میں نے دل میں آقابلا کا خیال کر کے اس کی جانب سے توجہ کم کر دی۔ معلوم نہیں کہ مجھے دیکھ کر فلورا کے چہرے پر کیا رنگ آیا۔ سمورال نے آقابلا کا اشارہ پا کر نرم لہجے میں فلورا کو مخاطب کیا۔

"عزیزہ فلورا! یہ جنگ یہ مقصد سامنے رکھ کر لڑی گئی تھی کہ جابر بن یوسف الباقر، شوالا سے تمھیں طلب کرنا چاہتا تھا، لیکن جنگ کے اختتام پر فتح کے بعد اس نے تمھارے بجائے سرتیا کو منتخب کر لیا لیکن مقدس آقابلا دونوں سرداروں کے درمیان ہر قسم کے جھگڑے ختم کرنے کے لیے تمھیں اجازت دیتی ہے کہ تم جسے چاہو منتخب کر لو۔ شوالا کو یا جابر بن یوسف کو۔"

غیر اختیاری طور پر میں نے نرم و نازک فلورا کو دیکھا۔ پہلی بار اس کی نظریں مجھے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں، اس کی نگاہوں میں حسرت تھی۔ ترام اور سرتیا میرے قریب کھڑی تھیں۔ اس نے خاموشی سے میرا جائزہ لیا، میں اس کا فیصلہ سننے کے لیے بے تاب تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک عرصے بعد میری محبوبہ میری آغوش میں آجائے گی۔ وہ یقیناً میرے حق میں فیصلہ کرے گی، وحشیوں کی اس بستی میں مجھ سے زیادہ اور کون اس کے قریب ہو سکتا تھا؟ مگر فلورا نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی ذہنی خلفشار سے دوچار ہے، پھر جب اس نے سمورال کا جملہ دوسری بار سُنا تو اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے، ایک بار اس نے میری جانب اور میں نے اس کی جانب دیکھا۔ ہر چند کہ آقابلا کی قربت کا طلب گار نہ تو اب ترام کے بھرپور بدن سے متاثر ہو سکتا تھا نہ فلورا کے سحر انگیز بدن سے، اب میرا مرکز و محور کوئی اور تھا۔ وہ آقابلا تھی، مجھے حیرت تھی کہ فلورا کو فیصلہ کرنے میں پس و پیش کیوں ہے؟ جب تیسری بار فلورا سے اس کی مرضی کا اظہار کرنے کی خواہش کی گئی تو فلورا ملتجی نظروں سے مسند کی

سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور اس نے اقابلا کے پیر پکڑ لیے۔ پھر وہ تیزی سے اُٹھی اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتی ہوئی شوالا کی جانب چلی گئی۔ شوالا ابھی تک میدان کے ایک کونے میں بے ہوش پڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، فلورا کے فیصلے نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی، اس نے میرا یقین مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں نے سٹپٹا کر اس کی جانب دیکھا۔

"سیدی جابر!" سمورال کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "فلورا نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

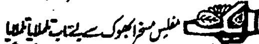
"میں دیکھ رہا ہوں کاہنِ اعظم! میں اس فیصلے کا احترام کرتا ہوں۔" میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو صرف مقدس اقابلا کی نگاہِ التفات کا متمنی ہوں، میں ایک لاکھ فلورائیں اس پر قربان کر سکتا ہوں۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ پھر میں نے کاہنِ اعظم سے درخواست کی۔ "مجھے اجازت دی جائے کہ میں بھی فلورا کی طرح مقدس اقابلا کے قدم چوم کر اپنے ہونٹوں کو لذتِ دوام بخشنے کی سعادت حاصل کروں۔"

"اجازت ہے۔"

اقابلا کی اجازت پا کر میں بے اختیار سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ اس نے بڑی شان سے اپنا مرمریں پیر آگے کر دیا۔ وہ پیر، کسی پری، کسی حور کا نرم و گداز پیر، اقابلا کا پیر، اس علاقے کی سب سے برگزیدہ ہستی کا پیر۔ میرے خدا۔ ان حسین پیروں کا لمس۔ میں اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا، مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس جادو اثر لمس نے مجھے ایک عجیب سرور سے نوازا۔ اس کے لمس کی تپش نے میرا خون گرما دیا، میری خواہش تھی کہ وقت ٹھہر جائے یا میری زندگی کا چراغ ان قدموں میں گُل ہو جائے، جُدا ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے سہلایا اور وارفتگی کے عالم میں دیوانہ وار اسے اپنے چہرے پر ملنے لگا۔ ہاں حُسن چاٹنے کے لیے ہوتا ہے، میں نے اس کے پیر چاٹے، یہ کیفیت وہی صاحبانِ دل محسوس کر سکیں گے جنھیں ان کا مطلوب سعیِ مسلسل اور جہدِ پیہم کے بعد ملا ہو، وہ پیر میرے ہاتھوں کے حلقے میں تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکے نے میری محویت کا فسوں توڑ دیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اقابلا نے اپنا پیر جھٹک کر میرے ہاتھوں سے چھڑایا اور کھڑی ہو گئی۔ اس کی شعلہ بار نظریں اُس جار پر مرکوز تھیں جو دفعتہً ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ سرنگا کی دیوی غائب ہو چکی تھی۔

"سمورال!" میں نے پہلی بار اقابلا کی آواز سُنی۔ میدان میں گھنٹیاں سی گونجنے لگیں۔

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★



مفلس مسخرا بھوک سے بیتاب تلملایا تلملایا پھر رہا تھا۔ کسی ہمدرد نے مخلصانہ انداز میں دریافت کیا "اگر آپ بھوک محسوس کر رہے ہوں تو کھانا منگوایا جائے؟"

بھوکے مسخرے نے جواب دیا۔ "ضرور منگوائیں کیونکہ بھوک ہی تو ایسی چیز ہے جو اس دنیا میں میرے اختیار میں رہ گئی ہے۔"

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

"ہاں اے مقدس ملکہ! گستاخ دیوی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہے ـــــ مقدس اقابلا کی طرف سے تمام کالی طاقتوں کو حکم دے دیا گیا ہے اور عظیم جار اکاکا کی مقدس رُوح سے درخواست کی گئی ہے کہ اگر دیوی ہمارے علاقے کے کسی بھی حصے میں ہو تو اسے مقید کر کے پابہ زنجیر ہمارے حوالے کر دیا جائے۔" یہ کہہ کر سمورال نے سرِ تسلیم خم کیا پھر اچانک نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد رنگ برنگے بادلوں کا ایک تودہ نمودار ہوا اور اقابلا کو اپنے اندر جذب کر کے اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ میں نے فلورا کی طرف دیکھا۔ وہ بے ہوش شوالا کے قریب سر جھکائے بیٹھی تھی۔

اقابلا اور کاہنِ اعظم کے جاتے ہی میرے قبیلے کے افراد ناچتے گاتے خوشیاں مناتے آگے بڑھے اور مجھے کندھوں پر اٹھا کر جلوس کی صُورت میں میری سرحد کی طرف بڑھنے لگے۔ اس ہجوم میں میرا نائب ابالیش پیش پیش تھا۔ میں نے ابالیش کو سرنگا اور سریتا کی خبر گیری کی ہدایت کی اور اُلٹے قدموں میدان کی طرف پلٹ آیا۔

یہ جشن عجیب و غریب ہنگاموں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ میرے قبیلے کے لوگوں نے تین روز تک شب و روز ہاؤ ہو، چیخوں اور رقص کا یہ جشن جاری رکھا، سریتا اور سرنگا جزیرۂ توری کے پُراسرار قبیلے کی حیرت انگیز رسمیں نہ دیکھ سکے، سرنگا کی حالت خراب تھی اور سریتا ہمہ وقت اس کی تیمارداری میں معروف تھی، میں نے اپنے وفادار دوست کے لیے طبیب فراہم کرنا چاہا لیکن ابالیش نے مجھے سختی سے روک دیا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ سرنگا جار اکاکا کی مقدس رُوح کے عتاب کی زد پر ہے اس لیے اس پر کوئی دوا کارگر نہ ہو گی۔ اس بات کا امکان بھی تھا کہ میرے اس فعل پر جار اکاکا کی مقدس رُوح مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ یہاں کی ہر بات، ہر دلیل عجیب تھی۔ کسی خوف اور تردید کے بغیر اسے قبول کرنے ہی میں سلامتی مضمر تھی۔

میں تین روز تک جشن کی مصروفیت میں سرنگا سے ملاقات نہ کر سکا البتہ اس کی خیریت مجھے ملتی رہی۔ چوتھے روز جب مجھے فرصت ہوئی

تو میں اپنے ہندی دوست کی مزاج پُرسی کے لیے گیا۔ ابالیش نے ان دونوں کے لیے ایک علیحدہ جھونپڑی کا بندوبست کردیا تھا۔ جس وقت میں جھونپڑی میں داخل ہوا‘ سرنگا آنکھیں بند کیے بے سُدھ پڑا تھا۔ سریتا اس کے قریب حسرت و یاس کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ اس وقت اسے اپنی ستر پوشی کا خیال بھی نہیں تھا۔ وہ برہنگی کی عادی ہوگئی تھی‘ میں نے اس کا ترشا ہوا بدن دیکھ کر نظریں جھکالیں‘ نہ جانے کیا بات تھی کہ سریتا کو عریاں دیکھ کر مجھے صدمہ ہوتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کا عریاں بدن ڈھانپ دوں‘ سرنگا کی حالت بڑی ابتر تھی‘ اس کے جسم پر پڑے ہوئے آبلوں نے زخموں کی صورت اختیار کرلی تھی‘ رِستے ہوئے زخم۔ مجھے وہ زخم دیکھ کر متلی ہونے لگی۔ سرنگا کی حالت سے مجھے وحشت ہو رہی تھی اس لیے میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں سریتا سے کہا۔ "سریتا! تمھارے باپ پر جو گزری ہے اس کا مجھے دلی افسوس ہے لیکن ماورائی قوتوں کے آگے ہم جیسے لوگ کیا کرسکتے ہیں؟ تم صبر کرو۔ سرنگا جلد ٹھیک ہوجائے گا۔"

"میرے باپ نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔" سریتا نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔ "البتہ انھوں نے ایک غلطی ضرور کی تھی‘ آدمی اگر اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارے تو خدا بھی اس سے ناراض ہوجاتا ہے۔ میں نے اپنے باپ کو یہاں آنے سے منع کیا تھا۔ یہاں آکر یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ ہمیں موت کیوں نہیں آجاتی؟"

سریتا کی دل خراش باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسے تسلی ہی دے سکتا تھا۔ میں نے اسے سینے سے لگا کر زور سے بھینچا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بے معنی تسلیاں دینے لگا‘ اسی وقت سرنگا نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور نقاہت بھری آواز میں کہا۔ "سیدی جابر! مجھے یقین تھا کہ تم میری خبر گیری کرو گے۔ یہاں‘ میرے پاس بیٹھو۔"

میں دل پر جبر کرکے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سرنگا نے کچھ بولنے کی کوشش کی اور پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ "تم پریشان ہو جابر؟ میں جلد اچھا ہوجاؤں گا۔ جارا کاکی رُوح نے مجھے جو سزا دی ہے وہ پچاس دن سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ پچاس دن کی مدت میں کوئی دوا مجھ پر کارگر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد میں خود بخود ٹھیک ہوجاؤں گا۔"

"سرنگا! میں تمھارا سلوک فراموش نہیں کرسکتا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "اگر تم نے بروقت میری مدد نہ کی ہوتی تو حالات اس وقت کچھ اور ہوتے۔"

"سیدی جابر! مجھے افسوس تو یہی ہے کہ میں کچھ نہیں کرسکا۔ تم نے ایک بار جان پر کھیل کر سریتا کو مرنے سے بچایا تھا اور اب مجھے یہ اطلاع بھی مل چکی ہے کہ تم نے ابالا سے فلورا کے بجائے سریتا کو میرے لیے مانگا تھا۔"

"اس کے باوجود سریتا مجھ سے ناراض نظر آرہی ہے۔" میں نے سریتا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"یہ دیوانی ہوگئی ہے سیدی! اس کا خیال ہے کہ اگر میں شوالا کو چھوڑ کر تمھارے پاس نہ آیا ہوتا تو مجھ پر یہ مصیبت نازل نہ ہوتی لیکن میں اپنے دوست کو کیسے بھول سکتا تھا؟ یہ بے وقوف ہے۔ بچی ہے۔"

اس گفت گو کے دوران میں سرنگا نے سریتا کو کسی کام سے باہر بھیج دیا اور بڑی راز داری سے بولا۔ "سیدی! مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میرے اور قریب آجاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ دیواریں بھی ہمارے درمیان ہونے والی گفت گو سُن سکیں۔"

سرنگا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی طویل گفت گو کرسکتا لیکن وہ ایک بہت حوصلہ مند اور مستقل مزاج بوڑھا تھا۔ وہ اپنے زخموں کی پروا کیے بغیر بولتا رہا۔ اس کے ہونٹ لرزش کر رہے تھے‘ میری اُلجھن بڑھتی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد سرنگا کی پُتلیاں متحرک ہوگئیں۔ اس نے جھونپڑی کے چاروں طرف دائرے کی صورت میں دیکھنا شروع کردیا۔ ساتھ ہی وہ کچھ پڑھ کر پھونکتا بھی جارہا تھا۔ ایسی جاں کنی کی کیفیت میں اور اس عمل کے دوران مجھے وہ بڑا پُراسرار نظر آیا۔ اس کا حوصلہ نوجوانوں سے کہیں بلند تھا۔ پُراسرار عمل سے

فراغت کے بعد سرنگا نے میری جانب گھورتے ہوئے سرگوشی کی "سیدی! اب ہم بے خوف و خطر باتیں کر سکتے ہیں۔"

"مگر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے وضاحت طلب انداز میں پوچھا۔

"سیدی! ہم اس طرح ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ کیا تمھارا خیال ہے کہ ہم ہمیشہ اسی جزیرے میں محبوس رہیں گے؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ سرنگا تنہا نہیں ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ لوگ ذہنی طور پر اتنے گئے نہیں ہیں۔ میں نے اس وقت ایک جاپ کے ذریعے یہ جھونپڑی محفوظ کر لی ہے۔ اب کچھ دیر کے لیے پُراسرار اور ماورائی قوتیں بھی ہماری گفتگو نہیں سُن سکیں گی۔"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔" میں نے حیرت سے کہا۔

سرنگا کے ہونٹوں پر معنی خیز تبسم اُبھر آیا، وہ دبی ہوئی پُرجوش آواز میں بولا "سیدی! تمھیں ابھی یہ باتیں سمجھنے میں وقت درکار ہوگا، ابھی تو تم نے یہاں کے اسرار میں پہلا قدم بھی آگے نہیں بڑھایا، وقت کے ساتھ ساتھ تمام اسرار تم پر منکشف ہو جائیں گے۔ وقت کم ہے اور مجھے تم سے کچھ راز کی باتیں کرنی ہیں لیکن اس شرط پر کہ تم ان باتوں کا ذکر اپنے ہمزاد سے بھی نہیں کرو گے، اگر تم نے ایسا کیا تو ہم سب تباہی و بربادی کا شکار ہو جائیں گے اور کوئی طاقت ہمیں نہیں بچا سکے گی۔"

سرنگا کی شخصیت میرے لیے جہاز کی تباہی والے واقعے کے بعد سے اب تک پُراسرار بنی رہی تھی۔ اس وقت وہ بطورِ خاص بہت ہولناک نظر آ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر اعتماد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔

"سرنگا پر اعتماد کرو۔ میں یہاں کے اسرار سے بھی زیادہ اُلجھی ہوئی گتھی ہوں سیدی!" سرنگا نے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا "میرے بارے میں زیادہ مت سوچو۔ جو کچھ میں کہوں اسے غور سے سُنو۔ سب سے پہلے میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ابالیش سے ہوشیار رہو، ہو سکے تو اسے کسی الزام میں ملوث کر کے ختم کر دو، دوسری بات یہ ہے کہ تمھیں کالاری کے بندر کاہو کو ٹھکانے لگا دینا چاہیے، میں چاہتا ہوں کہ میرے تندرست ہونے سے پہلے تم ان دونوں کاموں سے نمٹ لو۔"

سرنگا کی بات سُن کر میں اور اُلجھ گیا۔ کاہو کو ٹھکانے لگانے کی بات مجبوراً تسلیم کی جا سکتی تھی لیکن ابالیش میرا نائب تھا۔ اس نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی تھی، مجھے ابھی اس سے کالے جادو کا علم سیکھنا تھا۔ میں نے سوچا کہ جاراکا کی مقدس روح نے سرنگا کو سزا دی ہے کہیں اس کی وجہ سے سرنگا



پانچواں شکار

اپنا ذہنی توازن تو نہیں کھو بیٹھا؟ یہ درست تھا کہ شوالا کے مقابلے میں میری کامیابی اسی کی وجہ سے ممکن ہوئی تھی لیکن اس کے عوض ابالیش جیسے وفادار نائب کو موت کے گھاٹ اُتار دینا یقیناً ناانصافی ہوتی۔ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا "کیا ابالیش اور کاہو کے بارے میں تم کسی خاص شبہے کا اظہار کر رہے ہو؟"

"شبہ" سرنگا ٹھوس لہجے میں بولا "سرنگا سطحی باتوں کا عادی نہیں ہے، یہ سب کچھ میں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں، حالات نے مجھے وقتی طور پر بے بس کر دیا ہے، ورنہ ابالیش اور کاہو کا خاتمہ میں خود اپنے ہاتھوں سے کرتا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا "وجہ کیا ہے؟"

"سیدی! میں سب کچھ تمھیں بتا دوں گا، تم اس وقت جس ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو اسے میں محسوس کر رہا ہوں، مجھے حیرت ہے کہ تم جیسا دُور اندیش آدمی بھی وسوسوں کا شکار ہو رہا ہے، ذرا سوچو سیدی! اگر میں تمھارا دُشمن یا بدخواہ ہوتا تو کیا دیوی کو شوالا کے خلاف استعمال کرنے کی بجائے تمھارے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا؟ مجھے اس کرب میں گرفتار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ تمھارے بجائے اگر میں شوالا کے ساتھ رہتا اور اس کی ہمدردیاں حاصل کرتا تو مجھے کون روک لیتا؟ مجھے افسوس ہے کہ میں تم پر احسان جتا رہا ہوں۔" میں نے اس بوڑھے کا چہرہ تشویش سے دیکھا۔ وہ کہنے لگا۔ "اگر آزمانا چاہتے ہو تو تمھارے گلے میں سمورال کی دی ہوئی جو مالا پڑی ہے، اُسے آج اپنے گلے سے اُتار کر کہیں قریب رکھ دینا۔ ابالیش کی حقیقت تم پر خود آشکار ہو جائے گی لیکن ایک بات کا خیال رہے تم اس طرح یہ مالا کہیں کھو نہ دینا، اسے اپنے سامنے ہی کسی جگہ رکھنا، اگر تم اس کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہوئے تو بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔"

میں اس سے کچھ اور نہ پوچھ سکا۔ سرتیا کے آجانے سے سرنگا نے

بھی خاموشی اختیار کر لی اور آہیں بھرنے لگا۔ میں کرب و اضطراب کے عالم میں وہاں سے اٹھا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف سرنگا تھا' ایک پُراسرار شخص؛ ایک بوڑھا گِدھ۔ مجھے رات کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا' میں سرنگا کے شبہات کی تصدیق ضروری سمجھتا تھا۔

دن چڑھے ابالیش مجھ سے ملاقات کے لیے آیا مگر میں نے دانستہ ملاقات سے گریز کیا۔ کالاری کا بندر کاہو بدستور جھونپڑی کے باہر ایک مستعد چوکیدار کی حیثیت سے تعینات رہا۔ اس روز میں نے ترام سے بھی کوئی خاص بات نہیں کی۔ کٹا کٹا رہا' رات آئی تو میں پوری طرح اس امتحان کے لیے تیار ہو گیا جس کا اشارہ سرنگا نے کیا تھا۔ ترام اس وقت گہری نیند سو رہی تھی، میں اسے چھوڑ کر بیرونی کمرے میں آگیا۔ میں نے تذبذب کی کیفیت میں مالا گلے سے اُتار کر سامنے والی دیوار پر لٹکا دی اور اس طرح اس کے سامنے لیٹ گیا کہ میری نظریں اس پر جمی رہیں' وقت گزر رہا تھا اور میری تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا' مالا گلے سے جُدا کیے ہوئے مجھے خاصی دیر ہو گئی تھی، اسے مسلسل دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں سوزش سی ہونے لگی' اچانک میرے ذہن میں تیزی سے یہ خیال اُبھرا کہ کہیں سرنگا خود یہ قیمتی مالا حاصل کرنے کی فکر میں تو نہیں ہے؟ سمورال نے یہ مالا میرے حوالے کرتے وقت کہا تھا کہ یہ پُراسرار قوتوں کی حامل ہے۔ ممکن ہے میرے گلے میں پڑے ہونے کی وجہ سے سرنگا اسے حاصل کرنے میں ناکام رہا ہو اس لیے اس نے اس کے حصول کا یہ طریقہ سوچا ہو؟ لیکن وہ جس اذیت میں گرفتار تھا' اس کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی مشکل تھا۔ میرے ذہن میں مختلف خیالات اُبھر رہے تھے، بہرحال میری نظریں بدستور مالا پر مرکوز تھیں۔ جب کچھ اور وقت گزر گیا تو میری پریشانیاں بڑھ گئیں' اب مجھ پر جھلاہٹ طاری ہو گئی تھی کہ میں بیکار ایک بے بنیاد شبہے کی خاطر اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں' مجھے سکون کی نیند سو جانا چاہیے۔ یہ خیال پختہ کرنے کے بعد میں مالا دوبارہ گلے میں ڈالنے کے لیے اُٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ باہر کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سُنائی دی' پھر دروازہ آہستہ سے کھُلا اور ایک انسانی ہیولا میری نظروں کے سامنے آگیا' قدوقامت کے اعتبار سے وہ بے شک ابالیش ہی معلوم ہوتا تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے میں اس کے خط وخال واضح طور پر نہیں دیکھ سکا۔

آنے والا شخص دروازے پر احتیاط سے کھڑا میری جانب دیکھتا رہا پھر وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا اس سمت بڑھنے لگا جہاں میں نے مالا لٹکائی تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ آخر آنے والے کو اس بات کا علم کیسے ہوا کہ مالا کس جگہ ملے گی؟ لیکن یہ خیال ظاہر ہے کہ سطحی تھا۔ اس علاقے میں ہر بات ممکن تھی۔

نووارد آہستہ آہستہ مالا کی جانب کھسک رہا تھا لیکن اس طرح کہ اس کی نظریں میری ہی سمت تھیں' میں آنکھوں کے درمیان ہلکی سی جھری کیے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا' میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر گلے میں لٹکی ہوئی جاراکا کی کھوپڑی پر اپنی گرفت مضبوطی سے جما رکھی تھی' کاہنِ اعظم نے مجھے اس مقدس کھوپڑی کے استعمال کے مختلف طریقے بتائے تھے اس لیے میں مطمئن تھا کہ جب چاہوں گا' نووارد کو اس کے ذریعے زیر کر لوں گا' مالا اور اس شخص کا درمیانی فاصلہ جب دو قدم رہ گیا تو میں کمال پھُرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نووارد اس اچانک بیداری کے لیے تیار نہیں تھا' وہ بُری طرح گھبرا گیا اور اس کے فرار ہونے سے پہلے ہی میں نے اپنی پوری توانائی کے ساتھ اسے دبوچ لیا' ہم دونوں زمین پر گر گئے لیکن اس طرح کہ نووارد میرے بوجھ تلے دَبا ہوا تھا اور میں اس کی چھاتی پر چڑھا بیٹھا تھا۔

اب اس کا چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا' سیاہ چہرہ۔ واقعی وہ ابالیش ہی تھا۔

میں نے سانس قابو میں کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔"ابالیش! میں اپنے وفادار نائب سے کبھی اس حرکت کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔"

"مقدس آقا ___ میں ___ میں۔" ابالیش ہکلانے لگا۔

میں نے ڈپٹ کر کہا۔"مجھے معلوم ہے بدبخت ابالیش کہ تو یہاں کس مقصد سے آیا تھا۔ کیا کاہنِ اعظم کا عطیہ تجھے اتنی آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا؟ تو نے یہ کیوں نہیں سوچا۔"

ابالیش کے چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کی آنکھیں پُراسرار طور پر چمکنے لگیں' اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے کچھ نامانوس قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ابالیش کالے جادو کو اپنی نجات کا ذریعہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے لیے اب ایک پل بھی ضائع کرنا دانش مندی کے خلاف تھا' میں نے جاراکا کی کھوپڑی گلے سے اُتار کر آہستہ سے ابالیش کے سر پر ماری' میرے دل میں اس کی ہلاکت کا تصور تھا' کھوپڑی جیسے ہی ابالیش کے سر سے لگی' اس نے کربناک انداز میں چیخ ماری' پھر یوں تڑپنے لگا جیسے شدید اذیت میں مبتلا ہو' اس کے بعد وہ سرد پڑ گیا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی' دل پر کان لگا کر

سُنا مگر وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا تھا۔

میں نے جلد از جلد مالا اُتار کر گلے میں ڈالی پھر ابالیش کی لاش ایک جھٹکے سے بیٹھ پر اُٹھا کر باہر نکلا اور اسے جھونپڑی سے کچھ دُور پھینک آیا، جھونپڑی سے نکلتے وقت میں نے کاہو کی موجودگی یا غیر موجودگی کے متعلق غور نہیں کیا تھا، لیکن جب واپسی پر میں نے اسے غائب پایا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا، آج سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا، کاہو دن رات میری جھونپڑی کے دروازے سے لگا بیٹھا رہتا تھا پھر بھی میں نے اس وقت کاہو کی وہاں غیر موجودگی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ صرف یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ابالیش نے اپنے علم کے ذریعے اسے یہاں سے ہٹا دیا ہوگا۔

اور وہ رات اُن مضطرب ترین راتوں میں سے ایک تھی جو میں نے جزیرۂ توری پر گزاریں۔ علی الصباح میں نے پھر کاہو کو ڈھونڈا مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میرے قدم بے خودی کی کیفیت میں اس جانب بڑھ گئے جہاں میں نے رات کو ابالیش کی لاش پھینکی تھی۔ اس کی لاش کے بجائے وہاں ہڈیوں کا ایک انسانی ڈھانچا ملا جو سیاہ ہو چکا تھا۔ میں وہاں سے فوراً چلا آیا اور سوچنے لگا کہ سرنگا نے ابالیش کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ درست ثابت ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کاہو بھی کسی وقت میری راہ کا کانٹا ثابت ہو سکتا ہے۔ کہیں کاہو کو میرے ارادے کا علم تو نہیں ہو گیا ہے؟ وہ فرار کیوں ہو گیا ہے؟ سرنگا کو ان خفیہ باتوں کا علم کیسے ہو گیا؟ کیا سرنگا معتوب ہونے کے باوجود اپنے اندر غیر معمولی روحانی خوبیاں رکھتا ہے؟ کتنی حیرت انگیز باتیں تھیں۔ میں سوچتا رہا۔

یہ غور و فکر کے انحطاط کا وقت تھا۔ میں نے فوراً سموراں سے ملنے کا ارادہ کیا۔ میرے لیے یہی مناسب تھا کہ میں جلد از جلد سموراں سے مل کر اس کے سامنے پورے واقعات رکھ دوں اور اس سے ان پُراسرار واقعات کی تشریح چاہوں اور آیندہ پیش آنے والی دُشواریوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ اس کا غار آسانی سے مجھے مل گیا۔ میں جانے پہچانے راستوں سے گزر کر غار میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے میری ملاقات نوعمر جمراں سے ہوئی۔ ترام کا چھوٹا بھائی جمراں مجھے دیکھ کر خوشی سے کھِل اُٹھا۔ پھر ہم دونوں اُس حصّے میں گئے جہاں سیاہ رنگ، پُروقار چہرے اور تنومند جسم کا مالک عظیم سموراں موجود تھا، میں نے ادب سے اپنے جسم کو خم دیا۔ سموراں کی پیشانی پر لکیریں اُبھر آئیں، اس نے سر کی خفیف جنبش سے مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں قریب رکھے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور سموراں سے کچھ کہنے کے لیے سوچنے لگا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کاہنِ اعظم میری آمد پر کچھ جز بز سا ہو گیا ہے، وہ میرے چہرے پر لکھی ہوئی پریشانیاں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، پھر اچانک وہ اُٹھا اور ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا مجھے اپنی مخصوص عبادت گاہ میں لے گیا۔ جمراں وہیں رُک گیا تھا۔ عبادت گاہ میں داخل ہو کر کاہنِ اعظم نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "جلدی بتاؤ تم یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟"

"مقدس سموراں! مجھے رہنمائی کی ضرورت ہے۔" میں نے باادب جواب دیا۔ پھر سرنگا سے ملاقات، ابالیش کی پُراسرار موت اور کاہو کی گمشدگی کے تمام واقعات بیان کر ڈالے، البتہ میں نے سرنگا کی شخصیت محفوظ کرنے کے لیے اپنے بیان میں محض اتنی تبدیلی کر دی کہ ابالیش کو آزمانے کی خاطر مالا والا تجربہ میں نے خود کیا تھا۔

"جابر!" سموراں مجھ سے تفصیل سُن کر بولا۔ "کیا تم نے سرنگا سے دریافت کیا تھا کہ اسے ابالیش کی ذات پر کسی قسم کا شبہ ہے؟"

"جی ہاں، میں نے دریافت کیا تھا کاہنِ اعظم! لیکن سرنگا نے اس شبہے کو اپنی چھٹی حس سے تعبیر کیا تھا۔" میں نے بڑی خوب صورتی سے جواب دیا۔

سموراں میرے چہرے پر ابھی تک کچھ تلاش کر رہا تھا، اُس کا انداز بتا رہا تھا جیسے وہ کچھ درمیانی کڑیاں ملانے میں اُلجھن محسوس کر رہا ہے۔ "میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ سرزمین اسرار سے پُر ہے۔ یہاں تمھارے لیے ہر لمحے اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا شرط ہے۔ ہو سکتا ہے ابالیش نے طاقت کے زور سے تمھیں زیر کر کے سرداری حاصل کرنے کا خواب دیکھا ہو۔ مقدس آقا بلا نے بھی تمھیں یہی بتایا تھا کہ اسے طاقت اور مردانگی کے کھیل پسند ہیں لیکن تم بہت غیر محتاط رہتے ہو۔ تم نے مالا اپنی گردن سے

اُتار کر یقیناً حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ اگر مالا ابالیش کے ہاتھ لگ جاتی تو تمھاری حیثیت اس کے ہاتھ میں کھلونے جیسی ہوتی، جسے کوئی بھی اپنی مرضی پر چلا سکتا ہے۔ میں نے تمھیں سختی سے تاکید کردی تھی کہ آیندہ مالا ایک پل کے لیے بھی گلے سے نہ اُتارنا۔"

"مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے اے بزرگ۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

سموراں سپاٹ لہجے میں بدبدایا: "سرنگا کی دیوی ہماری حدود سے باہر نکل گئی ہے، اس کا ہماری دسترس سے دُور ہو جانا اچھا شگون نہیں ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ حالات اپنا رُخ بدل رہے ہیں۔ جب ایسے حالات رونما ہونے لگیں تو بلائیں گھیر لیتی ہیں اور سلطنت کا وجود متزلزل ہونے لگتا ہے۔"

"مگر کیا مقدس اقابلا نے یہ خطرہ محسوس نہیں کیا ہے؟ کیا وہ دیوی پر قابو پانے میں قاصر رہی ہے؟"

میرے اس سوال پر سموراں کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے گرجتے ہوئے کہا۔ "جابر! تم مقدس اقابلا کی شان میں گستاخی کر رہے ہو۔ آیندہ تمھیں اپنی زبان قابو میں رکھنی ہوگی۔ اقابلا عظیم قوتوں کی مالک ہے، سرنگا کی دیوی نے اس کی غفلت سے فائدہ اٹھایا تھا ورنہ مقدس اقابلا کا صرف ایک اشارہ اسے شعلوں کی نذر کرنے کے لیے کافی تھا۔"

"میں معافی کا خواستگار ہوں اے نیک بزرگ!" میں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "دراصل ابالیش کی موت اور کاہو کی گمشدگی نے مجھے مضطرب کر رکھا ہے، میں نے اپنی معلومات میں اضافے کی خاطر برسبیلِ تذکرہ ایک رسمی بات دریافت کرلی تھی، اس سے مقدس اقابلا کی تضحیک مقصود نہیں تھی۔"

"میرا حکم ہے کہ سوچ سمجھ کر زبان کھولا کرو۔" سموراں نے غصّے سے کہا، پھر کچھ توقف کے بعد بولا: "تمھیں محتاط رہنا ہوگا۔ یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ کاہو کی گمشدگی میں ابالیش کی شرارت ہو۔ بہرحال میں دیکھتا ہوں کہ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔"

"میں رہنمائی کے لیے حاضر ہوا ہوں کاہنِ اعظم!" میں نے بدقت تمام کہا۔

سموراں نے میری بات پر خاموشی اختیار کرلی۔ اس نے طلسمی کڑھاؤ کے قریب جاکر لکڑیوں کا الاؤ روشن کردیا، پھر آنکھیں بند کرکے کوئی عمل پڑھنے لگا۔ مجھے شدید گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ جتنی دیر آنکھیں بند کیے اپنے عمل میں مصروف رہا، میں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔

سموراں نے یکایک آنکھیں کھول دیں اور کڑھاؤ کے قریب رکھی ہوئی تپائی پر چڑھ کر اُبلتے ہوئے تیل کے اندر جھانکنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر سموراں نے اپنے علم کے ذریعے سرنگا سے میری ملاقات کا پورا احوال معلوم کرلیا تو وہ یقیناً میری دروغ گوئی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھے گا۔ اس کی ناراضی میری زندگی تلخ کرسکتی تھی، اس کی خوشی مجھے اقابلا سے قریب کرسکتی تھی، وہ اقابلا کا دستِ راست تھا۔ خوف سے میرے چہرے پر پسینہ آگیا، آنے والے لمحات نہ جانے کیا گُل کھلانے والے تھے۔ میں اسی خوف و شک میں مبتلا تھا کہ یکلخت وہ تپائی سے بجلی کی تیزی سے اُچھل کر نیچے اُترا، اس کی آنکھوں سے خون اُبل رہا تھا، میرے خدا، کس قدر خوفناک لگ رہی تھیں وہ غضب ناک آنکھیں ـــ کاہنِ اعظم کی نگاہوں کا قہر دیکھ کر میں سراپا لرز اٹھا۔

"جابر بن یوسف۔" اچانک سموراں ہذیانی انداز میں چیخا۔ "وہ میرے اور تمھارے درمیان کا تعلق توڑ رہے ہیں، کاہو۔ وہ شیطان بندر اس وقت تمھاری جھونپڑی کی طرف ترام کو ختم کرنے کی غرض سے بڑھ رہا ہے۔ جابر بن یوسف! وہ ترام کو نہیں مار سکتا۔ ترام ـــ میری بچی ـــ مگر یہ کیوں ہوا؟ میں یہاں کا کاہن ہوں ـ کاہنِ اعظم ..... میں اس خبیث روح کو دیکھوں گا ـــ جابر وہ ترام کو نشانہ بنانا چاہتا ہے ـــ دیوتا میرے قریب ہیں۔"

سموراں عبادت گاہ میں کسی پاگل کی طرح اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہا تھا، میں سکتے کی کیفیت سے دوچار تھا، ہم دونوں میں سے کون کس کو دلاسا دیتا، میری زبان گنگ ہوگئی تھی۔ پھر اچانک کاہنِ اعظم سموراں کا وجود غائب ہوگیا، میں ایک لمحے تک گم سم کھڑا لکڑی کے الاؤ کے شعلے بھڑکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر تیزی سے واپس ہوگیا اور غار سے باہر جانے والے راستے پر دوڑنے لگا۔



تاریک براعظم کا افسون
اقابلا
جابر بن یوسف الباقری کی پُراسرار سرگزشت
کے باقی حیرت انگیز واقعات آیندہ
شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

عالمی شہرت کے مُصنف ہنری سلاسر کی دُو خولصورت مُختصر کہانیاں



جونی نے ریسیور کان سے لگا رکھا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اسے گراہم کی آواز برابر آرہی تھی۔" میں لاس اینجلس ائیرپورٹ سے بول رہا ہوں۔ تم خاموش کیوں ہو جونی؟ ارے تم کچھ بول نہیں رہے ہو؟ کیا پہچانے نہیں؟"

جونی بھلا کس طرح یہ آواز بھول سکتا تھا۔ بارہ سال پہلے دوسری جنگِ عظیم میں وہ اور گراہم ایک ہی محاذ پر تھے اور وہ گراہم کو اپنا سب سے قریبی دوست تصور کرتا تھا۔" ٹیکس گراہم؟" جونی نے کہا۔

"بے شک میں گراہم ہوں اور کون ہو سکتا ہے؟"

"اوہ گراہم ـــ بارہ سال کا عرصہ ـــ"

"کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا جونی کہ میں جنگ کے بعد اس منحوس جزیرے سے نکل کر ایک مرتبہ تم سے ضرور ملوں گا۔ دیکھ لو میں وعدے کا کتنا پکا ہوں۔ تم سناؤ جانِ من ـ کیسے ہو؟"

دلچسپ

مُنفرد

اور

عبرتناک

پہلی کہانی

ش۔ م۔ جمیل

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں گراہم! اور تم؟"

"میں؟ تمھیں معلوم ہے کہ میں ہمیشہ ٹھیک رہتا ہوں۔ ہاں میں نے سنا تھا کہ تم نے آخر کوئی لڑکی پھانس ہی لی۔ کیا شادی وادی کر لی ہے؟"

"ہاں گراہم۔ چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ ہالی وڈ میں رہ رہا ہوں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ میں نے ٹیلی فون ڈائرکٹری میں تمھارا پتہ دیکھ لیا تھا اور اسی سے مجھے تمھارے فون نمبر کا علم ہوا۔ کوئی کام دھندا کر رہے ہو یا نہیں؟"

"ہاں، میں ملازمت کر رہا ہوں اور بے حد مطمئن ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تو آج کی چھٹی لے لو۔ میں دو بجے رات کی فلائٹ سے پرواز کر رہا ہوں۔ تمھارے پاس کوئی کھٹارا وغیرہ بھی ہے؟"

"ہاں ہے تو۔"

"ٹھیک ہے۔ اپنی گاڑی ایئر پورٹ لے آؤ۔ ہاں اپنے ساتھ بھابی کو ضرور لانا۔ ہم لوگ کھانا وغیرہ ساتھ کھائیں گے ذرا تفریح رہے گی۔ تمھیں کتنی دیر لگے گی یہاں پہنچنے میں؟"

"زیادہ سے زیادہ پون گھنٹہ۔" جونی نے جواب دیا۔

"میں امریکن ایئر لائن کی عمارت میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی آجاؤ جونی! میں تم سے ملنے کے لیے سخت بے قرار ہوں۔"

جونی نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ "میکس گراہم کا فون تھا میری!" اس نے اپنی بیوی کی سوالیہ نظریں سمجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" میری کو یقین نہیں آیا۔

"وہ اس وقت ایئر پورٹ پر موجود ہے اور اس نے ہم دونوں کو کھانے کی دعوت دی ہے۔"

میری نے آگے بڑھ کر ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"مجھے افسوس ہے جونی!" میری نے کہا۔

"مجبوری ہے میری۔ مجھے یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ پولیس میں ملازم ہوں نا۔۔۔"

لیکن میری کے لیے اس بات کی یاد دہانی فضول تھی۔۔۔ اس کی بیوی کو اپنے شوہر پر فخر تھا کہ وہ قانون کا محافظ ہے مگر وہ ہر وقت ایسے لمحوں سے خوف زدہ بھی رہتی تھی جیسے یہ موجودہ لمحات تھے۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے شوہر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ "تمھارا ریوالور کہاں ہے جونی؟"

"وہ میں نے صفائی کے لیے دے دیا ہے۔ کل صبح واپس ملے گا۔"

جونی نے جواب دیا اور پھر اپنی بیوی کی نیلی نیلی آنکھوں میں فکر مندی کے سائے لہراتے دیکھ کر اس نے جلدی سے کہا۔ "تم بے فکر رہو میری جان! یہ کوئی خطرناک معاملہ نہیں ہے۔ مجھے ریوالور استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ گراہم کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں پولیس میں ملازم ہوں۔ میں سادہ لباس میں اس سے ملنے جاؤں گا۔"

"کیا تمھارا جانا ضروری ہے ڈارلنگ؟" میری کی تشویش میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

"ہاں جان۔۔۔ اس بات کا فیصلہ بہت پہلے کیا جا چکا ہے۔ میرا کام تو صرف اسے شناخت کر کے اس کی نشان دہی کرنا ہو گا۔ باقی کام ایف بی آئی والے کریں گے۔ انھیں بہت عرصے سے اس کی تلاش ہے۔"

"لیکن ایف بی آئی کے پاس گراہم کی تصویر تو موجود ہے۔" میری نے اعتراض کیا۔ "تمھارے وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"وہ تصویر بہت پرانی ہے۔ بارہ سال پرانی۔۔۔ اسے فوجی ریکارڈ سے حاصل کیا گیا تھا۔ ممکن ہے وہ اس عرصے میں بہت تبدیل ہو گیا ہو یا اس نے دانستہ اپنے حلیے میں تبدیلیاں پیدا کر لی ہوں۔ لیکن میں اسے آسانی سے پہچان جاؤں گا۔"



جونی ٹیلی فون کا ڈائل گھما کر نمبر ملانے لگا۔ اس کی بیوی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "ہیلو ایف بی آئی۔ کیا مسٹر کوروز موجود ہیں؟۔۔۔ ہملٹن صاحب؟ نہیں ہیں۔ اچھا کیا آپ ان میں سے کسی سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں؟۔۔۔ جی ہاں بہت ضروری کام ہے۔ میں پولیس افسر جونی نوائن بول رہا ہوں۔۔۔ ہالی وڈ ڈویژن سے۔۔۔ دراصل انھیں بہت عرصے سے ایک مجرم کی تلاش تھی، اتفاق سے وہ مجرم اس وقت اس شہر میں موجود ہے۔۔۔ نہیں، میں جا رہا ہوں۔ میں تو نہیں مل سکوں گا البتہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ وہ تھانے میں فون کے ذریعے لیفٹیننٹ گورڈن سے ضروری ہدایات حاصل کر لیں۔ میں لیفٹیننٹ کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔" جونی نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر کے اپنے تھانے کا نمبر ملایا۔

"ہیلو لیفٹیننٹ گورڈن؟ میں جونی بول رہا ہوں۔ کیا تمھیں ٹیکس گراہم یاد ہے گورڈن؟ وہی جس کے سلسلے میں ایف بی آئی والے مجھ سے ملنے گئے تھے؟"

"اچھا وہ آدمی جو جنگ میں تمھارے ساتھ محاذ پر تھا؟" گورڈن نے دوسری جانب سے جواب دیا۔ "جسے ایف بی آئی والے اوکلاہاما کے قتل اور ڈکیتی کی وارداتوں کے سلسلے میں تلاش کر رہے ہیں؟"

"ہاں وہی۔" جونی نے تصدیق کی۔ "وہ دو بجے رات تک اس شہر میں موجود رہے گا۔ میں نے ابھی ایف بی آئی کے اسپیشل ایجنٹ کورونز اور ہلٹن کو فون کیا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ تمھیں فون کرکے ضروری معلومات حاصل کرلیں۔"

"کون سی معلومات؟"

"میں گراہم سے ملنے کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ ائیرپورٹ جا رہا ہوں۔ وہ وہاں امریکن ائیرلائن کی عمارت میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے ہمیں کھانے کی دعوت دی ہے اس لیے اگر ہم امریکن ائیرلائن کی عمارت میں نہ ملیں تو ائیرپورٹ ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہوں گے۔ اگر اس پروگرام میں کوئی غیر متوقع تبدیلی کرنی پڑی تو میں فون پر تمھیں اطلاع دے دوں گا۔"

"کیا میں تمھاری مدد کے لیے کچھ آدمی روانہ کردوں؟" لیفٹیننٹ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"تمھاری مرضی گورڈن۔ لیکن یاد رہے کہ ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایف بی آئی کا کیس ہے، ویسے میں خود سادہ لباس میں جا رہا ہوں۔"

"پھر بھی تم ہوشیار رہنا۔ ریوالور ساتھ لیتے جانا۔" گورڈن نے تاکید کی۔

"شاید تم سمجھے نہیں گورڈن۔ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اُس سے ملنے صرف ایف بی آئی کی درخواست کے مدِنظر جا رہا ہوں میرا کام صرف اتنا ہوگا کہ اسے شناخت کرکے اس کی نشان دہی کردوں۔ اس کے بعد ان کا کام ہوگا۔ وہ خود اسے پکڑتے رہیں گے۔"

"بہت اچھا۔" گورڈن نے کہا۔ "میں یہ معلومات ایف بی آئی والوں کو دے دوں گا۔"

جونی نے فون بند کرکے اپنا یونیفارم اُتارا اور کپڑوں کی الماری میں لٹکا دیا۔ پھر اس نے اپنا شادی والا سُوٹ پہنا اور پولیس کے جوتے اُتار کر سیاہ رنگ کے عام جوتے پہنے اور اپنی بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"کیوں کیا تم مجھے نہیں لے جا رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے تمھارا جانا مناسب نہیں۔" جونی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میری نے آگے بڑھ کر اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ "میں تمھارے ساتھ خواہ مخواہ جانا نہیں چاہتی جونی! جب وہ لوگ اسے پکڑ لے جائیں گے تو تمھیں میری ضرورت ہوگی۔"

وہ اپنی بیوی کا شکرگزار تھا میری بہت کم عرصے میں اس سے واقف ہوگئی تھی۔

"کاش وہ یہاں نہ آتا میری۔ تم جانتی ہو کبھی وہ میرا بہترین دوست تھا۔" جونی نے کہا۔

"لیکن وہ قاتل ہے جونی؟"

"ہاں بے شک۔ لیکن میں اسے قاتل کی حیثیت سے نہیں جانتا میری! اس سے میری بہت سی خوش گوار یادیں وابستہ ہیں۔"

جونی نے غلط نہیں کہا تھا۔ جب پنا! میں انھیں تربیت دی جا رہی تھی تو اس وقت اس کی ملاقات گراہم سے ہوئی تھی۔ وہ بے حد مضبوط اور گٹھیلے جسم کا مالک تھا۔ وہ بہت سخت گیر آدمی تھا۔ جنگ میں وہ بڑی بے رحمی سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارتا تھا۔ لوگ اس سے خوف زدہ رہتے تھے کیوں کہ وہ فطری طور پر قاتل تھا۔ ظالم اور سفاک تھا لیکن جنگ میں یہی خصوصیات قابلِ تعریف ہوتی ہیں۔ جونی کو اس کا قریب ترین دوست کہا جاتا تھا۔ کچھ بھی ہو جونی نے گراہم کے ساتھ بے شمار خوش گوار لمحے گزارے تھے۔ گراہم ظالم اور سفاک ہونے کے باوجود بڑا زندہ دل آدمی تھا۔

ائیرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے جونی نے اپنی بیوی کو گراہم کے متعلق بتایا۔ "جنگ کے دوران میں گراہم ایک گولی سے زخمی ہوگیا تھا اور اسے محاذ سے ہٹا کر علاج کے لیے روانہ کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن مجھے بارہ سال کے عرصے میں اس کے متعلق خبریں ملتی رہیں۔ گراہم نے دولت کمانے کے لیے غیرقانونی ذرائع استعمال کرنے شروع کردیے تھے۔ وہ پولیس کو آدھے درجن مقدمات کے سلسلے میں مطلوب تھا اور جب اس نے اوکلاہاما میں ایک بینک لوٹا اور اس کی گولی سے بینک کا مسلح چوکیدار ہلاک ہوگیا تو ایف بی آئی کو اس کی طرف توجہ دینی پڑی۔ انھوں نے گراہم کا ماضی کھنگال ڈالا اور ہر اس شخص سے رابطہ قائم کیا جو کبھی گراہم سے قریب رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ گراہم کبھی نہ کبھی تو اپنے کسی دوست

سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ ایف بی آئی نے گراہم کے ماضی کے تمام دوستوں سے تعاون کی درخواست کی تھی کہ جب گراہم ان سے رابطہ پیدا کرے تو وہ فوراً انھیں اطلاع دے دیں۔"

"میں ایک چیز کی طرف سے پریشان ہوں جونی!" اس کی بیوی نے کہا۔ "کیا تمھیں یقین ہے کہ گراہم کو تمھارے پولیس میں ملازم ہونے کا علم نہیں ہے؟"

"اگر اسے اس حقیقت کا علم ہوتا تو وہ کبھی مجھے فون کرکے مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔ اس کا فون کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ میری پولیس کی ملازمت سے واقف نہیں ہے۔"

جب وہ ایئرپورٹ پہنچے تو دن ڈھل چکا تھا اور رات کی تاریکی پورے شہر پر تسلّط جما رہی تھی۔ جونی نے اپنی بیوی سے کہا۔ "سنو میری! تمھیں ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تمھیں کسی واقعے کے ظہور کی امید ہے۔ سمجھ گئیں ــ تم گراہم کو نہیں جانتیں۔ وہ معمولی معمولی باتوں سے خطرہ بھانپ لیتا ہے۔"

"کیا تمھیں گولیاں چلنے کی اُمید ہے؟"

"نہیں ایسا کوئی امکان نہیں ہے کیوں کہ گراہم ایف بی آئی والوں سے واقف نہیں ہے۔ وہ سادہ لباس میں ہوں گے اور اچانک اسے گھیر لیں گے اور اس سے پہلے کہ اسے کوئی احساس ہو، اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں گی۔"

ایئرپورٹ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے امریکن ایئرلائن کی عمارت کی طرف بڑھے۔ وہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس میں ہر طرف کاؤنٹر رکھے ہوئے تھے۔ کلرک سر جھکائے کام میں مصروف تھے۔ قلی اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور لاؤڈ اسپیکر وقفے وقفے سے طیّاروں کی آمدورفت کے متعلق ضروری معلومات نشر کر رہے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک آدمی ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ سیاہ تھا۔ اس کی چال سے پھرتی اور خود اعتمادی کا اظہار ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلا احساس یہی ہوتا تھا کہ وہ ہر قسم کے حالات سے بخوبی نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر جونی کا ہاتھ پکڑ لیا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرنے لگا۔ وہ جونی کو پُرانے القاب سے یاد کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اچانک اسے میری کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے معذرتی انداز میں اپنا سر خم کرکے اسے سلام کیا۔ "یہ ضرور ہماری بھابی ہیں۔ کیوں جونی؟"

"ہاں۔ ان سے ملو۔ یہ تمھاری بھابی میری ہیں۔" جونی نے تعارف کرایا۔

گراہم نے اپنا لمبا چوڑا پنجہ مصافحے کے لیے میری کی طرف بڑھا دیا اور ہنستے ہوئے اسے بتانے لگا کہ اس نے جونی جیسے کاہل، کام چور، احمق اور ناکارہ آدمی سے شادی کرکے بڑی زبردست غلطی کی ہے۔ لیکن اب جب وہ غلطی کر بیٹھی ہے تو وہ ضرور اپنی یہ غلطی نبھانے کی کوشش کرے گی۔ "جونی بس ذرا سا بے وقوف ہے بھابی! اگر اس کے سر پر کوئی موجود رہے تو بڑے کام کا آدمی ثابت ہوتا ہے۔" گراہم نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

میری صورتِ حال کی نزاکت اور سنگینی بھول کر اس کے قہقہوں میں شامل ہوگئی۔ پھر گراہم اسے جونی کے گزشتہ معاشقوں سے آگاہ کرنے لگا لیکن اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض مذاق کر رہا ہے۔ میری اس پُرمذاق آدمی کی دل چسپ باتوں میں ڈوب گئی۔

اس نے کئی مرتبہ اپنے شوہر کو چور نظروں سے عمارت کے صدر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ غالباً اس کے شوہر کو بے چینی سے ایف بی آئی والوں کا انتظار تھا۔ میری کو گراہم سے ملنے کے بعد آیندہ لمحات کے بارے میں سوچ کر بے حد افسوس ہونے لگا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں اس کی گرویدہ ہوگئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا مزے دار آدمی قاتل اور ڈاکو بھی ہوسکتا ہے ـــ

"کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے گراہم؟ کیا تمھیں بھوک نہیں لگ رہی ہے؟" اچانک جونی نے پوچھا۔

"تم نے کبھی مجھے شکم سیر دیکھا ہے؟ میں ہر وقت بھوکا رہتا ہوں" گراہم نے جواب دیا۔

"تو چلو ـــ یہاں ایک عمدہ ریستوران ہے۔ اس کا کھانا اچھا ہوتا ہے۔"

"یار لعنت بھیجو ریستوران پر، میری عمر گزر گئی ہوٹلوں کا کھانا کھاتے کھاتے۔ آج تو اپنی بھابی کے ہاتھ کا کھانا کھانے کو دل چاہ رہا ہے کیا خیال ہے؟ میرے جانے میں ابھی بہت دیر ہے۔ مجھے دو بجے کی پرواز سے جانا ہے۔"

جونی فوراً سمجھ گیا کہ یہ صرف عذرِ لنگ ہے۔ چونکہ پولیس اس کی تلاش میں ہے اس لیے وہ ایسی جگہ جانے سے پرہیز کرتا ہے جہاں وہ لوگوں کی نظروں کے سامنے رہے۔ نہ جانے کب کوئی پولیس والا یا ایف بی آئی کا کوئی ایجنٹ اسے دیکھ کر پہچان لے۔ جونی نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اَڑ گیا کہ آج تو وہ اپنی بھابی کے ہاتھ کا کھانا کھائے گا۔ جونی اسے اس لیے ٹال رہا تھا کہ اس طرح اس کے پروگرام میں گڑبڑ ہو جاتی۔

اس کی بیوی گراہم سے اس قدر متاثر ہوگئی تھی کہ اس نے فوراً کھانا پکانے کی ہامی بھرلی اور وہ سب جونی کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔

گاڑی چلاتے ہوئے رہ رہ کر جونی کا خون کھول رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنی دیر تک ایف بی آئی والے ایئرپورٹ کیوں نہیں پہنچے پھر جب اس کی بیوی نے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا تو اسے سکون ملا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ مارکیٹ کے پاس گاڑی روک دے تاکہ وہ کھانا پکانے کے لیے چند ضروری چیزیں خرید لے۔ وہ سمجھ گیا کہ میری اس بہانے لیفٹیننٹ گورڈن کو حالات کی تازہ ترین کروٹ سے آگاہ کرنا چاہتی ہے تاکہ گورڈن ایف بی آئی والوں کو منصوبے میں ردّوبدل کی اطلاع دے دے۔ مارکیٹ کھلی ہوئی تھی۔ جونی نے اس کے باہر گاڑی روک لی۔

"تم دونوں یہیں ٹھہرو۔" میری نے کہا "میں ابھی آئی۔ ایک منٹ میں۔"

میری نے پبلک بوتھ میں داخل ہونے سے پیشتر اس امر کا اطمینان کر لیا کہ کہیں اس کے شوہر یا گراہم نے اس کا تعاقب تو نہیں کیا ہے۔ پھر اس نے بوتھ کا دروازہ بند کر کے لیفٹیننٹ گورڈن کا نمبر ڈائل کیا اور اسے بتایا کہ کس مجبوری کے تحت منصوبے میں ردّوبدل کرنا ناگزیر ہو گیا تھا اور یہ کہ اب وہ تینوں جونی کے مکان پر جا رہے ہیں۔

"مجھے ابھی ابھی ایف بی آئی والوں نے ایئرپورٹ سے فون کیا تھا۔ وہ یہ معلوم کر رہے تھے کہ آخر تم لوگ کہاں چلے گئے۔ میں انھیں فوراً یہ نئی اطلاع دیتا ہوں۔" گورڈن نے کہا۔

میری نے اسے مختصر لفظوں میں بتایا کہ اس کا شوہر غیر مسلح ہے اور گراہم یقیناً مسلح ہوگا اس لیے ہم گراہم کی بات ماننے پر مجبور تھے تاکہ اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔

"تم فکر نہ کرو میری،" گورڈن نے اسے اطمینان دلایا "تمھارے گھر



پہنچتے ہی وہ لوگ گھر کا محاصرہ کر لیں گے۔"

"کیا انھیں ہمارے گھر کا پتہ معلوم ہے؟" میری نے پوچھا۔

"مجھے امید نہیں ہے۔" لیفٹیننٹ گورڈن نے جواب دیا۔ "میں ان کی رہنمائی کے لیے اپنا کوئی آدمی ان کے ساتھ بھیج دوں گا۔ تم گھبرانا مت۔ وہ لوگ تمھارے فلیٹ میں گھسنے کی حماقت نہیں کریں گے کیوں کہ تمھارا فلیٹ مختصر ہے اور وہاں تم بھی موجود ہوگی۔ وہ لوگ چھپ کر گراہم کے باہر نکلنے کا انتظار کریں گے۔ اسے دو بجے پرواز کرنا ہے اس لیے وہ غالباً ایک بجے تمھارے فلیٹ سے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوگا۔"

"وہ لوگ اسے کس طرح گرفتار کریں گے؟ کیا گولیاں وغیرہ ---"

"نہیں میرا خیال ہے اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی تم ایسا کرنا کہ کسی بہانے اپنے فلیٹ سے نکل کر انھیں وقت سے پہلے گراہم کی روانگی سے مطلع کر دینا۔ تمھارا فلیٹ پہلی منزل پر ہے۔ تم کوڑا کرکٹ ڈالنے کے بہانے باہر آجانا۔ عمارت کے پچھواڑے ہمارا ایک آدمی موجود ہوگا لیکن خیال رکھنا۔ گراہم بہت تیز آدمی ہے۔ اسے شبہ نہ ہونے پائے۔"

میری نے فون بند کر دیا اور جلدی سے دکھانے کے لیے چند چیزیں خریدیں اور گاڑی میں واپس آ گئی۔ اس کے شوہر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے گراہم کی توجہ دوسری طرف دیکھ کر آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خوف زدہ ہونے سے زیادہ پریشان تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کے قریب بیٹھا ہوا آدمی قاتل ہے اور جس لمحے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑیں گی اس کی زندگی کے لمحات محدود ہو جائیں گے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس کا شوہر کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھے۔ گراہم لاکھ اس کا دوست سہی

ایک فرانسیسی شخص سوئٹزرلینڈ کے ایک پہاڑ پر چڑھ رہا تھا‘ اُس کے رہنما نے کہا ”اِس بات کی احتیاط رکھیں کہ کہیں آپ گر نہ جائیں۔ یہ جگہ بہت خطرناک ہے لیکن اگر آپ کسی باعث گر جائیں تو دائیں جانب دیکھنا نہ بھولیے، اُدھر نظارہ بے حد دلچسپ ہے۔“

لیکن اپنی زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اسے سب سے زیادہ فکر ان جاسوسوں کی تھی جو اس کے فلیٹ کی نگرانی کریں گے۔ اس کے شوہر کا تبادلہ صرف چند روز پہلے ہالی وُڈ کے تھانے میں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ وَردی پہن کر تھانے جاتا تھا۔ جاسوسوں سے جو ہمیشہ سادہ لباس میں رہتے ہیں اس کی ملاقات شاذ و نادر ہی ہوتی تھی اس لیے ان سے یہ اُمید رکھنی فضول تھی کہ وہ جونی کو شکل سے پہچانتے ہوں گے کیونکہ اس کا شوہر بھی سادہ لباس میں ہے اس لیے وہ دھوکا کھا سکتے ہیں۔ وہ اس کے شوہر کو گراہم نہ سمجھ بیٹھیں۔

جونی نے عمارت کے باہر گاڑی کھڑی کر دی۔ گراہم نے فلیٹ دیکھ کر بڑی تعریف کی۔ میری نے دونوں مَردوں کے اُوَر کوٹ اور ہیٹ کپڑوں کی الماری میں لٹکا دیے پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ باورچی خانے میں دونوں دوستوں کے درمیان ہونے والی گفتگو آسانی سے سُن رہی تھی۔ وہ دونوں پُرانی یادیں دُہرا رہے تھے۔ جنگ اور جنگ کے دوران میں ہونے والے تجربات گفتگو کا موضوع تھے۔ میری کے ہاتھ کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ اس کے کان دونوں کی باتوں پر لگے ہوئے تھے اور ذہن آنے والے لمحات میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کسی طرح نیچے جا کر جاسُوسوں سے گفتگو کرنی چاہیے۔ انھیں موجودہ صورتِ حال سمجھانی ضروری ہے۔ انھیں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ دونوں مَردوں میں سے کون اس کا شوہر ہے اور کون گراہم ہے‘ لیکن اسے ڈر تھا کہ گراہم چونکہ پہلے ہی سے چوکنّا ہے اسی لیے اس نے ہوٹل میں کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر وہ خواہ مخواہ باہر جانے کی کوشش کرتی ہے تو ممکن ہے گراہم کو اس پر شُبہ ہو جائے اور وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے اور باہر نگرانی کرنے والے جاسوسوں کو دیکھ لے۔ وہ صرف یہی کر سکتی تھی کہ باورچی خانے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر نیچے دیکھ لے۔ وہ لوگ ہر طرف موجود تھے۔ میری کو فوراً احساس ہو گیا کہ ایف بی آئی اور پولیس نے عمارت گھیرے میں لے لی ہے۔ اس لیے گراہم کے بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یا تو وہ اسے پکڑ لیں گے یا گولی مار دیں گے۔

میری نے عجلت میں پکا ہوا کھانا ان کے سامنے رکھ دیا۔ کھانے کے دوران بھی گفتگو جاری رہی۔ جب کھانا ختم ہوا تو وہ برتن وغیرہ دھو کر گفتگو میں شامل ہو گئی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ باہر مکمل خاموشی طاری تھی۔

جونی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ گراہم کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سُن رہا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ اپنی بیوی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا لیکن میری میں اتنی جُرأت نہیں تھی کہ وہ گراہم کے سامنے اپنے شوہر کو کسی قسم کا اشارہ بھی دے سکے۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور اب گراہم کے جانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ انتظار کے اذیت ناک لمحات نے میری کی حالت بھی دِگرگوں کر دی تھی اب اسے گراہم کے حشر کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے صرف اپنے شوہر کا خیال تھا اور آنے والے لمحات کا خیال اسے پریشان کیے دے رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ گراہم کو گولی چلائے بغیر گرفتار کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اسے اپنے شوہر کی طرف سے اُمید تھی کہ وہ چونکہ غیر مسلح ہے اس لیے اس وقت جب گولیاں چل رہی ہوں گی تو گراہم کو گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کی خواہش تھی کہ جونی اس ڈرامے میں کوئی فعال کردار ادا نہ کرے۔

اچانک گراہم کرسی سے اُٹھا اور کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھا۔ میری نے اسے الماری کھول کر اُوَر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا ایک نیا پیکٹ نکالتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ سُلگائی اور انھیں دیکھ کر مُسکرانے لگا۔ چند گہرے کش لینے کے بعد وہ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اس نے پردہ ذرا سا ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

”اچھا منظر نظر آتا ہے یہاں سے۔“ گراہم نے کہا اور واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری سانس روکے خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اطمینان سے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اعشاریہ پینتالیس کا فوجی ریوالور باہر نکالا۔ ”تو تم پولیس والے ہو جونی؟“ گراہم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمھیں کیسے خیال آیا؟“ جونی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”میں نے الماری میں ابھی ابھی پولیس کی وَردی لٹکی ہوئی دیکھی ہے۔“

"تو کیا ہوا؟ کیا پولیس کی ملازمت کرنا اتنا بُرا پیشہ ہے؟" جونی نے ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"ہاں" گراہم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "خاص طور پر ایسی صورت میں جب باہر بھی پولیس والے کھڑے ہوں۔ میں نے کھڑکی سے باہر دو پولیس والوں کو دیکھا ہے۔ ایک کے پاس شاٹ گن ہے۔ انھوں نے اس بلڈنگ کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ کیا تمھیں علم نہیں ہے جونی؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" جونی نے جھوٹ بولنا بے کار سمجھا، پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔ "تمھارے لیے بہترین مشورہ یہی ہو سکتا ہے گراہم کہ تم اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔"

"مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی جونی۔" گراہم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ کمرے پر سناٹا طاری ہو گیا۔

کچھ دیر بعد جونی نے سر اُٹھا کر کہا: "انھیں ہماری دوستی کا علم تھا۔ انھوں نے اندازہ لگایا تھا کہ ممکن ہے تم کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش کرو۔ یہ سارا منصوبہ بہت پہلے سے بنا ہوا تھا۔"

"باہر کُل کتنے آدمی ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" جونی نے جواب دیا۔

"بہت زیادہ ہیں گراہم۔ تمھارے بچ نکلنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔" میری نے کہا۔

"مَیں نہیں مانتا۔ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا: "اگر ان کا اندر داخل ہو کر مجھے گرفتار کرنے کا پروگرام ہوتا تو وہ اب تک یہ کام کر چکے ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک میں اس فلیٹ میں ہوں اس وقت تک محفوظ ہوں۔ لیکن میں کب تک یہاں رُک سکتا ہوں۔ مجھے یہاں سے نکلنا تو پڑے گا۔"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا گراہم۔"

"لیکن چوہوں کی طرح خود کو ان کے حوالے کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک میں آزاد ہوں، زندہ ہوں۔ آزادی ختم، زندگی بھی ختم۔"

جونی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش رہا۔ گراہم نے میری کی طرف دیکھا: "تم نے مارکیٹ سے انھیں فون کر کے بتایا تھا کہ ہم لوگ یہاں آ رہے ہیں؟"

میری نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر انھوں نے کیا کہا؟"

"یہی کہ وہ تمھارا باہر انتظار کریں گے۔"

ایک خاتون کتاب خریدنے کے لیے ایک دکان میں گئی۔ اس نے اپنی پسند کی کتاب تلاش کی۔ وہ یہ کتاب لفافے میں ڈالنے کے لیے سیلز مین کے حوالے کرنے والی تھی، اس نے دیکھا کہ جلد پر دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ خاتون نے سیلز مین سے کہا: "یہ کتاب بہت گندی ہے۔"

"میں نہیں جانتا خاتون۔" جواب ملا۔ "میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔"

"تمھارا ریوالور کہاں ہے جونی؟"

جونی نے اسے بتایا کہ اس نے اپنا ریوالور صفائی کے لیے دے دیا ہے۔

"تم بالکل احمق ہو ___" گراہم نے کہا۔ "کسی ہتھیار کے بغیر تم مجھے کس طرح گرفتار کرتے؟"

"تم پر ہاتھ ڈالنا میرا کام نہیں تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایف بی آئی کے دو ایجنٹ ایئرپورٹ پر تمھیں اچانک گھیر لیں گے۔ میں جتنی دیر تک ممکن تھا، تمھیں ایئرپورٹ پر روکے رہا لیکن وہ لوگ وہاں نہیں پہنچے۔ میں کیا کرتا؟ اگر میں تمھاری مخالفت کرتا اور تمھیں مزید وہاں روکنے کی کوشش کرتا تو تمھیں شبہ ہو جاتا۔"

"بے شک، مجھے فوراً شک ہو جاتا۔" گراہم کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا: "جونی! تم نے مجھے اس مصیبت میں پھنسایا ہے، اب تم ہی مجھے اس سے باہر نکالو۔ میرا خیال ہے، اس جگہ سے باہر نکلنے کا ضرور کوئی ایسا راستہ ہو گا جس کا باہر والوں کو علم نہیں ہو گا۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو گراہم۔ کیا تم انھیں احمق سمجھتے ہو۔"

"تم کوئی ترکیب سوچو جونی! کوئی عمدہ ترکیب۔ میں زیادہ دیر یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔"

"ورنہ تم کیا کرو گے؟" جونی نے پوچھا۔

"میں میری کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا جونی! وہ تمھاری بیوی اور میری بھابی ہے۔ مجھے اس امر پر مجبور نہ کرو مگر میرے سامنے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے ___" گراہم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا گراہم۔"

"میں تمھاری بیوی کو اپنے ساتھ باہر لے جاؤں گا۔ اگر کسی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میں میری کو شوٹ کر دوں گا ___ میں مذاق نہیں

کر رہا ہوں جونی ۔ تم مجھے جانتے ہو۔"

جونی گراہم کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گراہم بے تکلف یہ سب کچھ کر گزرے گا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ "سنو گراہم۔" جونی نے جلدی سے کہا۔ "تمھیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ آزادی کے چند لمحے ملیں گے۔ زیادہ دیر تک تم ان سے بچ نہیں سکو گے۔"

"تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ مجھے آزادی کے چند ہی لمحے مل سکیں گے؟ اس کا فیصلہ تو وقت آنے پر ہوگا۔ تم اپنی بیوی کو خطرے میں دیکھ کر کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنا جونی! تم میرے دوست ہو، تمھیں گولی مارتے ہوئے مجھے بڑا افسوس ہوگا۔"

میری نے گھبرا کر دونوں کو باری باری دیکھا۔ دونوں دھیمی آواز اور پُرسکون لہجے میں گفت گو کر رہے تھے۔ میری کو یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی اس کی زندگی خطرے میں ہے اور یہ دونوں مرد اس کی زندگی کے بارے میں گفت گو کر رہے ہیں۔ اسے یہ سب خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ حقیقی دُنیا میں بھلا یہ سب کچھ کہاں ہوتا ہے؟

"ہم لوگ ایک دائرے میں چل رہے ہیں گراہم۔" میری نے حیرت انگیز طور پر پُرسکون لہجے میں کہا۔ "باہر جو لوگ تمھارے منتظر ہیں وہ اس وقت تک کوئی عملی قدم نہیں اُٹھائیں گے جب تک ہم لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ اس جگہ کا غیر معیّنہ مدّت تک محاصرہ کر سکتے ہیں مگر ہم لوگ غیر معینہ مدّت تک یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔"

"درست ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، ہم دونوں ایک ساتھ باہر جائیں گے۔ جونی نہیں رہے گا۔ ہم دونوں بہت قریب قریب چلیں گے۔ میں اپنے ریوالور کی نوک تمھاری پسلیوں سے لگائے رہوں گا۔ اس طرح وہ ہمارے قریب بھی نہیں آئیں گے اور نہ وہ مجھ پر گولی چلانے کی جرأت کریں گے۔"

کمرے پر خاموشی طاری ہو گئی۔ گھڑی کی سُوئیاں برابر آگے بڑھ رہی تھیں۔ ہر شخص گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ "کیا تم میرے دشمن ہو جاؤ گے جونی؟" پانچ منٹ بعد گراہم نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ تم جو حرکت میری کے ساتھ کرو گے، اس کے بعد میں کس طرح تمھارا دوست رہ سکتا ہوں۔ میں تم سے ضرور بدلہ لوں گا۔" جونی نے جواب دیا۔

"باہر جو لوگ موجود ہیں وہ سادہ لباس والے جاسوس ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"اور تم وردی میں رہتے ہو۔ کتنے جاسوس تمھاری شکل سے واقف ہیں؟"

"چند ایک۔" جونی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنے فلیٹ کی سب کھڑکیوں سے جھانک کر تمام جاسوسوں کو دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ تم ان میں سے کس کس سے واقف ہو۔"

جونی کے ساتھ اس کی بیوی بھی کھڑی ہو گئی۔ گراہم نے دونوں کو ریوالور کی زد پر لے لیا۔ جب وہ واپس آئے تو جونی نے کہا: "میں ان میں سے ایک سے بھی واقف نہیں ہوں۔"

"پورے یقین سے کہنا جونی!" گراہم نے اسے تنبیہ کی۔ "اگر تم نے جھوٹ بولا تو اس کا خمیازہ تمھاری بیوی کو بھگتنا پڑے گا۔"

"میں سچ بول رہا ہوں گراہم لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس عمارت کی پشت پر کون ہے۔ اگر وہ ایف بی آئی کے آدمی ہوئے تو وہ مجھ سے واقف ہیں اور میں ان سے واقف ہوں۔ میں ان کی ذمّے داری نہیں لے سکتا۔"

گراہم یہ سُن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "میرا خیال ہے جونی! میرا منصوبہ پھر بھی کامیاب رہے گا۔ ضرور کامیاب رہے گا۔ تمھیں یاد ہے، فوج میں ہم دونوں ایک دوسرے کی یونیفارم آسانی سے پہن لیتے تھے۔ تمھارا لباس مجھے بالکل صحیح آتا تھا؟"

"ہاں پھر؟"

"ہم آج بھی یہی کریں گے۔ میں تمھاری پولیس والی وردی پہن کر میری کے ساتھ باہر نکلوں گا۔ اگر تمھارا بیان درست ہے کہ تم ان سے واقف نہیں ہو تو وہ مجھے وردی میں دیکھ کر ضرور دھوکا کھا جائیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ میں جونی ہوں۔ تمھاری بیوی کی موجودگی ان کے ذہنوں میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہونے دے گی۔ اس طرح میں انھیں جھانسا دے کر آسانی سے نکل جاؤں گا۔ پھر جب وہ اندر میری تلاش میں آئیں گے تو ان پر اس دھوکے کا انکشاف ہوگا۔ بس مجھے اتنی ہی مہلت درکار ہوگی لیکن اگر تم جھوٹ بول رہے ہو تو پھر میں اپنی جان بچانے کے لیے تمھاری بیوی کو استعمال کروں گا۔"

"ممکن ہے تمھارا منصوبہ کامیاب ہو جائے لیکن مجھے شبہ ہے۔" جونی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا خرابی ہے اس میں؟"

"مثلاً یہ کہ تم باہر نکل کر سادہ لباس والے جاسوسوں سے کہو گے کہ تم دراصل جونی ہو۔ وہ تمھارے بیان پر کیوں یقین کرنے لگے؟" جرنی نے اعتراض کیا ___

"اس لیے کہ انھیں اندر ہونے والی اس گفتگو کا علم نہیں ہے۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ مجھ پر یہ انکشاف ہوگیا ہے کہ تم پولیس والے ہو۔ میں ان سے کہوں کہ گراہم اگلے دروازے سے باہر نکلنے والا ہے' میں اور میری بیوی پچھلے دروازے پر اس امر کی اطلاع دینے آئے ہیں۔ وہ مجھ پر یقین کرلیں گے کیونکہ ان کے خیال میں وردی میں ان کے سامنے جونی ہوگا۔ وہ فوراً اگلے دروازے کی طرف دوڑ پڑیں گے تاکہ سب کو یہ اطلاع دی جاسکے۔"

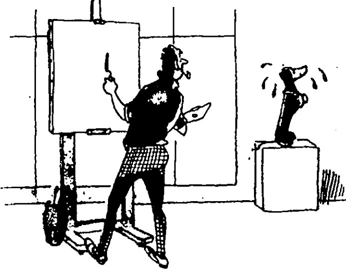
"اور پھر؟"

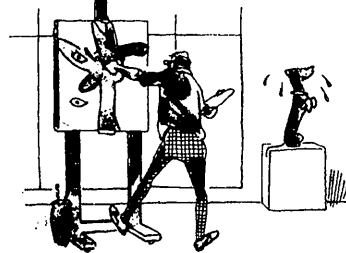
"پھر میں ہاتھ دے کر کوئی بھی کار روک لوں گا۔ جب کوئی سپاہی کسی شہری کو رکنے کا اشارہ کرتا ہے تو ہر شہری اس اشارے کی اطاعت کرتا ہے پھر میں اپنی وردی کے زور پر یا ریوالور کی زد پر اسے اپنی مرضی سے گاڑی چلانے پر مجبور کردوں گا۔ اب بتاؤ کیا خرابی ہے اس میں؟"

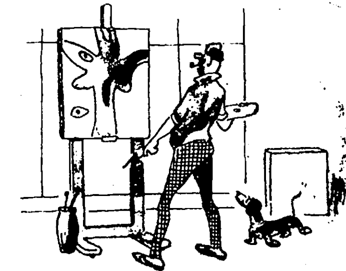
"چلو مان لیا کہ تمھارا منصوبہ درست ہے لیکن جب تم پولیس کی وردی میں جونی بنے ہوئے خود اپنی بیوی پر ریوالور تانے باہر نکلو گے تو کیا وہ لوگ مشکوک نہیں ہوجائیں گے؟" جرنی نے دوسرا اعتراض کیا۔

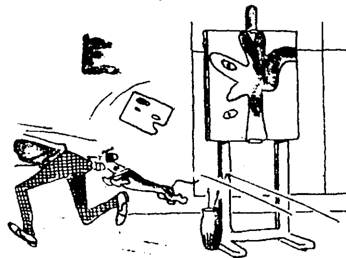
"میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرا ریوالور والا ہاتھ بالکل تیار جیب کے اندر ہوگا۔ میں تمھاری وردی پہنے ہوئے باہر نکلوں گا اور سیدھا ان جاسوسوں کے پاس جاؤں گا۔ میں ان سے کہوں گا کہ گراہم اگلے دروازے سے باہر نکلنے والا ہے اور اس وقت غسل خانے میں ہے۔ ہم موقع پاکر باہر نکل آئے ہیں اور یہ کہ انھیں جلدی کرنی چاہیے۔ وہ یہ سنتے ہی دوڑ جائیں گے۔ اس سے عمدہ اور کوئی منصوبہ نہیں ہوسکتا جونی۔ اگر تمھارے ذہن میں کوئی اس سے اچھی ترکیب ہو تو بتاؤ۔ میں ہمیشہ تو تمھارے فلیٹ میں نہیں رک سکتا۔"

جونی کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا "میری! تم کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں گراہم کو جانتا ہوں۔ یہ جو کہتا ہے کر گزرتا ہے۔ میں یہیں رکوں گا اور فون کے ذریعے لیفٹیننٹ کو پوری صورتِ حال سمجھا دوں گا ورنہ ممکن ہے وہ لوگ عجلت میں اندر گھس کر کچھ سوچے سمجھے بغیر فائرنگ شروع کردیں۔ میرے پاس تو بچاؤ کے لیے ریوالور بھی نہیں ہے۔ میں دروازہ بند کرلوں گا۔ تم باہر ہی ٹھیرنا ___ جب لیفٹیننٹ پوری صورتِ حال سمجھ لے گا تو وہ خود یہاں آجائے گا تاکہ دوسروں کو سمجھا سکے









کہ اندر گراہم نہیں ہے بلکہ میں ہوں۔ اُس وقت تم خود آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دینا اور مجھے پکارنا ورنہ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو جونی!" گراہم نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"میری! تم ان ہدایات کا خیال رکھنا ورنہ جونی کی جان خواہ مخواہ خطرے میں پڑجائے گی اور ہاں جونی! تم بھی ہیرو بننے کی کوشش نہ کرنا میرا وعدہ ہے کہ جب تک میں محفوظ ہوں، میری کا بال بیکا نہیں ہوگا۔"

گراہم نے کپڑوں کی الماری سے جونی کی وردی نکالی۔ چند لمحوں بعد وہ پولیس یونیفارم میں ملبوس تھا۔ اس نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں لگالیا۔ چند لمحے دونوں دوست ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ "میری کا خیال رکھنا گراہم۔" جونی نے کہا۔

"ضرور، تم فکر نہ کرو۔"

"سب ٹھیک ہوجائے گا جونی! بے فکر رہو۔" میری نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ جونی واپس ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ گراہم نے آہستہ سے میری سے کچھ کہا اور پھر دروازہ کھولا۔ وہ دونوں دروازہ بند ہوتے ہی جونی کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

جونی ڈرائنگ روم میں پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ اس کے کان باہر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ گیند اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اب کھیل کا دارومدار اس کے مقابل پر تھا۔ خاموشی کے وہ چند لمحات اسے صدیوں کے برابر محسوس ہوئے۔ پھر اس نے تیز لہجے میں چند آوازیں سنیں اور اس کے بعد اسے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ہتھکڑیوں کے بند ہونے کی آواز —

وہ دوڑتا ہوا بغلی دروازے سے باہر نکلا۔ اچانک ٹارچ کی طاقت ور روشنی اس کی آنکھوں پر پڑی اور وہ وقتی طور پر اندھا ہوگیا۔

"ہینڈز اَپ۔" کسی نے غرّا کر کہا۔ جونی نے جلدی سے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھالیے۔ وہ آواز اس کے لیے اجنبی تھی۔ پھر کوئی اس کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے میری کی نازک باہیں اس کی گردن میں تھیں۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ "اوہ ڈارلنگ — جونی ڈارلنگ —" میری بار بار یہی الفاظ دُہرا رہی تھی۔ ٹارچ گُل کر دی گئی۔ اس نے اپنی بیوی کو مضبوطی کے ساتھ بازوؤں میں پکڑ لیا اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اس نے اپنی طرف سات یا آٹھ ہیولے بڑھتے دیکھے۔ تین سائے اس کے بالکل قریب آگئے۔ درمیان والا سایہ گراہم تھا۔ اس کے دونوں طرف دو سادہ لباس والے جاسوس تھے۔ "کیا یہ ٹیکس گراہم ہے؟" ایک جاسوس نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ ٹیکس گراہم ہے۔" جونی نے کہا اور اپنے دوست کو دیکھا جو اس کی وردی پہنے ہوئے کھڑا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

"مجھے اُمید نہیں تھی جونی کہ تم اس طرح اپنی بیوی کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کرو گے۔" گراہم نے اس سے کہا۔ پھر اسے خاموش دیکھ کر اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "جب تم نے یہ کہا تھا کہ تم ان میں سے کسی جاسوس سے واقف نہیں ہو تو میں یہی سمجھا تھا کہ تم سچ بول رہے ہو لیکن....."

"میں ان سے واقف نہیں ہوں گراہم۔ میں نے تم سے جھوٹ نہیں کہا تھا۔" جونی نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"بس بس رہنے دو۔ تم اب ایک جھوٹ نبھانے کے لیے دوسرا جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ میں جیسے ہی باہر نکل کر اس جاسوس کے قریب پہنچا، اس نے کچھ کہے سُنے بغیر میرے ہولسٹر پر ہاتھ ڈال کر میرا ریوالور نکال لیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کرسکتا، یہ مجھ سے لپٹ گیا۔ فوراً ہی اس کا دوسرا ساتھی اس کی مدد کو آگیا۔ پھر چند لمحوں میں انھوں نے مجھے بے بس کر کے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں — اگر یہ دونوں تم سے واقف نہ ہوتے تو میری بات سُنے بغیر مجھے دیکھتے ہی اس طرح کیوں جھپٹتے؟"

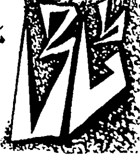
"تمھاری بے وقوفی کی وجہ سے گراہم۔" جونی نے جواب دیا۔ "جب تم نے میری وردی پہن کر اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کا ذکر کیا تھا، میں اسی وقت تمھاری بے وقوفی سمجھ گیا تھا۔ لیکن میں نے اعتراضات کر کے یہ ظاہر کیا جیسے میں تمھارے اس منصوبے کا مخالف ہوں۔ مجھے ان لوگوں سے بالکل اسی ردِّعمل کی توقع تھی اور یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی مجھے نہیں جانتا۔"

"لیکن کس طرح جونی؟ آخر کس طرح؟ مجھ سے کیا بے وقوفی ہوئی تھی؟ میرے منصوبے میں کیا خرابی تھی؟"

"تم نے خود ہی تو کہا تھا گراہم۔" جونی نے جواب دیا۔ "کہ باہر کھڑے ہوئے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے اور انھیں یہ معلوم نہیں کہ تمھیں میرے پولیس میں ہونے کا علم ہوگیا ہے۔ یہی نکتہ اہم ہے — ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ تم میری حقیقت سے آگاہ ہوگئے ہو اس لیے جب تم میری وردی میں میری کے ساتھ باہر نکلے تو تمھیں اس وردی میں دیکھتے ہی انھیں یقین ہوگیا کہ اس وردی میں جونی نہیں ہوسکتا بلکہ مجرم ہی ہوسکتا ہے کیونکہ یہ عقل میں آنے والی بات نہیں تھی کہ میں ایک ایسے مجرم کے سامنے جس کی پولیس کو شدت سے تلاش ہے، شہری لباس اتار کر پولیس کی وردی پہن سکتا ہوں۔ وردی میں ملبوس شخص مجرم ہی ہوسکتا تھا۔ میں وردی نہیں پہن سکتا تھا۔"



یقین کیجئے یہ کہانی بھی ہنری سلاسَر نے لکھی ہے، وُہی ہنری سلاسَر جو جرم و سزا کی کہانیوں کے خالق کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

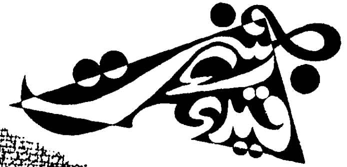


مَر چکا تھا۔ رَیلے نیم مُردہ تھا اور سارجنٹ ہیری اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ کھیتوں میں روپوش ہو چکا تھا۔ بوگاش اکیلا رہ گیا تھا اور اب اُسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنی کمپنی سے جا ملے یا دُشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ پھر جب اچانک دَرختوں کے ایک جھُنڈ سے خاکی وردی میں دُشمن کے سپاہی نمودار ہوئے تو بوگاش اس تکلیف دہ فیصلے سے بچ گیا۔ اس نے کوئی مزاحمت کیے بغیر اپنی رائفل زمین پر ڈال دی اور دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا دیے۔ بوگاش کی عمر بیس سال تھی۔ جنگ کے دوران اسے زبردستی فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا اور مختصر سی تربیت کے بعد محاذ پر روانہ کر دیا گیا تھا۔ وہ چار آدمیوں پر مشتمل ایک پٹرولنگ جیپ میں سوار تھا کہ اچانک کسی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہو گئی تھی اور نتیجے کے طور پر اب وہ دشمن کا قیدی بن چکا تھا۔

دُوسری کہانی۔

★

ش۔م۔ جمیل



مسلسل تین گھنٹے پیدل مارچ کرنے کے بعد بوگاش دشمنوں کے عارضی کیمپ میں داخل ہوا۔ پھر اسے ایک فوجی ٹرک میں سوار کر کے دوسرے جنگی قیدیوں کے ہمراہ فوجی کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ٹرک تمام رات چلتا رہا اور صبح کے وقت کیمپ میں داخل ہوا۔ وہاں ان کی فوجی وردیاں اُتار لی گئیں اور انھیں گرم گرم غسل کے بعد قیدیوں کا لباس پہنایا گیا۔ قیدیوں کا لباس بوگاش کی فوجی وردی سے بدرجہا بہتر تھا۔ عمدہ تراش خراش اور بہترین کپڑا۔ پھر بوگاش کو کیمپ کے کمانڈنگ افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔

"جنیوا کنوینشن کے طے شدہ اصولوں کے مطابق" کمانڈنگ افسر نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اپنے نام، درجے اور نمبر کے علاوہ کچھ اور بتانے کے پابند نہیں ہو۔ ہمیں تمھارے بارے میں یہ معلومات پہلے ہی حاصل ہو چکی ہیں۔ اس ملاقات کا اصل مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ میں یہاں کا افسر ہوں اور تم سے اپنے کیمپ کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرنے کی توقع رکھتا ہوں۔ تم سمجھ گئے؟"

بوگاش عادت کے مطابق "یس سر" کہنے والا تھا لیکن اچانک اسے خیال آ گیا کہ اس کے سامنے اس کا کوئی افسر نہیں ہے بلکہ یہ تو دشمن فوج کا افسر ہے۔ چنانچہ اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"صاحب زادے! کیا عمر ہے تمھاری؟" کرنل نے مہذب انداز میں پوچھا۔ اس کی مسکراہٹ میں گرم جوشی پیدا ہونے لگی۔ "تم چاہو تو اس سوال کا جواب دینے سے انکار کر سکتے ہو۔"

بوگاش نے اسے اپنی عمر سے آگاہ کیا۔ کرنل اُداس ہو گیا۔ "آہ— تم اُس وقت بچے تھے جب یہ جنگ شروع ہوئی تھی۔" کرنل نے کہا۔ "تمھاری والدہ کو یہ اُمید ہوگی کہ تمھارے جوان ہونے تک یہ جنگ ختم ہو چکی ہوگی۔ خیر۔ اب یہ جنگ زیادہ عرصے جاری نہیں رہے گی۔ اسے ختم ہونا پڑے گا—"

بوگاش کے لیے جنگ بچپن ہی سے معمولات میں داخل تھی، اسے کرنل کی زبانی جنگ ختم ہونے کی خبر سن کر اس پر یقین نہیں آیا۔

انٹرویو ختم ہونے کے بعد اسے اس کا کمرہ دکھایا گیا۔ وہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں آسانی سے تین چار قیدی رکھے جا سکتے تھے۔ لیکن وہاں صرف ایک مسہری تھی، بے حد آرام دہ۔ فرش پر بے حد عمدہ قالین، جدید طرز کے چند صوفے، اطالوی کرسیاں، ایک الماری میں مختلف شرابوں کی سربمہر بوتلیں تھیں، ایک الماری صرف لباس رکھنے کے لیے تھی۔ اس میں قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ ایک کونے میں بیسن تھا۔ اس میں گرم ٹھنڈے پانی کا انتظام تھا اور بیسن کے اوپر شیو بنانے کا مکمل سامان موجود تھا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی خوابناک روشنی ہو رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کمرہ فوج کے کسی اعلا عہدے دار کا تھا جو غلطی سے یا کسی اور وجہ سے بوگاش کو دے دیا گیا تھا لیکن بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ اس کے تمام ساتھیوں کے کمرے بالکل ایسے ہی شان دار ہیں اور قیمتی فرنیچر اور شراب سے سجے ہوئے ہیں۔

مسہری پر بچھا ہوا گدا اس قدر آرام دہ تھا اور اس پر رکھا ہوا کمبل اتنا ملائم اور گرم تھا کہ بوگاش اس پر دراز ہوتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔ ایک گھنٹے بعد اچانک اس کی آنکھ کھلی تو اسے یاد آیا کہ اس نے اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے کمرے کے دروازے پر اپنے نام کی تختی لگی ہوئی دیکھی تھی۔ اس نے غنودگی کے عالم میں سوچا کہ اسے یہ کمرہ غلطی سے نہیں دیا گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ ایک جنگی قیدی تھا لیکن اسے رہنے کے لیے ایسا شاہانہ کمرہ دیا گیا تھا جو اسے خود اپنے مُلک میں بھی میسر نہیں تھا۔ یہ گتھی سلجھاتے ہوئے وہ دوبارہ سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے سے کھلی تھی۔ ٹیلی فون کا رنگ سفید تھا۔ بوگاش نے ناقابلِ یقین نظروں سے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ گھنٹی بدستور بج رہی تھی۔ اس نے حیرت زدگی کے عالم میں ریسیور اٹھایا اور "ہیلو" کہا۔

"صبح بخیر!" دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "ناشتے کا وقت ہو گیا ہے مسٹر بوگاش۔ آپ سات بجے میس ہال میں تشریف لے آئیں۔"

ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔ بوگاش نے جلدی جلدی شیو بنایا اور لباس تبدیل کر کے اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ سورج نکل آیا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی ایک قطار میں مارچ کرتے ہوئے ناشتے کے لیے میس ہال کی طرف جا رہے تھے۔ وہ خود بھی قطار میں شامل ہو گیا۔ پھر اسے اپنا ایک واقف کار چیسٹر نظر آیا۔ وہ قطار سے نکل کر اس کے پیچھے پہنچ گیا۔

"ہیلو چیسٹر!" بوگاش نے سرگوشی میں کہا۔ "تم یہاں کتنے عرصے سے ہو؟ یہ کون سی جگہ ہے؟"

"گھبراؤ نہیں پیارے!" چیسٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جب میں یہاں آیا



کا بیوپاری ہمیشہ اچھی گندم میں بُری گندم ملا کر فروخت کیا کرتا تھا، اس طرح اس نے خاصی دولت کمالی۔ جب گناہ کا بوجھ زیادہ محسوس ہوا تو وہ سیدھا گرجے میں پہنچا اور پادری کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہا: "مقدس باپ! میں اپنے اس گناہ کی وجہ سے بہت ہلکان ہو رہا ہوں، مسیح کے لیے دعا کیجیے کہ خدا میرے گناہ کو معاف کر دے۔"

پادری نے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کر دی۔ مدتوں بعد جب یہ بیوپاری دوبارہ پادری کے پاس پہنچا تو پادری نے اس سے دریافت کیا: "تمھاری اُس توبہ کا کیا ہوا؟"



اس شخص نے اطمینان سے جواب دیا: "میری توبہ خدا نے قبول کی اور آپ کی دعا بابِ اجابت کو پہنچ گئی کیونکہ اس کے بعد سے آج تک میں نے اچھی گندم میں بُری گندم ملانے کا کام نہیں کیا بلکہ اب میں بُری گندم میں اچھی گندم ملا دینے کا نیک کام انجام دینے لگا ہوں۔"

تھا تو میری بھی یہی حالت تھی جو اس وقت تمھاری ہے۔ مجھے تین ہفتے ہو گئے ہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ واقعی جنگی قیدیوں کا کیمپ ہے۔"

"لیکن ــ لیکن یہ سب کیا ہے۔" بوگاش نے بے بسی سے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ یہ آخر کس ڈرامے کی ریہرسل ہے۔ کیا یہ لوگ اس طرح ہمارے دل جیتنا چاہتے ہیں؟"

چیسٹر نے اسے آنکھ ماری۔ "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی ذہنی تطہیر کا ایک طریقہ ہے ہوا کرے۔" اس نے سر جھٹکا۔ "کم از کم مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ اس چکر میں نہ پڑو پیارے۔ اس عیش کیے جاؤ۔"

ناشتے کی میز پر چار قسم کے انڈے تھے۔ اس کے ساتھ ساس تھا، توس تھے، بُھنا ہوا گوشت تھا اور تلے ہوئے آلو تھے۔ گرم توسوں پر مکھن لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھی قیدی عام طور پر گفتگو سے زیادہ ناشتے میں دل چسپی لے رہے تھے۔

جب وہ ناشتے کے بعد واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو دشمن کا ایک محافظ اس کا بستر درست کر رہا تھا۔ محافظ اسے دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا اور انگریزی میں "ہیلو" کہہ کر اس کا استقبال کیا اور جاتے وقت "ہیلو" کہہ کر رخصت ہوا۔ غالباً وہ انگریزی کے صرف اسی لفظ سے واقف تھا۔ محافظ کے جانے کے بعد بوگاش نے تفصیل سے کمرے کا معائنہ کیا۔ اسے ایک ریکارڈ پلیئر نظر آیا۔ اس کے ساتھ بہت سے ریکارڈ بھی تھے، لیکن وہ سب بہت پُرانے تھے۔ غسل خانہ جدید طرز پر بنا ہوا تھا۔ اُس نے گرم پانی سے دل بھر کر غسل کیا اور اپنا جسم نرم روئیں دار تولیے سے خوب رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ پھر وہ چہل قدمی کے لیے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسے احاطے میں ایک خوب صورت باغ، کھیلنے کے لیے ایک میدان اور تفریح کے لیے ایک ہال نظر آیا جس میں مختلف کھیلوں وغیرہ کا انتظام تھا۔ یہ ہال دیکھ کر لاس ویگاس کے کسی بڑے کلب کا گمان ہوتا تھا۔ وہاں وقت گزاری کا ہر سامان موجود تھا۔

ناشتے کی طرح دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا بھی لذیذ اور اعلا قسم کا تھا۔ کھانے میں نمکین اور میٹھے کھانوں کی کئی قسمیں شامل تھیں۔ رات کو کھانے کی میز پر اس کا سامنا دوبارہ چیسٹر سے ہو گیا۔ چیسٹر اسے دیکھ دیکھ کر مُسکراتا رہا۔ کھانے کے بعد بوگاش نے فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ فلم دیکھنے کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں اس نے چیسٹر کو پکڑ لیا۔

"تم مجھے دیکھ کر ہنس کیوں رہے تھے؟" بوگاش نے غصّے سے پوچھا۔

"نہیں دوست۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں تمھیں دیکھ کر ہنس رہا تھا۔" چیسٹر نے اسے یقین دلایا۔

"سُنو میں جانتا ہوں کہ تم مجھ پر ہنس رہے تھے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمھارے ساتھ یہ شاہزادوں والا سلوک خواہ مخواہ ہو رہا ہے؟ میں کہتا ہوں اس کے پیچھے دشمن کی کوئی گہری چال ہے۔ بہت گہری چال۔"

"بے شک۔" چیسٹر نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "لیکن مجھے وہ چال سمجھنے کی کوئی جلدی نہیں ہے اور میں تمھیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ پیارے خواہ مخواہ اپنا ذہن پریشان نہ کرو۔ خوب عیش کرو، یہ جہنّم ہے تو صرف اسی کی تمنّا کرو۔"

بوگاش کو چیسٹر کے اس غیر ذمّے دارانہ رویّے پر اتنا طیش آیا کہ وہ اس سے علیحدہ ہو گیا ــ دوسرے تمام قیدی اس طرح انہماک سے فلم دیکھ رہے تھے جیسے وہ امن کے زمانے میں اپنے ملک کے کسی سینما ہال میں بیٹھے ہوں۔ جب بوگاش سے اپنے ساتھیوں کی اس بے حسی پر صبر نہیں ہو سکا تو وہ فلم ادھوری چھوڑ کر ہال سے باہر نکل آیا۔ اس کا خون بُری

دو ہمسفروں میں ایک ادب اور انشا کا فاضل تھا اور اس کی عادت تھی کہ جب بات کرتا تو زبان میں ادب اور انشا کا رنگ ضرور آ جاتا۔ اتفاق کی بات کہ دورانِ مسافرت یہ فاضل شخص بیمار پڑ گیا، اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "دوست! میں علاج اور آرام کی غرض سے کچھ عرصے یہیں ٹھیروں گا۔ جب تم وطن واپس پہنچو تو میری بیوی سے جاکر کہہ دینا کہ میرے سر میں درد، کمر میں دُکھن، اعضا میں تشنج، تنفس میں رکاوٹ، پاؤں میں ورم، پیٹ میں سخت تکلیف، دماغ میں سودا، دل میں دھڑکن، جگر میں سوزش، جوڑوں میں ریح، گُردے میں پتھری، زبان میں لُکنت ... ..."

ساتھی سُنتے سُنتے تنگ آ چکا تھا، اس نے بات کاٹ دی، بولا۔ "اتنا لمبا چوڑا پیغام کون یاد رکھ سکتا ہے، میں سیدھی سادی بات آپ کی بیوی سے عرض کردوں گا۔"

فاضل شخص نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

سادہ لوح ساتھی نے جواب دیا۔ "یعنی یہ کہ آپ فوت ہو چکے ہیں۔"



طرح کھول رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا ـــــــ

رات دس بجے کسی نے اس کے دروازے پر آہستگی سے دستک دی۔ بوگاش نے لیٹے لیٹے کہا۔ "کون ہے؟"

لیکن کوئی جواب نہ پاکر اس نے دروازہ کھولا اور ایک نوجوان لڑکی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بڑی ادا سے دروازہ بند کیا اور ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ لڑکی بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں تھی، البتہ خوب صورت تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک سحر انگیز مسکراہٹ تھی۔ اس کے نرم ریشمیں بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ چُست لباس پہنے ہوئے تھی اس لیے اس کا گداز اور پُرکشش بدن اپنے تمام نشیب و فراز کے ساتھ اسے دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں خُمار تھا، افسوں تھا، دعوت تھی اور بے باکی تھی۔ بوگاش کو وہ لڑکی ان حالات میں غیر حقیقی نظر آرہی تھی جیسے وہ کسی رسالے کا سرورق ہو۔ اسے اپنے کمرے میں اس لڑکی کی موجودگی کا کسی طرح یقین نہیں آرہا تھا۔ بوگاش نے سوچا کہ کیا وہ کھُلی آنکھوں سے بھی خواب دیکھنے لگا ہے؟ پھر اس کے خیالات کا تسلسل لڑکی کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ "ہیلو بوگاش! مجھ سے ملو۔ میرا نام لیزا ہے۔" لڑکی ہنسنے لگی جیسے وہ بوگاش کو ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اپنی طرف دیکھنے پر لُطف اندوز ہو رہی ہو۔

"کون؟" اس نے بے حد حیرت سے پوچھا۔

"لیزا اور کون ـــ میں تمھاری تنہائیاں اور اُداسیاں دُور کرنے آئی ہوں، مجھے مہمان نوازی کا موقع دو۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے رفیق اور دوست ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس طرح تم تنہائی کے عذاب سے بچ جاؤ گے۔" لیزا نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا اور شراب کی الماری کی طرف بڑھی۔ "کیا تم اپنے دوستوں کی تواضع مشروبات سے نہیں کرتے بوگاش؟"

انھوں نے تلے اوپر شراب کے تین گلاس پیے اور جب تحیّر زدہ بوگاش نے لیزا سے کچھ اُوندھے سیدھے سوالات کیے تو وہ بڑی خوب صُورتی سے اس کے سوالات ٹال گئی اور گفتگو کا رُخ اس کی ذات کی طرف موڑ دیا۔ جلد ہی بوگاش اُس پری وَش کو اپنے بارے میں، اپنے گھر کے بارے میں اور اپنے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ اچانک بوگاش کو خیال آیا کہ یہ خوب صورت لڑکی کہیں ماتا ہری کا کردار تو ادا نہیں کر رہی ہے؟ وہ کہیں اس سے فوجی اہمیت کے راز تو معلوم نہیں کر رہی ہے؟ لیکن فوراً ہی اس نے یہ خیال جھٹک دیا کیوں کہ وہ فوج کا ایک بے حد معمولی سپاہی تھا اور اگر چاہتا بھی تو کسی کو کسی قسم کا فوجی راز نہیں بتا سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد لیزا نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ اسے صرف اور صرف سپاہی بوگاش سے دل چسپی ہے۔ جب رات زیادہ ہوگئی تو وہ اسے سہارا دے کر بستر پر لے گئی اور خود بھی اس کے ساتھ مسہری پر دراز ہوگئی۔

لیزا صبح چلی گئی لیکن وہ رات کو دوبارہ واپس آگئی۔ پھر اس کے بعد والی رات، اس کے بعد والی رات اور اس کے بعد ہر رات۔ جلد ہی بوگاش کو احساس ہوگیا کہ خود میرے چہرے پر بھی سکون اور اطمینان کے وہی جذبات نظر آنے لگے ہیں، جنھیں دیکھ کر میں پہلے روز فلم ادھوری چھوڑ کر ہال سے اُٹھ آیا تھا۔

❁❁

کیمپ میں آنے کے دو ماہ بعد بوگاش کو ایک مرتبہ پھر کمانڈنگ افسر کے سامنے پیش کیا گیا اور وہ ایک مرتبہ پھر یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اس کے ساتھ اس سلوک کا آخر کیا مطلب ہے؟ کیا اب اس سازش سے پردہ اُٹھنے والا ہے؟ کیا اس سے یہ فرمائش کی جائے گی کہ وہ اپنے دُشمنوں کے فلسفۂ حیات پر ایک تعریفی بیان دے تاکہ وہ بیان اخباروں

میں اشاعت کے لیے دیا جاسکے؟ یا اسے اپنی قوم سے غداری پر اُکسایا جائے گا؟ دشمن آخر اسے کس طرح اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنانے کی کوشش کرے گا؟

بوگاش نے کرنل کے دفتر میں داخل ہوکر اُکھڑے اُکھڑے انداز میں سیلوٹ کیا۔ کرنل کے چہرے پر ایک پُرشفقت مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ میاں!" کرنل نے نرم لہجے میں کہا۔ "تمھارے لیے ایک خوش خبری ہے ــــ"

"یس سر؟"

"تم واپس جارہے ہو۔" کرنل نے مطلع کیا۔ "آج سہ پہر ایک ٹرک میں تم اور تمھارے دوسرے پانچ ساتھی روانہ ہوں گے۔ تمھیں نیوٹرل زون (غیر جانب دار علاقے) میں اُتار دیا جائے گا۔ تمھارے استقبال کے لیے وہاں تمھاری فوج کے اعلا افسران موجود ہوں گے۔"

"واپس؟" بوگاش نے ڈوبتے ہوئے دل سے کہا۔

"ہاں دراصل یہ قیدیوں کا تبادلہ ہے اور اس کا انتظام ریڈ کراس نے کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے مل کر بہت خوش ہوگے۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس طویل قید کے بعد کچھ دنوں کے لیے گھر جانے کی چھٹی دے دی جائے گی۔"

"شکریہ جناب۔"

"تم کچھ خوش نظر نہیں آتے بوگاش؟"

"نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔"

"مجھے خوشی ہوئی۔" کرنل نے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "دشمن سے ہاتھ ملانا جنیوا کنونشن کے اصولوں میں شامل نہیں ہے لیکن کیا تم مجھ سے پہلی اور آخری مرتبہ ہاتھ نہیں ملاؤ گے؟"

بوگاش نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور سیلوٹ مار کر باہر نکل آیا۔ جب وہ اپنے ٹرک کی طرف جارہا تھا تو وہ لیزا کے خیالوں میں گم تھا۔ اسے لیزا کو ٹرک کے پاس اپنا منتظر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ اسے آخری مرتبہ اپنی آغوش میں لے کر خوب پیار کرنا چاہتا تھا لیکن ٹرک کا انجن اسٹارٹ ہوگیا تھا۔ وہ حسرت بھری نظروں سے لیزا کو دیکھتا ہوا ٹرک میں سوار ہوگیا۔ لیزا دُور تک اپنا ننھا سا رومال ہلاتی رہی۔

ٹرک روانہ ہونے کے بعد ایک نوجوان لیفٹیننٹ بغل میں بریف کیس دبائے کمانڈنگ افسر کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ جوشِ مسرت سے تمتما رہا تھا۔ وہ کرنل کو کوئی خبر سُنانے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔ اس نے ایڑیاں بجا کر کرنل کو سیلوٹ کیا۔ کرنل نے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کرنل میں ایک بہت اہم اور مسرت خیز خبر سُنانے آیا ہوں بالکل تازہ ترین۔" نوجوان نے بریف کیس کھولا اور ایک کاغذ نکال کر کرنل کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ "جب سے ہم نے منصوبے پر عمل شروع کیا ہے دشمن کے سپاہی بڑی تیزی سے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ہتھیار ڈالنے والوں میں ایک ہزار فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔"

"بے شک یہی ہونا چاہیے تھا۔" کرنل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس تعداد میں اور کئی گنا اضافہ ہوگا۔ جوں جوں ہم قیدیوں کا تبادلہ کریں گے ہمارے ہاں سے واپس جانے والے دشمن قیدی اپنے ساتھیوں کو یہاں کی عیاشیوں کی اطلاع دیں گے۔ یہ اطلاعات بڑی سرعت سے دشمن کی فوج میں گردش کرجائیں گی اور ساتھ ہی ہتھیار ڈالنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس ماہ دشمن کے کتنے سپاہیوں نے ہتھیار ڈالے لیفٹیننٹ؟"

"ایک لاکھ کے قریب۔" نوجوان نے جواب دیا۔ "اگر ہتھیار ڈالنے والوں کی رفتار یہی رہی تو اس سال کے کرسمس سے پہلے دشمن کی تین چوتھائی فوج ہتھیار ڈال دے گی اور جنگ ختم ہوجائے گی ــــ"

"آہ۔" کرنل نے ایک گہری سانس لی۔ "امن۔ کیا دُنیا میں اس سے اچھی کوئی چیز ہے؟"



اس کہانی میں ہنری سلاسر عالمی امن کے قیام کے متعلق ایک غیر معمولی پیغام پیش کرتا ہے۔ سلاسر نے بتایا ہے کہ اس نے یہ کہانی اس اُمید پر لکھی ہے کہ عالمی امن کے مسئلے کے حل کے لیے اس کہانی کے موضوع پر سنجیدگی سے سوچا جائے گا۔



یہ واقعہ ۱۹۴۶ء کے ہفت روزہ انجام دہلی میں شائع ہوا تھا

ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر کے تجربات

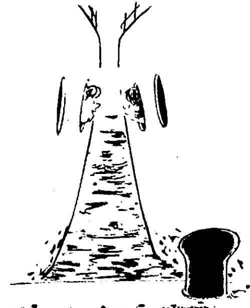
ایسی درندگی

سراج احمد چشتی
فتح پوری۔ اکبر آبادی

پہلی عالمی جنگ چھڑے ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ یہ مارچ ۱۹۱۷ کا ذکر ہے۔ یو۔پی میں ضلع فرخ آباد کی سرحد پر چھوٹی لائن کا دریاگنج نامی ایک آخری ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہاں رات کے ایک بجے دو مختلف سمتوں سے آنے والی گاڑیوں کا کراس ہوتا تھا۔ اسٹیشن سے دریاگنج کی آبادی دو میل دور واقع ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں یہاں گنگا بہتی تھی لیکن اب یہاں ایک لمبی چوڑی جھیل پائی جاتی ہے۔ اسٹیشن سے تقریباً ایک فرلانگ دُور ایک کچی سڑک ہے جو ایٹہ سے گزر کر فرخ آباد چلی جاتی ہے۔ اسی سڑک پر ایک پختہ کنواں تھا اور کنوئیں سے تقریباً دو فرلانگ دُور سیری نگر نامی ایک گاؤں آباد تھا۔

ایک دن علی الصباح جب سیری نگر والے کنوئیں پر پانی بھرنے پہنچے تو اس کے آس پاس بہت سارا خون بہا ہوا دیکھا انھوں نے خوف زدہ ہو کر جب کنوئیں میں جھانکا تو انھیں اس میں کسی عورت کی لاش نظر آئی اور اُس لاش پر ایک چند سالہ بچّی کلبلاتی دکھائی دی۔ یہ خبر آناً فاناً چاروں طرف پھیل گئی اور ذرا سی دیر میں بہت سارے آدمی کنوئیں کے آس پاس جمع ہو گئے چند آدمی ہمّت کر کے کنوئیں میں اتر گئے اور سب سے پہلے سسکتی ہوئی بچی کو احتیاط سے باہر نکالا۔ بچی سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اس کے پیٹ پر نو انگل لمبے کسی دھار والے آلے کا زخم تھا۔ بہت سارا خون بہہ جانے کی وجہ سے اُس دو ڈھائی سالہ بچی کا جسم نیلا پڑ چکا تھا۔ گاؤں والوں نے ذہانت سے کام لیا اور ایک کپڑا شراب میں تر کر کے بچی کے زخم پر باندھ دیا اس کے بعد گھاس پھوس جلا کر اُسے سینک پہنچائی اور گرم کپڑوں میں لپیٹ کر اُسے بچا لیا بچی کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد عورت کی لاش بھی باہر نکال لی گئی عورت کا گلا کاٹ دیا گیا تھا لیکن اس کا سر دھڑ سے الگ نہیں ہوا تھا ریلوے اسٹیشن سے تار کے ذریعے علاقے کے تھانے پٹیالی کو اس دُہرے قتل کی واردات سے مطلع کیا گیا۔ یہ تھانہ پٹیالی ریلوے اسٹیشن سے دو فرلانگ دُور تھا اور جائے واردات کا دریا گنج سے نو میل کا فاصلہ ہے۔ میں صبح ساڑھے سات بجے کی ٹرین سے موقعِ واردات پر پہنچ گیا اور تفتیش شروع کر دی۔

گاؤں والوں کو اس بات پر سخت حیرت تھی کہ یہ کنواں گنگا کے نشیب میں واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ غیر معمولی پانی سے بھرا رہتا تھا لیکن جس صبح کا یہ ذکر ہے اُس میں محض ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ خوب اچھی طرح معائنے اور تفتیش کے بعد قاتلوں کی سفّاکی اور درندگی کھُل کر سامنے آگئی۔ انھوں نے عورت کو ذبح کر کے کنوئیں میں پھینکا تھا اُس کے بعد ڈھائی سالہ بچّی کا پیٹ چھُری کے ایک وار سے چاک کر دینے کی کوشش کی اور نادانستگی میں اُسے مُردہ تصوّر کر کے کنوئیں میں عورت کی لاش پر پھینک دیا۔ یہ بچی اپنی ماں کی لاش پر گرنے کے سبب سے کسی مزید چوٹ چپیٹ سے محفوظ رہی تھی۔ ظالم اور سفّاک قاتلوں نے اپنے ظلم اور درندگی کا مزید اظہار اس طرح کیا کہ لاش پانی میں ڈوبو دینے کے خیال سے انھوں نے اُوپر سے ایک وزنی پتھر بھی اندر لڑھکا دیا لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ یہ وزنی پتھر لاش کے بجائے کنوئیں کے



ایک کونے میں کبر پڑا تھا۔ جہاں پتھر گرا تھا وہاں سے ایک مرا ہوا سانپ ملا
اگر یہ پتھر سانپ پر نہ گرتا تو شاید وہ اس زندہ بچ جانے والی بچی کو ڈس
کر ہلاک کر دیتا۔ بچی کی آنتیں باہر نہیں نکلی تھیں اور اب خون بہنا
بھی بند ہو چکا تھا اس لیے وہ بچ گئی۔

چند گھنٹوں کے اندر گرد و نواح کے بہت سارے لوگ جمع
ہو گئے مگر ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو مقتولہ یا زخمی بچی کو پہچان سکتا۔
مقتول عورت نہایت حسین اور صحت مند تھی اور لہنگا پہنے ہوئے تھی
لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کی گئی اور بچی کو فوری طبی امداد کے لیے
بائیس میل دور صدر اسپتال بھیج دیا گیا۔ سیری نگر کا ہندو چوکیدار ایک
کانسٹیبل کے ساتھ لڑکی کی دیکھ بھال اور حفاظت پر متعین کر دیا گیا۔
اسپتال ہی میں ان دونوں کے فوٹو بھی لے لیے گئے۔ اس کے بعد مختلف
تھانوں سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن قرب و جوار کے کسی بھی تھانے میں
کسی ایسی گمشدگی کی اطلاع درج نہیں کرائی گئی تھی۔

جب لڑکی اچھی ہو گئی تو میں اُسے اپنے گھر لے آیا اور اُسے اپنی
بچی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ میری بچی اس کی ہم عمر تھی۔ یہ لڑکی فطری طور
پر تیز و طرار اور بہت سمجھ دار تھی۔ طبیعت میں چلبلا پن اتنا تھا کہ کسی
حال میں اسے قرار نہ رہتا تھا۔ نچلی بیٹھ ہی نہ سکتی تھی۔ اپنی ماں کی موت یا
جدائی کا اُس پر بظاہر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ
"تیرا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "کلبتیا۔"

لیکن جب اُس کے ماں باپ یا دوسرے رشتے داروں کے
نام پوچھے تو وہ کچھ نہ بتا سکی۔ اُسے اپنے گاؤں کا نام بھی معلوم نہ تھا۔
وہ اپنے مذہب کی بابت بھی کچھ نہ بتا سکی۔

میں نے سب سے آخر میں پوچھا "تیری ماں کو کس نے مارا تھا؟"

اُس نے توتلی زبان میں جواب دیا۔ "بندلو نے!"

میں نے دریافت کیا۔ "کس طرح مارا تھا؟"

جواب میں لڑکی نے ہاتھ کو چھری سے ریتنے کے انداز میں بار بار
حرکت دی اور زبان سے کہتی رہی۔ "یوں مارا۔ یوں مارا۔"

کچھ سوچ کر میں نے دریافت کیا۔ "اُس وقت تیرے اور تیری
ماں کے ساتھ کون تھا؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "نانی ہمارے ساتھ تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "اب تو کس کے پاس جانا چاہتی ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "مالانی کے پاس۔"

ان بہت سارے سوالات کے جواب میں بس تین ہی نام ہمارے
علم میں آسکے۔ بندلو، مالانی اور نانی۔ ان تینوں ناموں کے سوا کوئی سراغ
نہ مل سکا۔ جب میں نے اُس کے سامنے کچھ پھل رکھے تو اُس نے کوئی
خاص رغبت ظاہر نہیں کی۔ ان حالات میں یہ فیصلہ کرنا بہت
مشکل تھا کہ آخر وہ کون سا گاؤں، قصبہ یا شہر ہے جہاں بندلو، مالانی
اور نانی نام کی شخصیتیں رہتی ہیں۔ ان حالات میں سب سے زیادہ
پیچیدہ بات یہ تھی کہ ہمیں اس جگہ کا کچھ بھی پتہ نہ تھا جہاں سے اس
واردات کی تفتیش کا آغاز کیا جاتا اور یہ بات میرے تجربے میں آچکی
تھی کہ اگر ابتدا ہی میں تفتیش کا رُخ غلط ہو جائے تو ساری محنت
اکارت جاتی ہے اور نتیجہ تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں نکلتا ـــ ان
موقعوں پر بے مقصد دوڑ دھوپ یا عام پوچھ گچھ سے اتنا کام نہیں
نکلتا جتنا باطنی اشاروں کی رہنمائی سے نکلتا ہے۔

میں نے لڑکی کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ شروع
کر دیا۔ ایک دن میں لڑکی سے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ سامنے
سے جلیبی کا ایک خوانچے والا گزرا۔ وہ "گرم گرم جلیبی" کی آواز لگا رہا
تھا۔ لڑکی اس آواز پر بے چین ہو گئی اور مچل مچل کر کہنے لگی۔ "جلیبی
لوں گی جلیبی لوں گی!"

میں نے خوانچے والے کو روکا اور اُس سے جلیبی خرید کر بچی
کو دے دی۔ وہ مزے لے لے کر کھانے لگی۔ لڑکی کی اس حرکت
سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لڑکی جس جگہ کی رہنے والی ہے وہاں
خوانچے والے گلی کوچوں میں چل پھر کر جلیبیاں ضرور بیچتے ہوں گے

اس کے بعد اس نے دوسری حرکت یہ کی کہ جلیبیاں کھاتے کھاتے اس کی نظریں اچانک اُڑتی ہوئی پتنگ پر پڑیں۔ اُس نے بے چینی سے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے اور پتنگ کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی "یہ لوں گی یہ لوں گی۔"

ان دو باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لڑکی کسی گاؤں کی ہرگز نہیں ہوسکتی کیونکہ گاؤں میں پتنگیں نہیں اُڑائی جاتیں، اور وہاں جلیبیوں کے خوانچے والے بھی نہیں ہوتے۔ یہ ساری رونقیں شہر میں ہوتی ہیں۔ اب تفتیش کے لیے ایک سرا مل چکا تھا لیکن ابھی یہ طے کرنا باقی تھا کہ وہ قصبہ یا شہر کون سا ہے؟ جائے واردات کے دونوں طرف چار چار ریلوے اسٹیشنوں کے بعد دو بڑے شہر موجود تھے۔ مغرب میں ضلع ایٹہ کا شہر کاسگنج اور مشرق میں فرخ آباد کا فتح گڑھ تھا۔ فرخ آباد اور فتح گڑھ کے درمیان قصبہ قائم گنج آباد تھا۔ اب بھی ہمارے سامنے یہ دشواری تھی کہ آخر ہم اپنی تفتیش کا آغاز کہاں سے کریں؟

لڑکی نے اب تک جو تین نام لیے تھے میں نے انھیں بار بار اپنے ذہن میں دہرایا۔ "مالانی، بندیلو اور رانی۔" انتہائی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس عمر کے بچے عموماً تتلا کر 'ل' کو 'ن' میں ادا کرتے ہیں اور اسی طرح 'ڈ' کو 'ل' میں بدل دیتے ہیں۔ اس لیے یقیناً 'بندیلو' بلدیو ہوگا اور 'مالانی' مہارانی لیکن یہ دریافت بھی اتنی اہم نہیں تھی کیونکہ یہ نام اتنے عام ہیں کہ ہر جگہ دس پانچ بلدیو اور مہارانی نام کے لوگ مل جائیں گے۔ اس کے لیے گاؤں یا شہر کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ یکایک دل نے میری رہنمائی کی کہ تفتیش کا آغاز فرخ آباد سے کرو۔ اور دل کی آواز اس سلسلے میں یہ دلیل دے رہی تھی کہ یہ قتل مقتولہ کو ایٹہ کی سرحد میں لا کر کیا گیا ہے اور اس میں قاتل یا قاتلوں کی یہ ذہانت کارفرما ہے کہ پولیس جائے واردات کے آس پاس ہی کے علاقوں میں قاتلوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس طرح پولیس کو تفتیش کی غلط سمتوں میں ڈال کر اپنا کام کیا جاسکتا ہے۔ اگر قاتل نے عورت کو کسی دوسری جگہ سے لا کر قتل کیا تھا تو یہ بات بھی ماننا پڑتی تھی کہ مقتولہ کو یہاں تک اس کی اپنی مرضی سے لایا گیا ہوگا اور ریل کے سوا یہاں تک پہنچنے کا کوئی اور ذریعہ نہ ہوگا۔

میں نے دونوں کے فوٹو اور خون آلود کپڑے اپنے ساتھ لیے اور خاموشی سے فتح گڑھ پہنچ گیا۔ فتح گڑھ پہنچ کر میں نے وہاں کے ریکارڈ کی چھان بین کی لیکن وہاں بھی کسی عورت اور لڑکی کی گمشدگی کی کوئی اطلاع درج نہیں تھی اور نہ ہی کسی ایسے واقعے کی شہرت یا افواہ کا کوئی ذکر سننے میں آیا۔ جب ناموں کا ذکر چلا تو معلوم ہوا کہ بلدیو اور مہارانی وہاں کے عورتوں اور مردوں میں کئی کئی ہیں لیکن وہاں کے سب انسپکٹر سے اتنی بات البتہ زیادہ معلوم ہوئی کہ فرخ آباد میں بلدیو سنگھ نامی ایک ٹھاکر بہت سرکش اور بدمعاش ہے اور یہ شخص بدمعاشوں اور جرائم پیشہ افراد کا سرغنہ بھی ہے۔ سب انسپکٹر نے بتایا کہ ٹھاکر بلدیو سنگھ کی ایک سب انسپکٹر سے جھڑپ بھی ہوگئی تھی جس میں اُس نے سب انسپکٹر کو زخمی کر دیا تھا۔ اتنی معلومات حاصل ہو جانے کے بعد میں سیدھا فرخ آباد پہنچ گیا۔ فرخ آباد فتح گڑھ سے تین میل دُور واقع ہے۔ میں سادہ کپڑوں میں سادے لباس کے کانسٹبل کے ساتھ جب فرخ آباد میں داخل ہوا تو پولیس اسٹیشن کے بجائے اُس بدمعاش کے محلے میں پہنچ گیا۔ اُس سے فرخ آباد کا بچہ بچہ واقف تھا۔ میں نے نہایت آسانی سے اس بدمعاش کا ٹھکانا دیکھ لیا تھا۔ اِدھر سے فارغ ہو کر میں تقریباً دس بجے اس محلے کی پولیس چوکی پہنچا اور چوکی کے ہیڈ کانسٹبل سے ٹھاکر بلدیو سنگھ کی بابت معلومات حاصل کیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ٹھاکر بلدیو سنگھ وہاں کا مشہور ڈاکو ہے اور جرائم پیشہ افراد کا سرغنہ ہے۔ ایک ہندو لکھ پتی سیٹھ اُس کی پُشت پناہی کرتا ہے اور ٹھاکر بلدیو اُس کا تانگا ہانکتا ہے۔ سیٹھ نے اُسے ایک پختہ عمارت دے رکھی ہے جو نہ صرف اصطبل کا کام دیتی ہے بلکہ ٹھاکر خود بھی وہیں رہتا ہے۔ ٹھاکر کا ذاتی گھر وہاں سے تھوڑی دُور پر واقع تھا۔ محلے والے اور پولیس کا عملہ اُس سے بے حد خوفزدہ تھے۔ یہیں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ خانہ تلاشی کے دوران ایک بار اُس نے ایک سب انسپکٹر پر حملہ کر کے اُسے زخمی کر دیا تھا اور چونکہ اُسے لکھ پتی سیٹھ کی پُشت پناہی حاصل ہے

مسخرے نے سنجیدگی سے مٹھائی خریدی اور قیمت ادا کیے بغیر مٹھائی اپنے لڑکے کو دے کر چلتا کر دیا۔ جب لڑکا نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اس نے حلوائی سے پوچھا "کیوں میاں! اگر میں مٹھائی کی قیمت نہ دوں تو تم مجھ سے کیسا سلوک کرو گے؟"

اکھڑ حلوائی نے جواب دیا "ایک زوردار طمانچہ رسید کردوں گا!"

مسخرے نے متانت سے اپنا گال اس کے آگے بڑھا دیا، بولا "بہتر ہے طمانچہ رسید کردو۔"

حلوائی نے جھلا کر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔

مسخرے نے گال سہلا کر حلوائی سے کہا "اگر تم پسند کرو تو ان داموں میں پوری دکان کا سودا کرنے کو تیار ہوں۔"

اس لیے اب تک کسی مقدمے میں ماخوذ نہیں ہوا ہے۔

اس کے بعد میں نے چوکی کے ایک پرانے کانسٹبل سے راز جوئی شروع کی اور اس سے دریافت کیا "کیا اس محلے میں کوئی مہارانی نام کی عورت بھی رہتی ہے؟"

کانسٹبل نے جواب دیا "ہاں اس نام کی ایک کہارن رہتی ہے!"

میں نے پوچھا "یہ کس عمر اور کس قماش کی عورت ہے؟"

کانسٹبل نے جواب دیا "یہ ادھیڑ عمر کی بدچلن عورت ہے اور اس کے گھر میں بدچلن عورتوں کا اڈا قائم ہے اور یہاں اوباش لوگوں کی آرجار رہتی ہے۔"

اس کے بعد میں نے نہایت حکمتِ عملی سے اسی کانسٹبل کے ذریعے مہارانی کو چپکے سے بلوالیا اور چوکی کے ایک گوشے میں لے جاکر عام نوعیت کی گفتگو شروع کر دی۔

پھر ایک دم میں نے مقتولہ کا فوٹو اس کے سامنے رکھ دیا، اس فوٹو سے کسی طرح بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ مقتولہ کا سر دھڑ سے الگ ہے۔ اس عورت نے مقتولہ کو فوراً پہچان لیا، کہنے لگی "یہ تو میرے محلے کی دھوبن ہے لیکن عرصہ ہوا وہ یہاں سے چلی گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔"

پھر میں نے مقتولہ کے خون آلود کپڑے اور اس کی لڑکی کلبتیا کا فوٹو بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے لڑکی کو بھی پہچان لیا اور خون آلود کپڑے دیکھ کر ہائے ہائے، کرنے لگی اور تقریباً رو رو کر کہنے لگی "ہائے میں نے اسے پہلے ہی منع کیا تھا کہ تو بلدیو کی پھوپھی کے ساتھ ایڑہ نہ جا لیکن نہیں مانی اور چلی گئی اور قتل کر دی گئی۔"

میں نے پوچھا "مقتولہ کا شوہر کیا کرتا ہے؟"

مہارانی نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا "اس کا شوہر بھی دھوبی تھا لیکن بلدیو کے گروہ میں شامل تھا اور کپڑے دھونے کے بجائے وارداتیں کرتا پھرتا تھا۔ ایک راہ زنی میں پکڑا گیا اور تین سال کی سزا پا گیا جب عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا تھا اُس وقت بلدیو اور دھوبی کی بیوی بھی عدالت میں موجود تھے۔ دھوبی نے بلدیو سے درخواست کی کہ جب تک وہ سزا کاٹ کر واپس نہ آئے اُس کی بیوی کو اپنی نگرانی میں رکھے لیکن مقتولہ بہت حسین تھی، بلدیو نے اس سے تعلقات قائم کر لیے۔ بلدیو سنگھ نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ کچھ عرصے تک اس کے ساتھ گزر کی لیکن پھر دونوں میں ان بن ہو گئی اور یہ ان بن بھی اس بات پہ ہوئی کہ عورت نے مسروقہ مال میں سے اپنے شوہر کا حصہ طلب کیا تھا اور بلدیو نے حصہ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ بلدیو کہتا تھا کہ جو کچھ وہ اسے روزمرہ خرچ کے لیے دیتا ہے اس کو وہ اپنے شوہر کے حصے میں شمار کر لے۔ عورت بلدیو سے ناراض ہو گئی اور اس نے پہلوان نامی ایک کانسٹبل سے تعلقات قائم کر لیے۔ مقتولہ میرے گھر بھی آتی جاتی رہتی تھی۔ بلدیو نے میرے سامنے اس سے کئی بار کہا کہ وہ کانسٹبل پہلوان سے تعلقات ختم کر دے لیکن عورت نہیں مانی اور میل جول جاری رکھا۔ بلدیو ڈرا کہ کہیں اس کا راز افشا نہ ہو جائے اور اس کے گروہ کا حال پولیس والوں کو بھی نہ معلوم ہو جائے۔ جب عورت کسی طرح نہ مانی تو بلدیو نے اسے دفعان کرنے کے لیے دریا گنج سے اپنی پھوپھی کو یہاں بلوالیا۔ بلدیو کی پھوپھی نے آتے ہی اس عورت سے خوب تعلقات بڑھا لیے۔ ہر وقت اسی کے پاس رہنے لگی اسے کلبتیا سے بھی محبت ہو گئی تھی اور کلبتیا اسے نانی نانی کہتی تھی۔ پھر ایک دن بلدیو کے اشارے پر اس کی پھوپھی نے عورت سے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اس کے ساتھ دریا گنج چلی چلے۔ وہاں کے گاؤں میں گنے کے کھیت ہیں، کولھو چل رہے ہیں گنے کا رس نکل رہا ہے، راب تیار ہو رہی ہے، گڑ بن رہا ہے۔ بولی، میرے ساتھ گاؤں چلو، کچھ دنوں رہ کر صحت بنا لو اور کھا پی کر کھلی آب و ہوا کے مزے لے کر واپس آجانا۔ عورت لالچ میں آگئی اور میرے انتہائی منع کرنے کے باوجود بلدیو کی پھوپھی کے ساتھ چلی گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔ اب آپ سے یہ معلوم ہوا کہ وہ قتل کی جا چکی ہے۔"

یہ بیان بلدیو کی گرفتاری کے لیے کافی تھا۔ میں چوکی کے ہیڈ کانسٹبلوں کو لے کر اس کی گرفتاری کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ خفیہ پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ بلدیو اصطبل میں موجود ہے اور گھوڑے کو کھریرا کر رہا ہے۔ میں نے اچانک چھاپا مارا اور اسے، چوکنا ہوئے بغیر گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد میں نے اُس جگہ کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ یہ عمارت بہت بڑی اور اونچے پٹاؤ کی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی دروازے کے عین اوپر کھونٹی پر چند گٹھڑیاں لٹک رہی تھیں جو سامنے سے نظر نہیں آتی تھیں، انھیں اتروا کر جو تلاشی لی تو اندر سے بیش قیمت مال برآمد ہوا جو فرخ آباد کی کئی نقب زنیوں سے جمع کیا گیا تھا۔ اسے مقامی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ یہیں سے ایک چھری بھی نکلی جو تقریباً دو بالشت لمبی اور صاف دھلی ہوئی تھی۔ میں

نے اسے اپنے قبضے میں کیا۔

گرفتاری کے بعد بلدیو سنگھ سے مختلف قسم کے سوالات کیے گئے لیکن اُس نے جرم کا اقرار نہیں کیا، برابر انکار ہی کرتا رہا۔ پوچھ گچھ کے بعد اسے فرخ آباد کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں اس کے گھر کی تلاشی لی گئی لیکن وہاں سے کچھ نہ نکلا۔ یہاں سے میں دریا گنج چلا گیا اور وہاں بلدیو کی پھوپھی کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ نہیں ملی اور یہ معلوم ہوا کہ اسے تین چار ماہ قبل بلدیو سنگھ فرخ آباد لے گیا تھا، وہ پھر لوٹ کر نہیں آئی۔ میں نے اس کے بیٹے اور رشتے داروں کو اس کی تلاش پر مامور کر دیا۔

یہاں تک کامیابی حاصل کر لینے کے بعد اب ہمارے سامنے سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ ڈھائی سالہ کلبتیا سے بلدیو کی شناخت کس طرح کرائی جائے؟ یہ شناختی کارروائی جیل کے اندر ہونی تھی جہاں ہم حلیہ قیدیوں کے بیچ میں کسی جگہ بلدیو کو شناخت کرانا تھا اس سلسلے میں ایک تشویشناک قباحت یہ تھی کہ جہاں شناختی کارروائی ہونی تھی وہاں کلبتیا کے علاوہ کسی اور کی موجودگی قانوناً ممنوع تھی۔ میں سٹی مجسٹریٹ سے ملا اور انھیں سمجھایا کہ کلبتیا چونکہ بہت کم سن ہے اور جیل میں تنہا جا کر گھبرائے گی اس لیے ان نازک حالات میں اس بات کی اجازت دی جائے کہ سیری نگر کا چوکیدار شناختی کارروائی لڑکی کو گود میں لے کر پوری کرائے۔ مجسٹریٹ نے میری تجویز معقول قرار دی اور میری بات مان لی چنانچہ شناختی پریڈ کے موقع پر لڑکی کو چوکیدار کی گود میں دے دیا گیا۔ جلیبیوں کا دونا اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نہایت شوق سے جلیبیاں کھا رہی تھی۔ بلدیو کو دوسرے قیدیوں کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ چوکیدار جلیبیاں کھاتی ہوئی کلبتیا کو ان کے سامنے سے لے کر آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ لڑکی قیدیوں کو سرسری نظر سے دیکھتی ہوئی جلیبیاں کھاتی رہی لیکن جیسے ہی اس کی نظریں بلدیو پر پڑیں، لڑکی نے خوف سے چیخ ماری اور چوکیدار کے سینے میں دبک کر کہنے لگی: "یہ مجھے ماریں گے، ماریں گے۔"

لڑکی کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا اور اس نے جلیبیوں کا دونا پھینک کر اپنا سر اس طرح چوکیدار کے سینے میں چھپا لیا کہ چوکیدار اور مجسٹریٹ کی متفقہ کوششوں کے باوجود اوپر نہ اٹھ سکا۔ مجسٹریٹ نے لڑکی کی اس شناخت کو طبعی اور نفسیاتی اصولوں کے عین مطابق قرار دیا۔ بلدیو کو جیل ہی میں رکھا گیا اور اس کی پھوپھی کی زور و شور سے تلاش شروع کر دی گئی تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک نوجوان، ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو لے کر حاضر ہوا اور بتایا کہ یہ میری ماں اور بلدیو کی پھوپھی ہے۔ اسے بلدیو نے رشتے داروں سے چھپا کر مین پوری کے ٹھاکروں کے گھر میں پہنچا دیا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ قتل کا راز کسی کے سامنے بیان نہ کر دے۔

میں نے اسی وقت عورت کا بیان لیا۔ اس نے قتل کا چشم دید حال کسی دباؤ کے بغیر ہی بیان کر دیا۔ اس نے بتایا کہ "بلدیو سنگھ میرا بھتیجا ہے۔ مقتولہ کے اس سے ناجائز تعلقات تھے۔ جب ان دونوں میں اَن بن ہو گئی اور وہ پولیس والوں سے میل جول رکھنے لگی تو بلدیو کو خدشہ ہوا کہ کہیں اُس کے غلط کاروبار کا علم پولیس کو نہ ہو جائے۔ بلدیو نے مجھ سے کہا کہ میں مقتولہ سے میل جول بڑھا کر اسے قابو میں رکھوں اور پولیس والوں سے نہ ملنے دوں، لیکن عورت باز نہ آئی اور من مانی کرتی رہی۔ آخر بلدیو نے اس کا یہ حل نکالا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے کر گاؤں چلی جاؤں۔ میں نے اسے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا اور گاڑی میں بیٹھ کر دریا گنج چل دی۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ اس گاڑی میں بلدیو بھی سفر کر رہا ہے۔ بلدیو کے ساتھ اس کا ساتھی چھیدا بھی تھا جب میں عورت کے ساتھ جا رہی تھی تو کنوئیں کے پاس بلدیو ایک دم نمودار ہوا اور عورت کو اپنی گرفت میں لے کر پچھاڑ دیا۔ چھیدا اس کی مدد کر رہا تھا۔ بلدیو نے عورت کو گرا کر اسے ذبح کر ڈالا۔ میں اسے برابر منع کرتی رہی کہ یہ نہ کرو، لیکن وہ نہ مانا۔ عورت کو مار چکنے کے بعد بلدیو نے اس کی لڑکی کے پیٹ پر چھری کا وار کیا اور اپنی دانست میں اسے بھی ہلاک کر دیا۔ پھر دونوں کی لاشیں کنوئیں میں پھینک کر اوپر سے ایک وزنی پتھر بھی گرا دیا۔ میں دم بخود خوف زدہ یہ ظلم دیکھتی رہی۔ ان دونوں نے مجھے بھی ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ اگر میں نے اس سلسلے میں زبان کھولی تو وہ مجھے بھی ہلاک کر دیں گے۔ اس کے بعد وہ دونوں مجھے ڈانٹتے ڈپٹتے ہوئے ریل کی پٹری پر فرخ آباد کی طرف لے چلے۔ رو دائن اسٹیشن کے عملے نے ہم سب کو شبہے میں روک لیا۔ ان کا خیال تھا کہ بلدیو اور اس کا ساتھی مجھے کہیں سے بھگا کر لائے ہیں۔ بلدیو نے اپنی صفائی میں بتایا کہ ہمیں سات بجے کی گاڑی سے روانہ ہونا تھا۔ رات کو وقت کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا اور وقت سے بہت پہلے نکل کھڑے ہوئے۔ قریب کے کسی گاؤں کا نام لے کر بلدیو نے میری بابت انھیں بتایا کہ یہ عورت میری پھوپھی ہے۔ جب ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی بلدیو کے بیان کی تائید کر دی۔ صبح ہوتے ہوتے پائنٹ مینوں نے ہمیں چھوڑ دیا اور ہم تینوں ریل کے ذریعے فرخ آباد روانہ ہو گئے۔ فرخ آباد سے بلدیو نے مجھے مین پوری پہنچا دیا اور مجھے ایک بار پھر دھمکی دی کہ اگر اس سلسلے میں میں نے زبان کھولی تو وہ رشتے کی بزرگی کا خیال کیے بغیر مجھے قتل کر دے گا۔ میں اپنی جان کے خوف سے چپ ہو رہی لیکن جب میرا بیٹا مجھے تلاش کرتا ہوا مین پوری پہنچا اور مجھے بلدیو کی گرفتاری کی خبر سنائی تو میں فوراً یہاں آ گئی۔"

میں نے اس عورت کا بیان قلم بند کیا۔ اگرچہ یہ عورت بلدیو کے قتل میں اس کی معین و مددگار تھی لیکن چونکہ یہ واحد عینی گواہ تھی اور اسے اس مقدمے میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اس لیے اسے یہ رعایت دی گئی کہ اس کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ اسے اس کے بیٹے ہی کے پاس رہنے دیا گیا۔ عورت نے وعدہ کیا کہ وہ فرار نہیں ہوگی کیونکہ اب اسے بلدیو کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ اس کے بعد چھیدا بھی گرفتار ہوگیا اور ان دونوں کی شناخت اسٹیشن کے عملے نے کردی۔ اور دونوں کا دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند قتل عمد میں چالان کردیا گیا۔ کلبتیا چھیدا کو شناخت نہیں کرسکی۔ دونوں اب بھی اپنے جرم سے انکار کررہے تھے۔

مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا اور بلدیو کی پھوپھی کو عینی شاہد کی حیثیت سے پیش کردیا گیا۔

یہاں ایک بار پھر اس مشکل سے دوچار ہونا پڑا کہ لڑکی بلدیو کی شکل دیکھتے ہی خوف زدہ ہوجائے گی اور کہیں ڈر کے مارے اپنے بیان میں گڑبڑ نہ کرجائے۔ لہٰذا طے یہ پایا کہ پہلے کلبتیا کا بیان لیا جائے، بعد میں بلدیو کا اس سے سامنا کرایا جائے۔ دونوں عدالتوں میں یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ کلبتیا کو سامنے کی میز پر بٹھا کر اس کے ہاتھ میں جلیبی کا دونا دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس سے پہلے جیسے سوال کیے گئے۔ اس نے وہی جوابات دیے جو پہلے دے چکی تھی۔ بیان دے چکنے کے بعد چھیدا کو اس کے سامنے لایا گیا تو وہ ذرا بھی خوف زدہ نہ ہوئی اور جلیبی کھاتے ہوئے اسے دیکھتی رہی لیکن پھر جیسے ہی اس کے سامنے بلدیو کو لایا گیا تو وہ چیخ مار کر میز پر اوندھے منہ گر گئی جلیبیوں کا دونا اس کے ہاتھ سے گر گیا اور چہرہ سرخ ہوگیا۔ عدالتوں نے اس کی یہ کیفیت اور تاثر قلم بند کرلیا اور کلبتیا کی یہ شناخت حقیقی اور مستند قرار دے دی۔ دونوں ملزموں کو سیشن سپرد کردیا گیا جہاں سے چھیدا بری ہوگیا اور بلدیو سنگھ کو سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

ہائی کورٹ نے بھی سیشن کی سزا بحال رکھی۔ اس میں بلدیو سنگھ کی طرف سے جو وکیل صفائی پیروی کررہا تھا۔ اس نے سرکاری وکیل کو بھی اپنی طرف ملا لیا تھا۔ ان دونوں نے سیشن جج کو میرے خلاف بھر دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بلدیو کی پھوپھی کو خود میں نے ڈیڑھ ماہ تک غائب رکھا تھا اور نہ وہ غائب یا لاپتہ نہیں تھی۔ میں نے اسے ڈیڑھ ماہ تک اپنی تحویل میں رکھ کر جبراً یا لالچ دے کر بلدیو سنگھ کے خلاف گواہی دینے کے لیے آمادہ کیا۔ ان دونوں کی مشترکہ کوششوں سے بلدیو سنگھ کی پھوپھی کی شہادت مصنوعی قرار دینے کی زبردست کوشش کی گئی۔ انھوں نے میرا خاص روزنامچہ جج کے سامنے پیش کرادیا۔ حالانکہ میرا یہ خفیہ ریکارڈ تھا۔ انھوں نے میرے روزنامچے سے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ اس میں بدعنوانیاں ہوئی ہیں اور ایک جگہ کی عبارت مشکوک اور دو خطی قرار دی گئی اور جج کو یہ باور کرایا گیا کہ اس کا بعد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان حرکتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جج نے بلدیو سنگھ کو سزائے موت کا حکم تو ضرور سنا دیا مگر اس فیصلے کے ساتھ ہی اپنی طرف سے یہ تجویز بھی لکھ ماری کہ عورت یعنی بلدیو کی پھوپھی پر بھی قتل کا مقدمہ چلایا جائے مگر ہائی کورٹ نے جج کی یہ تجویز مسترد کردی۔ اور میرا روزنامچہ بے نقص اور تفتیش صحیح مان لی گئی۔ ہائی کورٹ نے چند سطریں میری تعریف میں بھی لکھیں۔ ہائی کورٹ کی تعریف نے مجھے یہ فائدہ پہنچایا کہ ڈی آئی جی پولیس رینج کی طرف سے مجھے انعام سے نوازا گیا اور مجھے نیک اعمالی اور اعلا کارکردگی کا سرٹیفکیٹ عطا ہوا اور جج مذکور کا مخالفانہ اور معاندانہ ریمارک ردی کی ٹوکری کی نذر کیا گیا۔ بلدیو سنگھ کی پھوپھی پر مقدمہ نہیں چلایا جاسکا۔

اس پورے کیس میں خاص بات یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی واردات سے واسطہ پڑا جس کا بظاہر کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ ایک چھوٹی سی ڈھائی سال زخمی بچی تھی بھی تو وہ تین ناموں کے سوا ہمیں کچھ نہ بتا سکتی تھی اور یہ تین نام بھی وہ صحیح طور پر نہ لے سکتی تھی لیکن میں نے اس دردناک واردات قتل کا سراغ قوت مشاہدہ اور قوت متخیلہ کے بل بوتے پر لگایا اور سفاک قاتل کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

جب ہر طرف سے فراغت میسر آئی اور مقدمہ بخیر و خوبی آخری مرحلے تک پہنچا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا تو آریا سماجیوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ پہلے آریا سماجیوں نے اور بعد میں ہندو اناتھالا (یتیم خانے) والوں نے یہ درخواست دی کہ لڑکی کلبتیا چونکہ ہندو دھرم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ان کے حوالے کردی جائے۔ میں نے ان سب کی مخالفت کی اور اپنی طرف سے ایک درخواست دی جس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ بتایا گیا تھا کہ یہ لڑکی چونکہ آٹھ دس ماہ تک میرے گھر میں رہی ہے اور میری اپنی بچی اور گھر کے ماحول سے بہت زیادہ مانوس ہوگئی ہے اس لیے اسے میرے ہی پاس رہنے دیا جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہملٹن انگریز تھا اس نے کلبتیا کو میری تجویز اور خواہش کے مطابق ساتھ رہنے اور رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس عدالتی اجازت اور اختیار کے بعد میں نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا اور جب وہ جوان ہوگئی تو اس کی شادی کرکے ایک بہت بڑی فرض سے سبکدوشی حاصل کرلی۔





ایک خزانے کے اغوا کی دلچسپ اور منفرد رُوداد جس کی سُراغ رَسی دُنیا کے ایک مشہور اور ذھین شخص نے کی تھی؛

تھامس فلیمنگ ★ حسن خیلس

یہ واقعہ آپ کو اُس وقت بہت زیادہ متاثر کریگا جب آپ میکاولی کے بارے میں یہ جان لیں گے کہ یہ کون تھا، کہاں تھا اور کب تھا۔؟ ریاست، عوام، حکمران اور انسان کے بارے میں اس کی اپنی کیا رائے تھی؟ میکاولی، انسان کو فطرتاً "ناشکر گزار، دھوکے باز اور حریص سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس واقعے میں اس کا مصنف جب میکاولی کی شکل لومڑی سے مشابہ قرار دیتا ہے تو گویا اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیتا ہے۔

میکاولی ۳ مئی ۱۴۶۹ء کو اٹلی کے شہر فلورنس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ وکیل تھا۔ اس کے بچپن کے واقعات نہیں ملتے۔ وہ ۲۹ سال کی عمر میں صیغۂ عدالت کا محرر ہوا۔ پھر ایک سال بعد ھی مجلس دوسری کا معتمد ہو گیا۔ اس مجلس کے ذمے خارجی سیاست تھی۔ یہ ایک اہم عہدہ تھا اور معتمد کی حیثیت سے کئی حکومتوں سے گفت و شنید کے لئے بھیجا گیا۔ اس منصب پر وہ ۱۵۱۲ء تک فائز رہا اور تیرہ سال کے قلیل عرصے میں اس نے سیاسیات، ملوکیت اور انسانی طبائع کا گہرا مشاہدہ کیا۔ ملازمت سے سبک دوشی کے ایک سال بعد اُس نے اپنی مشہور زمانہ اور بدنام عالم کتاب "بادشاہ" تصنیف کی، جس کی پانچ سو سال سے برابر مذمت کی جارھی ہے اور جس کی وجہ سے میکاولی ھدفِ ملامت بنا ہوا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جن حکمرانوں نے اس کی مذمت کی ہے وہ اپنے نامۂ اعمال کے اعتبار سے میکاولی کے معنوی شاگرد ٹھیرے ہیں۔ میکاولی کتنا بڑا آدمی ہے" اس کے ہم عصر اس بات سے ناواقف تھے۔ چنانچہ یہ ستم ظریفی اس واقعے میں بھی موجود ہے، لیکن واقعے کی آخری سطر تک پہنچتے پہنچتے آپ اس عجیب غریب انسان کی ذھانت کے قائل ہو جائیں گے؛

کاؤنٹ

مونٹاگنو کی شان دار شخصیت کے سامنے ڈیوک کا بھیجا ہوا نمائندہ ایک چوہے کی طرح نظر آرہا تھا۔ یہ نمائندہ درباری لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کا دبلا پتلا جسم اس طرح خمیدہ معلوم ہورہا تھا جیسے اس کی کمر میں کوب ہو۔ چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں لیکن پیشانی اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ نمائندے نے ستائش کی نظروں سے کاؤنٹ کی طرف دیکھا۔ کاؤنٹ کا چہرہ جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں بھیڑیے کی مانند دکھائی دے رہا تھا یہ مشابہت محض چہرے تک محدود نہیں تھی بلکہ کاؤنٹ کی فطرت بھی بھیڑیے کی طرح تھی اسی لیے وہ دور دور تک شمالی بھیڑیے کے نام سے مشہور تھا۔

ڈیوک کا نمائندہ معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ کون تھا؟ پندرھویں صدی کی مشہور ترین شخصیت جسے جدید سیاسیات کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے، اس کا نام نکولائی میکاولی تھا۔ پیغام رسانی اس کا کام نہیں تھا۔ ڈیوک نے پیغام دینے کے بہانے اسے کاؤنٹ کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے تمام حالات کا جائزہ لے کر ڈیوک کو اس حیرت انگیز واقعے کے متعلق اپنی رائے سے آگاہ کرسکے۔

میکاولی کاؤنٹ کے محل میں بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا لیکن وہ مجبور تھا کیوں کہ اسے جس کام کے لیے بھیجا گیا تھا اسے انجام دیے بغیر وہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ کاؤنٹ کو دیکھ کر اس نے پہلی رائے یہ قائم کی تھی کہ کاؤنٹ کے لیے شمالی بھیڑیے کا لقب بہت موزوں ہے۔

"تم خود سمجھ سکتے ہو۔" کاؤنٹ میکاولی کو بتا رہا تھا۔ "یہ چوری کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے صرف میں ہی نہیں بلکہ تمہارے معزز آقا، محترم ڈیوک بھی پریشانی میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔ پہاڑوں کے دوسری طرف فرانس ہے اور فرانس کا شہنشاہ بہت عرصے سے اس علاقے پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اسے اٹلی پر حملہ کرنے کے لیے صرف کسی بہانے کی تلاش ہے، جسے وہ پاپائے اعظم کے سامنے حملہ کرنے کے جواز کے طور پر پیش کرسکے۔ اور یہ چوری ـــــ یہ حملے کا ایک معقول جواز ہی نہیں ہے بلکہ فرانس کے شہنشاہ کی توہین کے مترادف ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ یہ عمدہ موقع ہاتھ سے جانے دے گا۔"

"آپ فرانس کے شہنشاہ کو خط کے ذریعے پوری صورتِ حال سمجھا سکتے ہیں۔" میکاولی نے تجویز پیش کی۔

کاؤنٹ اس تجویز پر مسکرا دیا۔ "اٹلی کی آزادی صرف میرے اور تمہارے معزز آقا کی وجہ سے قائم ہے۔ ہم نے بڑی محنت اور تدبر سے اپنی فوجی قوت اور ذہانت کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑا رکھی ہیں اس لیے فرانس کا شہنشاہ اب تک اس علاقے پر حملہ کرنے سے جھجکتا رہا ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خط کے ذریعے اس پر یہ بات افشا کردوں کہ ایک معمولی سپاہی یا ملازم یا چوکیدار میری تحویل سے وہ تحائف لے اڑا جو محترم ڈیوک نے اس کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے میرے پاس روانہ کیے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ غلطی کا اعتراف کرنا کمزوری کی علامت نہیں ہوتا بلکہ اس سے آدمی کے کردار کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔" میکاولی نے جواب دیا۔

وہ دونوں طویل راہداری طے کرکے ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے۔ بڑی بڑی میزیں اور کرسیاں یہ ظاہر کررہی تھیں کہ یہ ہال طعام خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

"کردار کی بلندی صرف کتابوں میں پائی جاتی ہے عملی زندگی میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔" کاؤنٹ نے اپنا لمبا چوڑا اور مضبوط ہاتھ مٹھی کی شکل میں بند کرکے میکاولی کو دکھایا۔ "یہ ہے وہ قوت جو اٹلی پر حکومت کرتی ہے۔"

میکاولی معذرتی انداز میں مسکرایا۔ "کتابوں سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ کیا آپ نے لیوی کو پڑھا ہے؟ وہ بہت چالاک اور ذہین آدمی تھا۔"

کاؤنٹ نے اس کی بات نظرانداز کردی اور اسے بتانے لگا کہ "یہ ہے وہ جگہ، جہاں میں اور مارکوئیس کھانا کھا رہے تھے۔ مارکوئیس کو شہنشاہ فرانس نے محترم ڈیوک کے تحائف وصول کرنے کے لیے بھیجا ہے ہمارے ساتھ دوسرے معزز مہمان بھی تھے۔ کھانے کے بعد میں اور مارکوئیس سیڑھیاں اتر کر اُس کمرے میں گئے تھے جہاں ڈیوک کا بھیجا ہوا خزانہ موجود تھا۔"

"کیا مارکوئیس نے وہ خزانہ چوری ہونے سے پہلے دیکھ لیا تھا؟"

"ہاں، اُسی سہ پہر دیکھا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ہی اس کمرے میں گئے تھے اور بیش قیمت ہیرے اور جواہر دیکھنے کے بعد ان کی خوب صورتی اور چمک دمک پر بہت دیر تک حیران ہوتے رہے تھے۔ ان قیمتی اور نادر تحائف سے ظاہر ہوتا تھا کہ تمہارا آقا فرانس کے شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے کس قدر فکرمند رہتا ہے اور کیا کیا جتن کرتا ہے۔"

کاؤنٹ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یا شاید آپ میرے آقا کی خطیر دولت پر حیران ہو رہے تھے۔ وہ چند تحائف اس خطیر دولت کا صرف ایک معمولی حصہ تھے اور وہ بھی آپ کے ہاں آکر کڑی حفاظت کے باوجود چوری ہو گئے۔ حالاں کہ میرے آقا کی تمام دولت کی نگرانی صرف ایک معمولی کپتان کرتا ہے۔ پھر بھی آج تک ایک سوئی بھی چوری نہیں ہوئی۔" میکاولی نے طنز کا جواب طنز سے دیتے ہوئے کہا۔

کاؤنٹ تلملا کر رہ گیا۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا: "اس اندوہناک اتفاق پر مجھے بے حد افسوس ہے۔ ویسے میں نے ان نوادر کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ بہرحال.... ہم دونوں جب اس کمرے سے واپس آئے تو قطعاً غیر متوقع طور پر خزانہ غائب تھا۔ یہی نہیں بلکہ خزانے کے دو محافظ سپاہیوں میں سے ایک سپاہی بری طرح زخمی تھا اور دوسرا مر چکا تھا۔" کاؤنٹ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کو خزانے کی حفاظت کے لیے دو سے زیادہ سپاہی متعین کرنے چاہیے تھے۔" میکاولی نے نرم لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے کہ تمھارا خیال درست ہو مگر تم خود غالباً سپاہی نہیں ہو؟"

"نہیں جناب۔ میں قلم کا سپاہی ہوں۔" میکاولی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بے شک، ایسا ہی ہوگا ورنہ اگر تم فوج کے سپاہی ہوتے تو میری مجبوری کا آسانی سے اندازہ لگا سکتے تھے۔ امانت کی نگرانی کے لیے دو آدمیوں سے زیادہ آدمی متعین کرنا میرے لیے مشکل تھا کیوں کہ یہاں قلعے پر میرے پاس صرف چند سو فوجی ہیں۔ باقی سب سپاہی سرحدی علاقوں میں ہیں اور شکار کر کے اپنا پیٹ پال رہے ہیں تاکہ اگر وطنِ عزیز پر فرانس کی طرف سے کبھی اچانک حملہ ہو جائے تو اسے فوری طور پر روکا جا سکے۔ یہ اٹلی کی ایک غریب ریاست ہے میرے معزز دوست!" کاؤنٹ نے کچھ توقف کے بعد کہا: "ویسے تمھارے آقا اپنے دوستوں کے ساتھ اتنی سخاوت سے پیش نہیں آتے جتنی سخاوت وہ دشمنوں کے ساتھ کرتے ہیں۔"

"آہ" میکاولی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "دوستوں سے صرف وہی چیز حاصل ہوتی ہے جس کا پہلے سے علم ہوتا ہے لیکن دشمنوں کے پاس بعض ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جن کا علم نہیں ہوتا اس لیے ہمیشہ دشمنوں کے ساتھ زیادہ نرمی سے پیش آنا چاہیے۔ ہاں تو آپ خزانے کے محافظوں کے بارے میں بتا رہے تھے جناب؟"



ایک شخص ہوٹل میں سویا ہوا تھا، اپنے روپوں کا بٹوا تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ صبح جب جاگا تو پتہ چلا کہ بٹوا غائب ہے۔ وہ دو چار دن بعد جب گھر پہنچا تو اپنی اس پریشانی کا بیوی سے ذکر کیا۔

بیوی غور سے پوری داستان سننے کے بعد بولی: "میں تم سے بارہا یہ کہہ چکی ہوں کہ تم نماز ضرور پڑھا کرو، اگر تم پابند نماز ہوتے تو تمھیں یہ نقصان ہرگز نہ اٹھانا پڑتا۔"

شوہر نے معصومیت سے جواب دیا: "لیکن بیگم! جس شخص کو میرے بٹوے کے چوری ہونے سے فائدہ پہنچا ہے، وہ بھی تو نمازی نہیں تھا۔"



کاؤنٹ نے پلٹ کر غور سے ڈیوک کے نمائندے کو دیکھا جسے وہ پہلی نظر میں ایک دیہاتی سمجھا تھا۔ "شہنشاہِ فرانس کا نمائندہ مارکوئیس خزانہ وصول کرنے کے لیے یہاں موجود تھا اس لیے میں نے ہر آدمی کو قلعے پر لگا دیا تھا یہاں تک کہ اپنے ذاتی محافظوں کو بھی اسی کام پر مامور کر دیا تھا بلکہ میں نے تو شہری نوجوانوں کو بھی فوجی وردیاں پہنا کر قلعے کی دیواروں پر کھڑا کر دیا تھا تاکہ مارکوئیس جب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کی سیر کرے تو وہ سپاہیوں کی تعداد دیکھ کر مرعوب ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ خزانے کی حفاظت کے لیے مجھے صرف دو سپاہیوں پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔"

"آپ کی ذہانت میں کوئی شبہ نہیں۔" ڈیوک کے نمائندے نے کہا: "لیکن اگر آپ خزانہ چوری ہو سکنے کے امکان پر پہلے غور کر لیتے تو آپ کی ذہانت دانش مندی میں تبدیل ہو جاتی۔ دانش مندی اور ذہانت میں یہی فرق ہوتا ہے۔"

"میں کوئی فلسفی یا سفیر یا خوشامدی آدمی نہیں ہوں۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں، وہ یہ کہ میدانِ جنگ میں دشمن کو کس طرح ہلاک کیا جاتا ہے۔ جب میرے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے اور جب میں میدانِ جنگ میں ۔۔۔۔۔"

میکاولی نے کاؤنٹ کی بات کاٹ دی: "آپ کی اس فطری صلاحیت کا پورا اٹلی معترف ہے اور اسی بنا پر آپ کی عزت کرتا ہے۔ میرے آقا نے مجھے آپ کی بہادری کے بہت سے قصے سنائے ہیں۔ میں بھی آپ کی خوبیوں کا قائل ہوں۔" میکاولی نے رک کر کاؤنٹ کے چہرے کا جائزہ لیا پھر کہا: "لیکن اس وقت مجھے محترم ڈیوک نے خزانے کی چوری کی تحقیق کے لیے بھیجا ہے تاکہ میں تمام حالات کا جائزہ لے کر اپنی رائے تحریری طور پر ان کے سامنے پیش کر سکوں۔"

"بہت خوب۔" کاؤنٹ نے کہا: "تم خود دیکھ لو۔ وہ مقام ہر اعتبار

سے محفوظ تھا جہاں تمہارے آقا کے تحائف رکھے گئے تھے۔ میں نے وہاں دو سپاہی مقرر کیے تھے۔ اگر چور کسی طرح ان دونوں کو مغلوب بھی کر لیتا تو بھی وہ خزانہ لے کر ہماری نظروں میں آئے بغیر نہیں بھاگ سکتا تھا۔ راستے کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اسے ہر صورت میں ہمارے سامنے سے فرار ہونا پڑتا۔ ہم لوگ مارکوئیس سمیت، اس ہال میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، وہ ہماری نظروں سے بچ کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ ادھر آؤ! میں تمہیں وہ مقام دکھاؤں"

میکاولی کاؤنٹ کے پیچھے پیچھے کھانے کے ہال سے باہر نکل آیا۔ ہال کا دروازہ بہت بڑا تھا۔ اس کے سامنے پتھر تراش کر چند سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ان سیڑھیوں کے بعد ایک چھوٹا سا تنگ دروازہ تھا۔ کاؤنٹ کے اشارے پر دو خادموں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اس کمرے میں تھا وہ خزانہ۔" کاؤنٹ نے کہا۔ "چور خزانہ چرا کر صرف اسی راستے سے فرار ہو سکتا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اسے ہماری نظروں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اب تم سمجھ گئے؟ میں یہ کمرہ اتنا محفوظ کیوں سمجھتا تھا؟"

"بے شک۔ بے شک۔" میکاولی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ کاؤنٹ کے اشارے پر دو آدمی مشعلیں اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے تو تاریک کمرہ روشن ہو گیا لیکن ان مشعلوں کی روشنی مکمل طور پر کمرہ روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ میکاولی نے غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔

"یہ ہے وہ کمرہ۔ اس کا صرف ایک راستہ ہے۔" کاؤنٹ نے کہا۔

"آہا۔ کیا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟" میکاولی نے پُرمسرت لہجے میں پوچھا۔ کاؤنٹ نے میکاولی کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اب اس کے بے وقوف ہونے میں کوئی شبہ نہ رہ گیا ہو۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے کی دوسری دیوار کی طرف بڑھا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ میکاولی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کمرہ کبھی خوفناک درندے بند رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ اس نے مڑ کر اس دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے وہ اندر داخل ہوئے تھے لیکن اب دروازہ بند ہو چکا تھا۔ کاؤنٹ نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے دوسرے دروازے کو دھکا دیا۔ یہ ایک پتھر کا بنا ہوا دروازہ تھا اور اسے اس طرح دیوار میں لگایا گیا تھا کہ اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ کاؤنٹ نے اپنی بے پناہ قوت سے پتھر کا دروازہ آسانی کے ساتھ کھول دیا اور پھر کمرہ ایک دم سورج کی روشنی سے منور ہو گیا۔ میکاولی نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کا معائنہ کیا اور کاؤنٹ کی معنی خیز نظروں کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔

وہ دروازہ خلا میں کھلتا تھا۔ اس کے اوپر آسمان تھا، سامنے خلا تھا اور نیچے کی طرف زمین ایک ہزار فٹ کی گہرائی پر واقع تھی۔ وہ پورا قلعہ ایک اونچی پہاڑی پر بنا ہوا تھا اور یہ کمرہ پہاڑی کے جنوبی حصے میں تھا۔ میکاولی نے دروازے سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ نیچے سے ایک ہزار فٹ کی بلندی عبور کر کے کسی شخص کا اس کمرے میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا کیوں کہ دروازے کے نیچے پہاڑی بالکل سیدھی دیوار کی طرح تھی۔ میکاولی ایک جھرجھری لے کر دروازے سے پیچھے ہٹ گیا۔

"اب تم سمجھے؟ پہلے دروازے سے تو چور ہرگز فرار نہیں ہوئے ورنہ پکڑے جاتے اور اس دروازے سے فرار ہونا قرینِ قیاس نہیں ہے۔" کاؤنٹ نے کہا۔

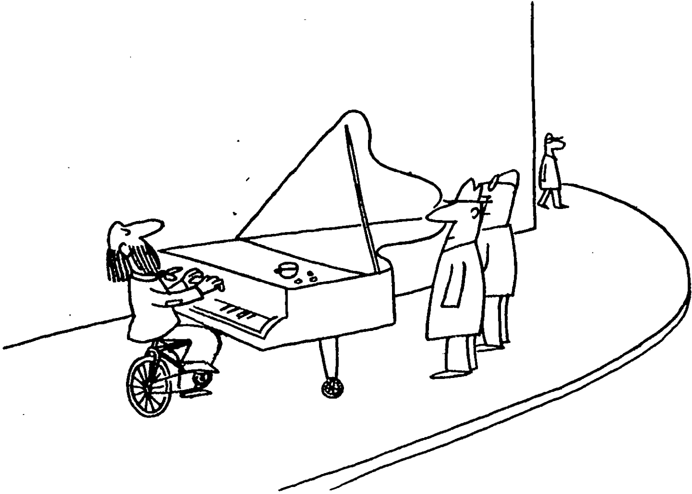
"لیکن فرار تو ہوئے ہیں۔ چاہے کسی بھی دروازے سے ہوئے ہوں۔"

"ہاں یقیناً۔ چوری ہوئی ہے اور چور فرار بھی ہوئے ہیں۔"

"لیکن یہ بات مارکوئیس کو کون سمجھائے گا؟" میکاولی نے کہا۔ "وہ تو شہنشاہِ فرانس کو یہی رپورٹ دے گا کہ اس کمرے سے خزانے کی چوری ناممکن تھی۔ اور اس رپورٹ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ خزانہ در اصل چوری نہیں ہوا تھا بلکہ اسے وہاں سے ہٹا لیا گیا تھا۔ چوری ہونے کا افسانہ قطعاً جھوٹا ہے۔ فرانس میں یہ سمجھا جائے گا کہ اٹلی والے در اصل شہنشاہِ فرانس کی خدمت میں تحائف پیش کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ محض دکھاوے کے لیے یہ سارا ڈراما کھیلا گیا ہے۔"

"ہاں۔" کاؤنٹ نے کہا۔ "ان حالات میں مارکوئیس یہی رپورٹ پیش کرے گا اور اہلِ فرانس یہی سمجھیں گے کہ ہم شہنشاہِ فرانس کی خدمت میں تحائف پیش کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ شہنشاہ اس صورتِ حال پر بہت خوش ہو گا کیوں کہ اس طرح اسے اٹلی پر حملہ کرنے کے لیے ایک عمدہ بہانا مل جائے گا لیکن تمہیں اور مجھے یہ حقیقت معلوم ہے کہ خزانہ واقعی چوری ہو گیا ہے۔"

"اس چوری کو معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔" میکاولی نے تیز لہجے میں کہا۔ کاؤنٹ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میکاولی کو کاؤنٹ کا چہرہ کسی لومڑی کے چہرے کی طرح نظر آیا۔ میکاولی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ خزانہ صرف غائب ہو گیا ہے۔ چوری نہیں ہوا ہے۔ وہ خزانہ محترم ڈیوک اور شہنشاہِ فرانس کی طرف سے پاپائے اعظم کی خدمت میں پیش کیا



جلنے والا تھا اس لیے اب یہی کہا جا سکتا ہے کہ پاک مریم کو اپنا تحفہ وصول کرنے کی عجلت تھی اس لیے اس نے اسے اس کمرے سے آسمانوں پر اٹھا لیا ہے۔ اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔" میکاولی کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"تم احمق ہو۔" کاؤنٹ نے برہمی سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ ڈیوک نے ایک احمق آدمی کو میرے پاس بھیجا ہے کیا اسے کوئی دانشمند آدمی نہیں ملا تھا؟"

"خدا کی نظر میں احمق اکثر دانش مند ہوتے ہیں۔ اٹلی سالہا سال سے جنگ، قحط سالی، اور وبائی امراض میں گھرا ہوا ہے اور یہ معجزہ ہی ہے کہ اس کے باوجود دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ اٹلی کے تباہ و برباد عوام مدت سے کسی ایسے معجزے کی آس لگائے بیٹھے ہیں جو ان کی مصیبتوں کا خاتمہ کر دے۔ ہم یہ معجزہ ان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔"

"تم احمق ہو۔" کاؤنٹ نے پھر جھنجلا کر کہا۔ "چوری کرنے کے بعد چور یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ فرار ہرگز نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہیں کہیں موجود ہیں۔"

"لیکن جواہر؟"

"بے شک وہ غائب ہو چکے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ چور ابھی قلعے ہی میں موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جواہر کسی مضبوط تھیلی وغیرہ میں بند کر کے دوسرے دروازے سے نیچے پھینکے گئے ہوں گے اور پہاڑی کے نیچے چور کے دوسرے ساتھی موجود ہوں گے۔ وہ تھیلی اٹھا کر غائب ہو گئے ہوں گے۔" کاؤنٹ نے کہا۔

"اگر چور ابھی تک قلعے سے باہر نہیں نکلے ہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو ہاں، وہ قلعے ہی میں موجود ہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کتابی کیڑے؟ جب میں مارکوئیس کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو اس کمرے میں دو محافظوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔"

"لیکن آپ نے کہا تھا کہ دونوں محافظ مردہ تھے۔"

"دونوں نہیں، صرف ایک۔ دوسرا محافظ محض زخمی تھا۔ وہ مرا نہیں تھا، اب بھی زندہ ہے۔"

"تو گویا دوسرا محافظ ہی چور ہے؟" میکاولی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، یہ امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم میدان جنگ میں ہر پہلو پر غور کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اس کمرے میں کس قدر تاریکی رہتی ہے ہو سکتا ہے چور اس تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کمرے میں داخل ہو گیا ہو اور محافظوں پر حملہ کر کے اس نے ایک کی گردن اڑا دی ہو اور دوسرے کو زخمی کر کے دوسرا دروازہ کھول کر جواہر کی تھیلی نیچے پھینک دی ہو اور پھر وہ تاریکی میں چھپ کر مہلت کا انتظار کرنے لگا ہو۔ جب میں مارکوئیس اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو ممکن ہے چور خاموشی سے ہم لوگوں میں شامل ہو گیا ہو۔"

"اور یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ چور یا چوروں نے درباری لباس

پہن رکھا ہو چاہے وہ لباس آپ کے درباریوں کا ہو یا مارکوئیس کے ہمراہ آنے والے درباریوں کا۔" میکاولی نے کہا۔

" بالکل ٹھیک ہے۔ ہمارے سامنے صرف تین ممکنہ صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خود محافظ چور تھے انھوں نے جواہر کی تھیلی نیچے پھینک دی اور پھر کسی نامعلوم وجہ سے آپس میں لڑنے لگے نتیجے میں ایک مر گیا، دوسرا زخمی ہو گیا، دوسری صورت یہ ہے کہ میرا کوئی درباری چور ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مارکوئیس کے ساتھ آنے والے آدمیوں میں سے کوئی چور ہے۔"

" زخمی محافظ کا کیا بنا؟"

" وہ زخموں سے چور تھا اور اس کی ذہنی کیفیت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

" لیکن اب وہ گفتگو کرنے کے قابل تو ہو گیا ہو گا؟"

" بے شک۔ لیکن وہ بول نہیں سکتا۔" کاؤنٹ نے جواب دیا۔

" کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں جناب۔"

" مطلب یہ ہے کہ وہ محافظ پیدائشی گونگا اور بہرا ہے۔ اس کا نام نافرلو ہے۔ وہ جب سے پیدا ہوا ہے، ہمارے خاندان کے ساتھ ہے۔"

ڈیوک کے نمایندے نے بے یقینی سے کاؤنٹ کو دیکھا۔

" اور اب۔" کاؤنٹ نے کہا۔ "ہمیں شہنشاہِ فرانس کے نمایندے مارکوئیس سے ملاقات کرنی ہے اور اسے اس چوری کے بارے میں مطمئن کرنا ہے اس کے سامنے چوری کا حل پیش کرنا ہے۔"

" آپ کے پاس کا کوئی حل موجود ہے؟" میکاولی نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "اوہ سمجھا! زخمی محافظ گونگا اور بہرا ضرور ہے لیکن وہ لکھ پڑھ سکتا ہے؟ ہم تحریری طور پر اس سے چوری کے متعلق سوالات کر سکتے ہیں؟ اور وہ تحریری طور پر ہمیں ------"

" نہیں۔" کاؤنٹ نے پُرسکون لہجے میں کہا اور خادموں کو اشارہ کیا۔ "وہ ایک لفظ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتا پھر بھی میرے ذہن میں ایک حل موجود ہے"

وہ دونوں مختلف راہداریاں طے کرتے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہوئے۔ شہنشاہِ فرانس کا نمایندہ مارکوئیس بے حد مغرور اور نازک مزاج آدمی تھا۔ وہ کاؤنٹ کی مہمان نوازی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ کاؤنٹ اسے ناراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر کاؤنٹ نے اس سے بدتمیزی کی تو ممکن ہے آیندہ گرمیوں میں اس قلعے پر فرانس کا جھنڈا لہرا رہا ہو۔ اتنے بڑے علاقے کی قیمت جواہر کی ایک تھیلی کچھ بھی نہیں تھی۔ مارکوئیس غالباً سوچ رہا ہو گا کہ یہ چوری جنگ شروع کرنے کے لیے بہترین بہانا ثابت ہو سکتی ہے۔ اسے اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ کاؤنٹ نے خزانہ غائب کرنے کی جرأت کیسے کی؟ کیا وہ اس کے نتائج سے بے خبر ہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ کاؤنٹ جیسا عیار آدمی ایسی فاش غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

کاؤنٹ اب اس کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جواہر واقعی چوری ہو گئے ہیں۔ مارکوئیس ہمدردی سے اس کے دلائل سُن رہا تھا ـــــ "میں نے پوری صورتِ حال معزز مہمان کے سامنے رکھ دی ہے" کاؤنٹ نے تمام دلائل پیش کرنے کے بعد کہا۔ "میں اپنے الفاظ پر پیشگی معافی چاہتا ہوں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہوں محترم مارکوئیس کہ ممکن ہے یہ چوری آپ کی لاعلمی میں آپ کے آدمیوں نے کی ہو۔ ساتھ ہی میں خود کو بھی اس امکان سے خارج قرار نہیں دے رہا ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حرکت میرے آدمیوں نے کی ہو۔"

" ہاں۔" مارکوئیس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس امر کا فیصلہ اب ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں ہے جو اَن پڑھ ہونے کے علاوہ گونگا اور بہرا بھی ہے، دوسرا گواہ مر چکا ہے۔ مردہ آدمی شہادت نہیں دیتے۔"

" ہاں۔" کاؤنٹ نے جواب دیا۔ "وہ اَن پڑھ گونگا اور بہرا ضرور ہے لیکن اندھا نہیں ہے۔"

" کیا مطلب؟" مارکوئیس نے حیرت سے پوچھا۔

" میں نے اپنے مصور سے تین تصویریں بنوائی ہیں۔ ہر تصویر اس چوری کے ایک ممکن حل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہم اس کے سامنے ایک ایک کر کے تینوں تصویریں پیش کریں گے۔ جو تصویر اس صورتِ حال کے مطابق ہو گی اس پر وہ سر ہلا کر اشارہ کر دے گا اور ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اصل حقیقت کیا ہے"

مارکوئیس اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ ڈیوک کا نمایندہ میکاولی اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مارکوئیس اچانک نروس کیوں ہو گیا ہے؟

" لیکن ـــــ" مارکوئیس نے اعتراض کیا۔ "اگر وہ محافظ خود چور رہا ہوا تو اعتراف کیسے کرے گا؟"

کاؤنٹ بڑے بھیانک انداز میں مسکرایا۔ "اسے سچ بولنے کے لیے تیار کیا جا چکا ہے محترم مارکوئیس! آپ دیکھیں گے کہ وہ سچ بولنے کے لیے کتنا بے چین ہے، کیوں کہ وہ جلد از جلد ان اذیتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے جو اسے مسلسل دی جا رہی ہیں۔ اسے ہر طرح یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ اسے سچ بولنا ہے۔" کاؤنٹ نے سر ہلا کر ایک خادم کو اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد خادم ایک آدمی کے ساتھ واپس آیا جس نے بغل میں کچھ تصویریں دبا رکھی تھیں۔ کاؤنٹ نے ان تصویروں پر ایک نظر ڈالی اور دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح محافظ کی طرف

دیکھا۔ محافظ اشارہ پاکر باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد دو توانا آدمی ایک ایسی چیز گھسیٹتے ہوئے اندر لائے جو کبھی انسانی شکل و صورت رکھتی ہوگی۔ اس وقت اس کا پورا جسم زخموں سے چور تھا اور چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ اس میں چند لمحے کھڑے رہنے کی سکت بھی نہیں تھی۔

"اسے سچ بولنے پر تیار کر لیا گیا ہے۔" کاؤنٹ نے بھیانک انداز میں ہنستے ہوئے مارکوئیس کی طرف دیکھا۔ مارکوئیس نے نظریں پھیر لیں۔

"مجھے وہ زمانہ اب تک یاد ہے۔" کاؤنٹ نے بلند آواز میں کہا۔ وسیع و عریض کمرے میں اس کی آواز گونجنے لگی۔ "جب نافرلو بچہ تھا اور اس قلعے میں میرے ساتھ کھیلتا تھا۔ میں وہ یادیں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ نافرلو میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ اگر وہ بے گناہ ہے تو اسے چاہیے کہ بے خوف و خطر مجرم کی نشان دہی کرے۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ میرے زندہ ہوتے ہوئے اسے کوئی شخص گزند نہیں پہنچا سکے گا۔" کاؤنٹ نے مارکوئیس کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا میں نے اپنا مقصد واضح کر دیا ہے محترم مارکوئیس؟"

"میں سمجھ گیا۔" مارکوئیس نے جواب دیا۔

کاؤنٹ نے سر ہلا کر مصور کو اپنا کام شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ مصور نے پہلی تصویر زخمی محافظ کی آنکھوں کے سامنے لایا۔ محافظ نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے تصویر دیکھی۔ اس تصویر میں خود زخمی محافظ اور اس کے مردہ ساتھی کو دکھایا گیا تھا۔ ان دونوں پر کاؤنٹ کا درباری لباس پہنے ہوئے چند مسلح افراد حملہ کر رہے تھے۔ ایک حملہ آور کمرے کا بھاری دروازہ کھولے باہر کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں جواہر کی تھیلی تھی جسے وہ ایک ڈوری سے نیچے لٹکا رہا تھا۔

"غریب نافرلو۔" کاؤنٹ نے کہا۔ "اسے اپنے ذہن پر پورا زور دینا پڑے گا کیوں کہ اگر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو مجھے اپنے مسلح محافظوں کے پورے دستے کی گردن اڑانی پڑے گی۔"

نافرلو نے قدرے جھک کر تصویر اور قریب سے دیکھی، پھر پیچھے ہٹ کر اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔ میکاولی نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا لیکن مارکوئیس اور زیادہ نروس ہو گیا۔ اس نے مضبوطی سے کرسی کے ہتھے پکڑ لیے۔

کاؤنٹ نے غور سے مارکوئیس کی طرف دیکھا، پھر اس نے دوبارہ مصور کو اشارہ کیا۔ مصور نے نافرلو کے سامنے دوسری تصویر پیش کی۔ یہ تصویر بھی پہلی تصویر کے مشابہ تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ محافظوں پر

شاعر

بادشاہ کو اس کی شان میں ایک زور دار قصیدہ سُنا رہا تھا، بادشاہ اس کے ہر شعر پر کہتا "مکرّر ارشاد، مکرّر ارشاد"

جب شاعر قصیدہ سُنا چکا تو بادشاہ نے اسے دس ہزار درہم بطورِ انعام پیش کیے۔ درہم وصول کرتے ہی شاعر نے بالکل بادشاہ کے انداز میں بے ساختہ عرض کیا "مکرّر ارشاد!"

مجبوراً بادشاہ نے خفت مٹانے کے لیے مزید دس ہزار درہم عطا کر دیے۔

حملہ کرنے والوں نے جو وردیاں پہن رکھی تھیں، ان کا رنگ شہنشاہِ فرانس کے محافظوں کی وردیوں جیسا تھا جو مارکوئیس کے ساتھ آئے تھے۔

"اس وقت ہمارے سامنے ایک بہت دلچسپ اور نازک صورتِ حال ہے۔" کاؤنٹ نے تبصرہ کیا۔

"خدا کی قسم۔" مارکوئیس نے بھڑک کر کہا۔ "یہ میری نہیں، پورے فرانس کی توہین ہے۔ اگر اس جاہل نے ——"

"بے گناہ آدمی کسی چیز سے نہیں گھبراتا۔" میکاولی نے سمجھایا۔ "وہ کبھی احتجاج نہیں کرتا۔" مارکوئیس نے غصے کی نظروں سے میکاولی کو دیکھا اور پھر وہ تینوں نافرلو کو دیکھنے لگے۔

"نافرلو کو غور سے دیکھو۔" کاؤنٹ نے کہا۔ "اگر اصل چور فرانسیسی لوگ ہیں تو وہ اثبات میں سر ہلائے گا —— اور پھر جنگ ہوگی خونریز جنگ۔"

لیکن نافرلو کا سر آہستہ آہستہ نفی کے انداز میں ہل رہا تھا۔

اچانک وہ اعصابی تناؤ ایک دم ختم ہو گیا جو ماحول پر طاری تھا۔ کاؤنٹ کا چہرہ بجھ گیا۔ اس نے مصور کو سر سے اشارہ کیا۔ مصور نے تیسری اور آخری تصویر نکالی۔ یہ تصویر پہلے کی دونوں تصویروں سے مختلف تھی۔ اس میں خود نافرلو کو کمرے کے دوسرے دروازے سے جھک کر جواہر کی تھیلی ایک ڈوری کی مدد سے نیچے لٹکاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر میں خود نافرلو مجرم تھا۔

"نافرلو کو آزاد کر دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر کاؤنٹ نے مصور سے آخری تصویر لے لی اور خود نافرلو کی طرف بڑھا۔ میکاولی اس کے ساتھ تھا۔ کاؤنٹ نے آخری تصویر نافرلو کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔

"نافرلو کو آزاد کر دیا جائے گا۔" کاؤنٹ نے دھیمے لہجے میں پھر کہا اور اپنی عرق آلود پیشانی ہاتھ سے رگڑی۔ نافرلو نے تصویر سے نظریں ہٹائے بغیر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"انسان نے انصاف کر دیا۔" میکاولی نے بلند آواز سے کہا۔

مارکوئیس نے تحسین آمیز نظروں سے کاؤنٹ کو دیکھا۔ "مجھے ایک سپاہی سے ایسی دانشمندی اور صداقت کی توقع نہیں تھی۔" کاؤنٹ نے نافریو کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا لیکن فوراً واپس کھینچ لیا پھر اس نے محافظوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "لے جاؤ اسے اور مجبور کرو کہ یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بھی بتا دے۔ اگر یہ نہ بتائے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔" کاؤنٹ تھکے تھکے انداز میں اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔

محافظ نافریو کی طرف لپکے اور اسے بڑی بے رحمی سے دروازے کی طرف گھسیٹنے لگے۔

نافریو کا منہ کھلا اور اس کے حلق سے ایک ایسی گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی جیسے کوئی بے بس جانور شدید اذیت کے عالم میں چیخنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میکاولی کی آنکھوں کے سامنے نافریو کا منہ چند لمحوں کے لیے کھلا تھا لیکن اس نے ان چند لمحات میں بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ نافریو کی زبان کٹی ہوئی تھی۔

کاؤنٹ تھکا ہارا سا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی درشتی غائب ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ کسی جنگ جو سپاہی کے بجائے ایک بوڑھا جاگیردار نظر آ رہا تھا۔ "نافریو میرے ساتھ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔" کاؤنٹ نے کچھ دیر بعد غم زدہ آواز میں کہا

مارکوئیس بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا اس نے ہمدردی سے کاؤنٹ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مطمئن رہو کاؤنٹ! فرانس کے شہنشاہ کو یہ واقعہ بتا دیا جائے گا۔" مارکوئیس نے کہا۔ "اور یہ بھی بتایا جائے گا کہ تم نے چور کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی حالانکہ وہ تمہارا بچپن کا ساتھی تھا اور تم اس سے محبت کرتے تھے۔ تم نے اپنی دوستی اور محبت، فرانس کے نام پر قربان کر دی۔"

کاؤنٹ خاموش رہا۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا مارکوئیس کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ میکاولی بھی باہر آ گیا۔ "مجھے یہ ملک پسند آیا۔" مارکوئیس نے خاموشی کا طلسم توڑنے کی غرض سے میکاولی کو مخاطب کیا۔

"ہاں یہ ملک اور بھی خوب صورت ہو جائے اگر جنگ کے منحوس بادل چھٹ جائیں اور کوئی بھیڑیا اسے پھاڑ کھانے کے لیے نہ موجود ہو۔" میکاولی نے جواب دیا۔

"یہ ملک شہنشاہِ فرانس کے زیرِ سایہ متحد ہو کر ایک عظیم مملکت بن سکتا ہے۔" مارکوئیس نے شمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور یہ عظیم کام ایک اطالوی کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے۔" میکاولی نے جنوب کی طرف دیکھا جہاں اس کے آقا کی ریاست واقع تھی۔

کچھ دیر وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر مارکوئیس نے سر اٹھا کر میکاولی کی طرف دیکھا۔ "یہ واقعہ جنگ کا بہانا ہرگز نہیں بننا چاہیے۔ میں شہنشاہ سے یہی سفارش کروں گا۔"

"ہاں انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے ہیں۔"

اپنے کمرے میں آ کر میکاولی نے بڑا سکون محسوس کیا۔ وہ خاموشی اور تنہائی کا عادی تھا۔ اسے علمی کاموں سے عشق تھا۔ وہ یونان کا سارا علم اپنی زبان میں بھی منتقل کرنا چاہتا تھا لیکن اس قسم کے فضول کام اس کا بہت وقت ضائع کر دیتے تھے۔ اب اسے اپنے آقا کے لیے ایک مفصل تحریری رپورٹ تیار کرنی تھی۔ اس نے ایک سادہ کاغذ گھسیٹ کر قلم دوات سامنے رکھے اور پھر لکھنا شروع کیا۔

لمبے چوڑے القاب کے بعد اس نے لکھا۔ "میری یہ رپورٹ صرف آپ کے ذاتی مطالعے کے لیے ہے۔ دربار میں سنانے کے لیے میں ایک دوسری رپورٹ اس کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ بہت سی اہم اور خفیہ باتوں کا ذکر اس میں نہیں ہے۔"

"میں جب کاؤنٹ مونٹاگنو کے قلعے میں آیا تو میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح بھی یہ چوری جنگ شروع کرنے کا بہانا نہ بننے دی جائے اور شہنشاہِ فرانس اسے بہانا بنا کر اٹلی پر حملہ نہ کر دے۔ کاؤنٹ مونٹاگنو نے اپنی ذہانت سے یہ خطرہ ٹال دیا ہے اور آپ نے میرے سپرد جو کام کیا تھا، وہ کاؤنٹ نے پورا کر دیا ہے۔ میں کاؤنٹ کو اتنا چالاک نہیں سمجھتا تھا۔

"پہلے میں کاؤنٹ کو بالکل احمق سمجھتا تھا لیکن احمق تو مارکوئیس تھا۔ کاؤنٹ کو معلوم تھا کہ مارکوئیس اس کی اس احمقانہ حرکت پر کسی تعجب کا اظہار نہیں کرے گا کہ اس نے بیش قیمت جواہر کی حفاظت کے لیے ایک ایسا آدمی کیوں متعین کیا جو بہرا اور گونگا تھا۔ اور تو اور مارکوئیس اتنا احمق ثابت ہوا کہ جب نافریو کے سامنے وہ تصاویر پیش کی گئیں تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا جن میں سے ایک میں کچھ لوگوں کو اٹلی کے درباری لباس میں حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور دوسری میں حملہ آور فرانسیسی لباس پہنے ہوئے تھے۔ حالانکہ خزانے والے کمرے میں اس قدر تاریکی رہتی ہے کہ اگر واقعی نافریو پر کسی نے حملہ کیا ہوتا تو تاریکی کی وجہ سے وہ حملہ آوروں کے لباس نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے بعد میں تصویر دیکھ کر

حملہ آوروں کو لباس کے ذریعے شناخت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کاؤنٹ نے مارکوئیس کی بے وقوفی پر بھروسا کرتے ہوئے یہ دو غلطیاں دانستہ کی تھیں حالانکہ ان غلطیوں کے پکڑے جانے کا احتمال تھا۔ ایک زبردست غلطی کاؤنٹ سے بھی ہو گئی جس کا احساس فوراً اسے بھی نہیں ہو سکا۔"

"اگر جنابِ عالی میری یہ خصوصی رپورٹ پڑھنے کے بعد میری عوامی رپورٹ پڑھیں تو اس سے معلوم ہو گا کہ مارکوئیس کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز نافرلو کی آخری چیخ تھی۔ اس کے اعترافِ جرم کے بعد جب محافظ اسے گھسیٹتے ہوئے جیل کی طرف جا رہے تھے تو وہ بری طرح چیخا تھا۔ مارکوئیس اس وقت جذبات میں ایسا بہا کہ اس نے غریب نافرلو کا کھلا ہوا منہ نظر انداز کر دیا میں نے نافرلو کے منہ میں کٹی ہوئی زبان اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ اسے کچھ ہی عرصہ پہلے کاٹا گیا تھا۔ کاؤنٹ کا یہ کہنا غلط تھا کہ نافرلو پیدائشی گونگا اور بہرا ہے۔ اس سے قوتِ گویائی حال ہی میں چھینی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نافرلو پہلے گونگا نہیں تھا اس لیے بہرا بھی نہیں تھا اور قوتِ گویائی چھن جانے کے بعد اگرچہ وہ بول تو نہیں سکتا تھا مگر کانوں سے سن ضرور سکتا تھا۔ وہ اگر کسی دوسرے کو اپنی بات سمجھا نہیں سکتا تھا تو دوسروں کی بات سمجھ ضرور سکتا تھا۔"

"اب میں کاؤنٹ کی ایک اور غلطی کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ یہ غلطی تصویروں سے متعلق ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر جنابِ عالی سے درخواست کروں گا کہ وہ میری عوامی رپورٹ ضرور پڑھ لیں خاص طور پر وہ حصہ جہاں میں نے نافرلو کی شہادت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کس طرح اسے تصویریں دکھا کر اس سے شہادت دلوائی گئی۔

کاؤنٹ نے ہمیں بتایا تھا کہ نافرلو کو شہادت کی نوعیت سے آگاہ کر دیا گیا ہے اس لیے مارکوئیس نے اس سلسلے میں کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نافرلو کو ہمارے سامنے لایا گیا۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میری عوامی رپورٹ پڑھ کر نوٹ فرمائیں کہ نافرلو کی موجودگی میں کسی نے بھی تصویروں کا ذکر نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ وہاں کسی قسم کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ یہ درست ہے کہ اگر نافرلو کو گونگا اور بہرا تسلیم کر لیا جائے تو تصویروں کا ذکر کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن آپ کو اور مجھے یہ معلوم ہے کہ نافرلو بہرا نہیں تھا۔"

"جنابِ عالی یہ بات بھی نوٹ فرمائیں کہ جب نافرلو کے سامنے پہلی تصویر پیش کی گئی تو کاؤنٹ نے اس سے یہ نہیں کہا کہ یہ تصویر غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ کیا چور میرے آدمی تھے؟ نہیں! اس نے صرف یہ کہا کہ اگر چور میرے آدمی ہوئے تو مجھے اپنے محافظوں کے پورے دستے کی گردنیں اڑانی پڑیں گی۔ کاؤنٹ نے کہیں بھی تصویر کا ذکر نہیں کیا۔ یہ الفاظ سن کر ظاہر ہے نافرلو کو نفی میں سر ہلانا پڑا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ جواہر کی چوری میں کسی محافظ کا ہاتھ نہیں ہے اور اس کے تمام ساتھی بے گناہ ہیں۔"

"جب دوسری تصویر پیش کی گئی، اس وقت بھی کاؤنٹ نے تصویر کا ذکر نہیں کیا، صرف اتنا کہا کہ اگر چوری فرانسیسیوں نے کی ہے تو ایک خونریز جنگ ہو گی۔ یہ الفاظ سن کر بدنصیب نافرلو نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

"جب تیسری تصویر پیش کی گئی جو نافرلو کے جرم کی تصویر تھی تو اس وقت بھی کاؤنٹ نے تصویر کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کی زبان سے جو جملہ نکلا وہ موقع و محل کی مناسبت سے بہت عجیب تھا۔ اس نے کہا کہ "نافرلو کو آزاد کر دیا جائے گا"۔ نافرلو نے یہ الفاظ سن کر زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ آزاد ہونا چاہتا ہے جسے مارکوئیس نے اعترافِ جرم تصور کیا کیوں کہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ نافرلو درِ اصل بہرا نہیں ہے۔ اس طرح اثبات میں سر ہلا کر اس بدقسمت انسان

نے خود اپنی موت کے پروانے پر مہر لگا دی۔

"نافرلو مجرم نہیں تھا. جیسا کہ اب تک آپ نے اندازہ لگایا ہو گا جواہر چرانے والا خود آپ کا دوست کاؤنٹ مونٹا گو تھا۔ اس نے اس چوری کا منصوبہ پہلے ہی سے تیار کر لیا تھا۔ اس نے یہ منصوبہ اس وقت بنایا ہو گا جب اس نے آپ کے بیش قیمت تحائف دیکھے ہوں گے اسی وقت اس کی نیت میں فتور آ گیا ہو گا. مارکوئیس کو اس نے دوپہر کے وقت کمرے میں لے جا کر جواہر دکھا دیے تھے۔ اس کے بعد وہ کھانے سے پہلے کسی وقت خود کمرے میں گیا ہو گا۔ اس نے اپنی تلوار سے ایک محافظ کی گردن اڑائی ہو گی اور نافرلو کو صرف زخمی کر کے چھوڑ دیا ہو گا تاکہ بعد میں اس غریب کے فیصلے میرے اور مارکوئیس کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت کر سکے' مجھے یقین ہے کہ اس وقت نافرلو کی زبان کاٹی جا چکی تھی۔"

"عالی مرتبت اب کاؤنٹ کا منصوبہ سمجھ گئے ہوں گے کہ آخر نافرلو کی زبان کاٹنے، تصویروں کے ذریعے نافرلو سے شہادت دلوانے اور اس موقع پر وہ مخصوص جملے ادا کرنے سے کاؤنٹ کا کیا مقصد تھا؟ آخر نافرلو نے آخری تصویر دیکھ کر اثبات میں سر ہلا کر اپنے مجرم ہونے کی تصدیق کر دی۔۔۔ نافرلو نے جرم کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ وہ جرم کا اعتراف کر ہی نہیں سکتا تھا کیوں کہ وہ مجرم نہیں تھا اور اس نے تینوں میں سے ایک بھی تصویر نہیں دیکھی تھی۔۔۔ نافرلو اندھا تھا۔ وہ بہرا نہیں تھا، اندھا تھا۔ وہ اپنا سر نفی اور اثبات میں صرف کاؤنٹ کی زبان سے ادا ہونے والے مخصوص جملے سن کر ہلا رہا تھا۔"

"مجھے نافرلو کے اندھے ہونے کا شبہ اسی وقت ہو گیا تھا جب مصور نے وہ تصاویر اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے اس کی آنکھوں کے سامنے اس طرح پکڑی تھیں کہ ہم لوگ یہ نہ دیکھ سکیں کہ نافرلو تصویریں نہیں دیکھ رہا ہے۔ تیسری اور آخری تصویر نافرلو کو خود کاؤنٹ نے دکھائی تھی اس وقت میں کاؤنٹ اور نافرلو کے بالکل نزدیک تھا مشعل کی روشنی میں میں نے نافرلو کی بے نور آنکھیں غور سے دیکھ کر اپنے شبہے کی اسی وقت تصدیق کی تھی۔"

"میرا ذاتی خیال ہے کہ نافرلو پیدائشی اندھا تھا۔ کاؤنٹ نے اسے گونگا کر کے اس پر ایک اور ظلم کیا لیکن نافرلو سے زیادہ اندھا مارکوئیس تھا جس کی نظروں کے سامنے حقیقت موجود تھی مگر وہ اسے دیکھ نہیں سکا۔"

"میں نے کاؤنٹ سے اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کی کیوں کہ اس نے اپنا کام پورا کر دیا تھا اور نافرلو نے بھی اپنا کام انجام دے دیا تھا۔ دونوں نے مل کر فرانس کو بڑی صفائی سے بے وقوف بنا دیا۔ اگر میں کاؤنٹ کو یہ بتا دیتا کہ وہ کم از کم مجھے اس ڈرامے سے بے وقوف نہیں بنا سکا ہے تو اس سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کاؤنٹ کو یہ علم ہو جاتا کہ اس راز سے کوئی دوسرا بھی واقف ہے تو ممکن تھا کہ ہمیں اس سے نقصان پہنچتا. حکومت کرنے کا ایک بنیادی گر یہ بھی ہے کہ ہر اس کام سے پرہیز کیا جائے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔

اس واقعے سے ہمیں جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے اپنے دوست کاؤنٹ کی حقیقت کا اظہار ہو گیا اور ہمیں اس کی معاشی کمزوری کا علم ہو گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ کاؤنٹ اپنی فوج بڑھانے اور اسے اسلحے سے لیس کرنے کی خواہش میں اتنا اندھا ہو چکا ہے کہ اس نے اپنی اس خواہش کی تکمیل کی دھن میں یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر مارکوئیس اس کا منصوبہ بھانپ لیتا تو اس کا نتیجہ فرانس کے ساتھ ایک خونریز جنگ کی صورت میں برآمد ہوتا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی فوج میں اس طرح اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ خود اس کے دوستوں کو بھی اس کا علم نہ ہو سکے۔ اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی فوج اور قوت کو ایک روز جناب کے خلاف استعمال کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے ورنہ اس طرح خفیہ طور پر جناب عالی کی دولت چرا کر فوج بڑھانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اس کی حد سے بڑھی ہوئی چالاکی اور عیاری نے اسے ہمارے سامنے برہنہ کر دیا ہے۔ اب ہم اس کے ارادوں سے واقف ہو گئے ہیں اور اب ہم اسے اپنے مقاصد کے لیے صرف اس وقت تک استعمال کریں گے جب تک ضروری ہو گا۔ کیوں کہ وہ دوستی اور بھروسے کے قابل نہیں ہے۔

یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے سب کو فائدہ پہنچا. فرانس کے شہنشاہ کو مارکوئیس اس چوری کے بارے میں مطمئن کر سکتا ہے۔ کاؤنٹ کو جواہر مل گئے اور جناب عالی کو اپنے دوست کے بارے میں ایسی معلومات مل گئیں جن کے سامنے جواہر کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ صرف نافرلو کو اس سے نقصان ہوا۔ وہ غریب خواہ مخواہ مارا گیا۔

اس کے ساتھ ہی میں اپنا خط ختم کرتا ہوں اور عالی جناب سے قدم بوسی کی اجازت طلب کرتا ہوں۔ خادم ہمیشہ سے آپ کا وفادار ہے اور ہمیشہ آپ کا وفادار رہے گا۔ آپ کا نکولائی میکاولی۔"



پٹرول کے خرچ میں واضح کمی
انجن کی عمر میں یقینی اضافہ!

آجکل وائی ٹین والے پٹرول ہی سے کار چلانے کے اخراجات میں کمی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وائی ٹین کی بدولت آپ فی گیلن زیادہ مسافت طے کرتے ہیں۔ وائی ٹین انجن کی حفاظت کرتا ہے، کاربوریٹر کو صاف رکھتا ہے اور پٹرول کو پوری طرح جلنے میں مدد دیتا ہے۔ نتیجتاً آپ پٹرول کے خرچ میں کمی اور کار کی عمر میں اضافہ ہوتا محسوس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کار کا پک اپ پہلے سے بہتر ہو جاتا ہے۔

ایسو سروس اسٹیشنوں پر ہر قسم کی کار کے لئے پٹرول دستیاب ہے۔ ماڈل پرانا ہو تو ایسو ریگولر، گاڑی ہائی کمپریشن والی ہو تو ٹائیگر (ایسو ایکسٹرا) اب دونوں میں وائی ٹین شامل ہے۔

ٹائیگر میں **وائی ٹین** تو پہلے ہی موجود ہے





کفایت اور بہتر **کار**کردگی کے لئے

ESSO.2.193.72.UD

LINTAS



سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

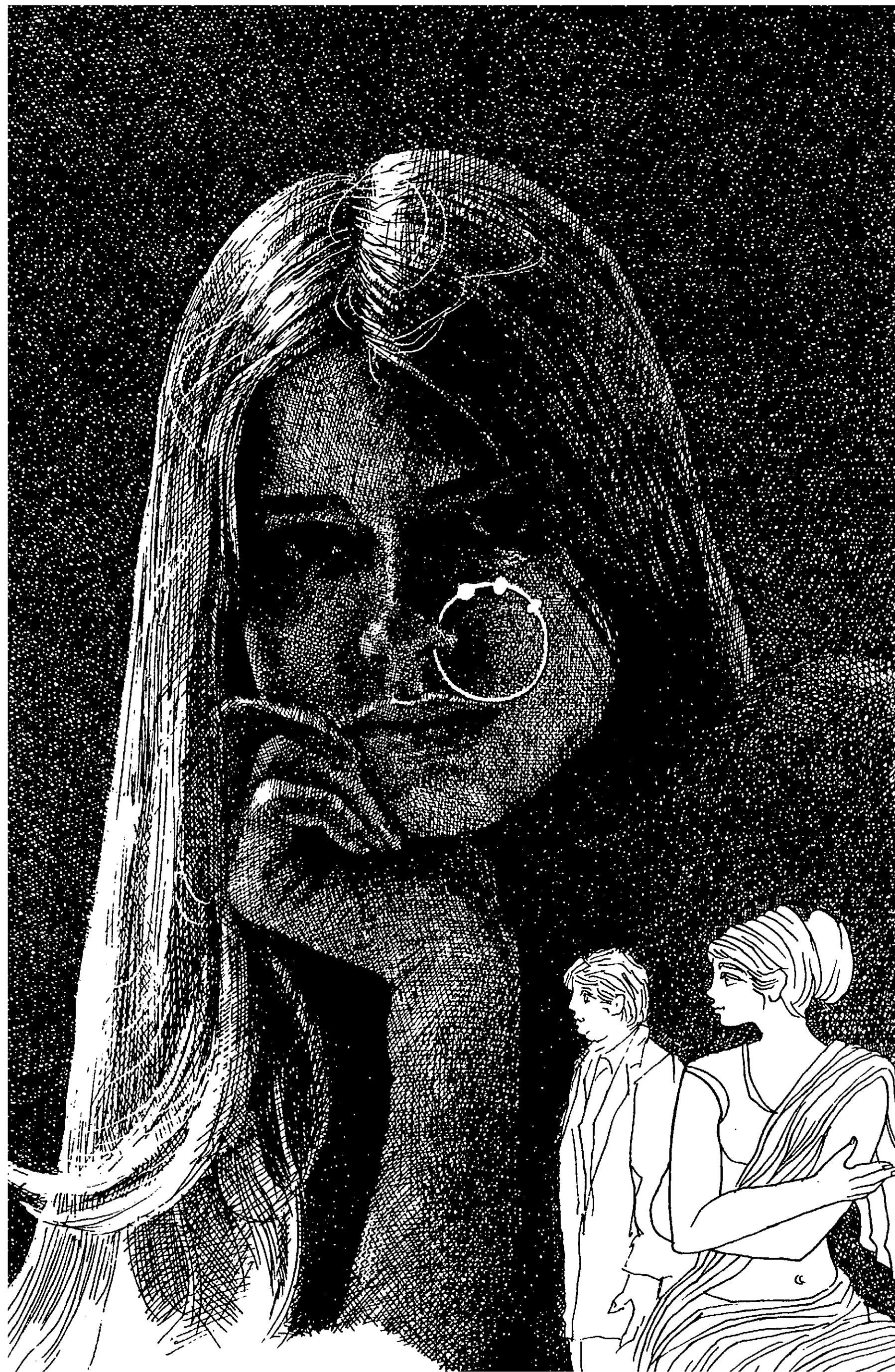
۲۷

گزشتہ قسطوں کے واقعات کا خلاصہ

جمیل احمد خاں

میں اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ملازمت کے لیے ایک دوسرے شہر میں آگیا تھا۔ یہاں ایک شخص رام دیال سے میری دوستی ہوگئی۔ اس کی ماں مجھ پر بہت مہربان تھی۔ وہ آئے دن پنڈتوں پجاریوں کو اپنے پاس بلاتی رہتی۔ ایک دن اچانک اس نے مجھ سے یہ عجیب بات کہی کہ اگر میں ایک خاص جاپ کرلوں تو انکا کی پُراسرار طاقت اپنے قبضے میں کرسکتا ہوں۔ انکا کون ہے؟ میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی اس لیے کہ میں توہمات کا قائل نہیں تھا۔ ایک دن رام دیال کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ دوسری صبح جب میں دفتر جارہا تھا تو دفعتہً محسوس ہوا کہ کوئی ہلکی پھلکی چیز میرے سر پر آگری ہے، میں نے بار بار سر جھٹکا۔ بالوں میں انگلیاں پھیریں مگر کسی پُراسرار شے کے پنجوں کی چبھن کم نہ ہوئی۔ تصور کی نگاہ سے میں نے اپنے سر کی طرف دیکھا تو وہاں ایک خوبصورت، نازک اور نوعمر دوشیزہ جلوہ فروز نظر آئی۔ اس نے غیر متوقع طور پر اپنی میٹھی اور سریلی آواز میں سرگوشی سے بتایا کہ وہ انکا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انکا نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی تھی اس لیے میرے سر پر چلی آئی تھی۔ وہ چھوٹی سی نازک اندام عورت آفت کی پرکالہ ثابت ہوئی۔ وہ عجیب و غریب اور غیر معمولی قوتوں کی مالک نکلی۔ اس نے مجھے مکمل طور پر قابو کرکے اپنے احکام پر چلنے کے لیے مجبور کردیا۔ انکا ایک ایسی غیر مرئی اور پُراسرار قوت تھی جس کی زندگی کا انحصار انسانی خون پر تھا۔ وہ غذا کے طور پر انسانی خون پیتی تھی لیکن کسی انسان کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ یہ خدمت اس نے میرے سپرد کی اور مجھے مجبوراً اس کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ اس ہولناک خدمت کے عوض اس نے ایک قلاش اور نادار آدمی کو مالدار ترین آدمی بنادیا۔ رفتہ رفتہ انکا کی طاقت کے عقدے مجھ پر وا ہوتے گئے میں اس کی بدولت الٹلے تللے، عیش ، عشرت ا... کی زندگی بسر کرنے لگا لیکن اس کے ساتھ ہی میرے شب و روز ناگہانی خطروں، تعجب خیز ہنگاموں اور عجیب و غریب مہمات میں گزرنے لگے۔ اس پُراسرار عورت کے اشارے پر مجھے ہر مہینے کسی نہ کسی انسان کو قتل کرنے کا یہ دہشت ناک کام انجام دینا پڑتا تھا تاکہ انکا اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے اس کا خون پی سکے۔ میرے سامنے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ انکا بری طرح میرے سر پر مسلط تھی۔ سب سے پہلے میں نے اپنی محبوبہ نرگس کے منگیتر کو قتل کیا اور پولیس کے ڈر سے بمبئی بھاگ آیا۔ یہاں انکا کے طفیل مجھے ہر نعمت نصیب ہوگئی۔ کار، کوٹھی، بے پناہ دولت، نوکر چاکر۔ پھر ایک دن میری محبوبہ نرگس اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر میرے پاس چلی آئی۔ اس کے بعد میں نے انکا کو چھوڑ کر شریف آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا بارہا ارادہ کیا لیکن انکا نے پیچھا نہ چھوڑا بلکہ اس نے مجھے منحرف دیکھ کر اپنی مقصد براری کے لیے میرے علاوہ نرگس کو بھی طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں، مختلف اندوہ ناک مصائب سے دوچار کیا اور ہماری زندگی اجیرن کرکے رکھ دی۔ مجبوراً مجھے اپنے ارادے سے منہ موڑ کر اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ پھر انکا کی نوازشیں بڑھ گئیں۔ اس قدر کہ میں خود کو فراموش کر بیٹھا۔ وہ میری عادت بن گئی اس کی بدولت سرمایہ، لڑکیاں غرض ہر عیش و عشرت کے دروازے مجھ پر کھلے رہے۔ نہ جانے کتنے نشیب و فراز آئے میں نے کتنے دکھ جھیلے۔ نہ جانے کتنے قتل، خون، گرفتاریاں، عدالت اور رشوتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک کے بعد ایک حادثہ، ایک کے بعد ایک ہنگامہ۔ میں ہندوستان کے تقریباً تمام قابل ذکر شہروں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ کبھی مجبوراً اور کبھی تفریحاً۔ میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ انکا مجھ سے چھن سکتی ہے۔ ایک زمانے میں میں خود چاہتا تھا کہ وہ میرے سر سے چلی جائے لیکن اب ایک سنگین صورت حال ہوگئی تھی۔ انکا چونکہ ایک ناقابل یقین پُراسرار قوت تھی اس لیے بعض بڑے پنڈت اسے حاصل کرنے کے لیے عموماً سر دھڑ کی بازی لگائے رہتے تھے اور ایک مخصوص جاپ کرتے تھے جو انکا کے حصول کے لیے ضروری تھا۔ یہ مزاحمتیں شروع ہوگئی تھیں اور ان مزاحمتوں اور معرکہ آرائیوں کی بنا پر میری زندگی مستقل حالت جنگ میں تھی۔ انکا کو میں کس طرح جدا کرسکتا تھا؟ انکا کو جدا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اپنی سابق زندگی میں لوٹ جاؤں۔ اس جہنم میں واپس چلا جاؤں۔ انکا کو بدستور اپنے تصرف میں رکھنے کے لیے بسا اوقات بڑی بعید از قیاس قسم کی احتیاطی تدبیریں اختیار کرنی پڑتی تھیں۔ اس کے باوجود ایک مرتبہ انکا میرے ہاتھوں سے نکل گئی اور تربینی داس کی تحویل میں چلی گئی۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا کہ میں سنبھل نہ سکا۔ انکا کے بغیر میں ایک ایسا سپاہی تھا جو دشمنوں کے نرغے میں غیر مسلح کھڑا ہو۔ میں اس کے بغیر اس قدر پستی میں گر گیا کہ تربینی داس نے مجھے اس کا غلام بننے پر مجبور کردیا۔ اس نے مجھے شدید ترین اذیتوں سے دوچار کردیا یہاں تک کہ میں نے خودکشی کی کوشش کی۔ میری نرگس بھی مجھ سے چھین گئی۔ تمام بساط الٹ گئی۔ ایک انکا کے جانے سے میں تباہ و برباد ہوگیا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک موقع ایسا آیا کہ جب اس بدبخت تربینی داس سے مجھے باہر جانے کی اجازت مل گئی اور میری ملاقات ایک صوفی برکاتی شاہ سے ہوئی تو اس کے اشارے پر میں نے چالیس روز تک ایک ویران قبرستان میں وظیفہ پڑھا۔ ان پے درپے مصائب کے بعد بہرحال میری انکا مجھے دوبارہ مل گئی لیکن ابھی میں نے اپنے حواس پر قابو بھی نہیں پایا تھا کہ ایک بدذات پنڈت بدری نرائن میرے پیچھے پڑ گیا۔ درمیل برکاتی شاہ کا پتہ اسی نے مجھے بتایا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ انکا کے حصول کے بعد میں کچھ دنوں کے لیے اسے انکا کی قوت مستعار دے دوں لیکن میں اپنی انکا کو ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا کرنے کے موقف میں نہیں تھا اس لیے میں نے صاف انکار کردیا۔ بدری نرائن ایک بڑا پنڈت تھا اس نے مشتعل ہوکر مجھے عجیب و غریب اور عبرتناک حالات سے دوچار کردیا اگر انکا میرے ساتھ نہ ہوتی تو بدری نرائن کے ہاتھوں میرا زندہ بچنا مشکل ہوجاتا۔ بہرحال بدری نرائن میرا تو کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن اس نے میری محبوب بیوی نرگس کو مجھ سے چھین لیا میں نے اسے انکا کے ذریعے دوبارہ حاصل کرلیا تھا۔ دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہوگئی تھی۔ میں آندھی اور طوفان کی طرح اس کا تعاقب کرتا ہوا کشمیر سے کلکتے پہنچا لیکن بدری نرائن نے وہاں کالی کے مندر میں پناہ لے لی۔ کالی کے سامنے انکا کی پُراسرار قوتیں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ اب بدری نرائن سے انتقام لینے کے لیے مجھے کسی مہان شکتی والے پنڈت کے سہارے کی ضرورت تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ میسور کی پہاڑیوں میں تمام دنیا سے بے نیاز ایک گیانی دھیانی پنڈت پریتم لال رہتا ہے وہ میری مدد کرسکتا ہے۔

میں شہروں اور جنگلوں کی خاک چھانتا ہوا اپنی محبوبہ کلدیپ کے ساتھ میسور کی پہاڑیوں میں جا پہنچا حسین و جمیل کلدیپ پونا کے ایک امیر ترین باپ کی بیٹی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس نے نرگس کے بعد مجھ سے شدید محبت کی تھی اور ماں باپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ میسور کا یہ پہاڑی علاقہ بڑی سنسان، ہیبت ناک اور پُراسرار جگہ تھی۔ میری بدقسمتی سے یہاں پانی کے ایک جھرنے پر پریتم لال کی خوبصورت اور نوخیز پجارن مالا عریاں نہا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا۔ میں دست درازی کر بیٹھا مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ مجھے مہان پجاری کے شدید قہر و غضب کا نشانہ بننا پڑا پریتم لال نے کلدیپ کو مجھ سے چھین کر اپنی داسی بنالیا اور مجھے مفلوج و معطل کردیا۔ یہ دور میری زندگی کا بے حد تاریک اور کٹھن دور تھا۔ سزائیں سہتے سہتے جب میں زندہ درگور ہوگیا تو تقدیر نے پھر پلٹا کھایا پریتم لال کا آخری وقت قریب آگیا تھا۔ اس نے مجھے معاف کردیا اور سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ مالا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھمانے کے علاوہ ایک شکتی بھی مجھے دان کی۔ کلدیپ دم بہ رہ گئی اور میں حسین و جمیل مالا



کوئے کر بدری نرائن سے انتقام لینے کے لیے کلکتے روانہ ہوگیا۔ راستے میں عرصۂ دراز کے بعد بالکل اچانک میری ملاقات اپنے سگے چچا خورشید احمد خاں سے ہوئی۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے چچا بھتیجے ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ کلکتے میں انھوں نے میرے اور مالا کے ساتھ ہی قیام کیا۔ کلکتے میں مالا کے رشتے دار رہتے تھے۔ جب انھیں اس کی اطلاع ملی کہ ایک مسلمان شخص اس کا شوہر ہے تو وہ اسے ہوٹل سے لے گئے۔ بدری نرائن سے انتقام لینے کی بھی کوئی سبیل نہ نکل سکی۔ میں کالی کے مندر میں داخل ہوا اور وہاں سے ناکام لوٹا۔ چچا جان، میں اور مالا پے درپے حادثات سے دوچار ہوگئے۔ مجھے چاروں طرف سے مایوسیوں نے گھیر لیا۔ مالا اپنے والدین کے قبضے میں تھی اور چچا جان اس کے اغوا کے الزام میں جیل میں تھے۔ اس نازک موقع پر انکا کام آئی۔ اگر بات زیادہ بگڑ جاتی تو وہاں فرقہ وارانہ فساد ہوجاتا۔ ایسے نازک وقت میں ایک اجنبی سادھو جگدیو نے میری مدد کی۔ اس نے مجھے فوراً کلکتہ چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ میں انکا کو چھوڑ کر تنہا وہاں سے چلا آیا۔ بنارس اسٹیشن پر سادھو جگدیو مجھے پھر نظر آیا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ چچا جان بھی وہاں موجود تھے۔ مجھے ان کے ساتھ لکھنؤ آنا پڑا۔ مالا کو انکا نے پہلے ہی لکھنؤ پہنچا دیا تھا۔ یہاں چچا جان نے ہم دونوں کو اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ چچا زاد بھائی اور بہنوں افرزانہ اور رخسانہ نے میری اور مالا کی جو پذیرائی کی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ لکھنؤ آتے وقت ٹرین میں مجھے ایک خوبصورت اور نوعمر لڑکی تزئین ملی تھی۔ اس کے چہرے میں نرگس کی شباہت تھی۔ اس لیے میں اسے اپنے دل کے قریب محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے اس سے بڑی اپنائیت کی باتیں کی تھیں اور اسے متاثر کرلیا تھا۔ وہ لکھنؤ کی ایک مشہور اور معیاری نائکہ اشرفی بیگم کی بیٹی تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر میں نے تزئین کو اس گندے ماحول سے نکالنے کا فیصلہ کیا لیکن جب میں نے اس سلسلے میں اشرفی بیگم کے بالاخانے کے چکر لگانے شروع کیے اور کوئی عملی قدم اٹھانے کا ارادہ کیا تو لکھنؤ کے بعض بااثر امرا، نوابین اور افسران میرے درپے ہوگئے کیونکہ تزئین ان سب کا مرکز و محور تھی۔ ان عیاش طبع افسران اور نوابین سے میری زبردست معرکہ آرائی ہوتی۔ انکا جیسی پُراسرار قوت میرے ساتھ تھی اس لیے میرے ہمت ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انھی ہنگاموں میں لکھنؤ کے ایک معزز نواب بتن علی نے مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے میری بے گناہ بہن رخسانہ کو اغوا کروالیا۔ یہ صورتِ حال بے حد خطرناک اور ناقابلِ برداشت تھی۔ میں غیظ و غضب کے عالم میں اس کمینے نواب کی حویلی میں جا پہنچا اور انکا کی مدد سے اس کے ہاتھوں اس کی ایک داشتہ زمرد کو قتل کروا دیا لیکن ابھی میرا انتقام پورا نہیں ہوا تھا۔ میں نے بتن علی کو دھمکی دی کہ اس نے میری ناموس پر ہاتھ ڈالا ہے تو میں بھی جب تک اس کی بہنوں درخشاں اور زرافشاں کو کوٹھے کی زینت نہیں بنا دوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ اسی روز بتن علی گرفتار ہوگیا۔ اور انکا کے زیرِ اثر اس نے اقبالِ جرم کرلیا۔

دوسری طرف تزئین، جس دن اس کا سودا ہونے والا تھا، پُراسرار طور پر کہیں غائب ہوگئی، ظاہر ہے اشرفی بیگم نے مجھے تزئین کے اغوا کا ملزم ٹھہرایا حالانکہ مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے لکھنؤ کے ایک پنڈت مرلی دھر کو مجھے قابو میں کرنے کے لیے متعین کیا اور شہر کے رؤسا اور پولیس کو میرے خون کا پیاسا بنا دیا مگر انکا کی دست گیری سے مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ خود اشرفی بیگم اور اس کے بااثر اور معتقد خیرخواہ ناظم علی اور یاور مرزا وغیرہ مصائب میں گرفتار ہوگئے۔ اس سلسلے میں انکا نے بعض بڑے تحیر خیز کرشمے دکھاتے اور ایک بوڑھے سادھو جگدیو نے، جو آں جہانی پریتم لال کا دوست تھا، قدم قدم پر میری مشکلیں آسان کیں۔ پھر بھی پولیس کی جانب داری اور بعض معزز رؤسا کی کوششوں سے بتن علی باعزت بری ہوگیا۔

میں لکھنؤ کی ہنگامہ خیز اور رنگا رنگ زندگی میں بڑی حد تک اپنے بدترین دشمن بدری نرائن کو بھولا رہا لیکن اس سے انتقام لینے کی آگ میرے سینے میں بدستور سلگتی رہی۔ میں نے اسے ٹھکانے لگانے کے لیے ایک بار کلکتے بھی جانا چاہا مگر سادھو جگدیو کسی نامعلوم مصلحت کی بنا پر میرے راستے کی دیوار بن گیا۔ سادھو جگدیو سے اس سلسلے میں تلخ کلامی ہوئی۔ میں نے کلکتے جانا چاہا اس لیے کہ بدری نرائن نے انکا کے حصول کا جاپ کالی کے مندر ہی میں بیٹھ کر شروع کر دیا تھا۔ گویا وہ اب مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز بھی چھین لینا چاہتا تھا۔ میں نے جگدیو سے صاف منع کر دیا کہ میں اس کے مشورے کے باوجود کلکتے جاؤں گا اور قسمت آزماؤں گا لیکن مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔ ٹرین میں مجھے گرفتار کرلیا گیا تھا۔ مجھ پر مظالم کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں کچھ نہ کرسکا اور بدری نرائن کے جاپ کے چالیس دن ختم ہونے کے بعد انکا میرے سر سے چلی گئی۔ جب میں جیل سے چھوٹا تو بدری نرائن میرے سر پر موجود تھا۔ اس نے انکا کی مدد سے میرے خلاف کچھ ایسے جال بُنے کہ میرے لیے سکون کا سانس لینا محال ہوگیا۔ وہ مجھے بھیانک اذیتیں پہنچا کر کتے کی موت مارنا چاہتا تھا لیکن کوئی اجنبی اور پُراسرار طاقت بدری نرائن اور انکا کی شیطانی قوتوں کے مقابلے میں میری پشت پناہی کر رہی تھی۔ ایسے ہی ایک خطرناک موقع پر ایک پُراسرار لڑکی کہیں سے نمودار ہوئی اس کا نام کلپنا تھا۔ اس نے عین وقت پر مجھے موت کے منہ سے بچالیا۔ کلپنا کے پُراسرار وجود میں نہ جانے کیا بات تھی کہ بدری نرائن اور انکا اس کے سامنے مجھ سے انتقام لینے سے قاصر تھے مگر اپنے حربوں سے باز نہیں آتے تھے۔ چنانچہ ایک روز جب میں ساری دنیا سے دل برداشتہ ہوکر چچا جان کے گھر کی طرف جارہا تھا تو اس مردود نے پھر میرا راستہ روک لیا اور مجھے اپنے بے رحمانہ سلوک کا نشانہ بنانا چاہا لیکن اچانک کلپنا نمودار ہوکر اس کے لیے رکاوٹ بن گئی۔

نازک اندام کلپنا کی پُراسرار ہستی بدری نرائن جیسے پنڈت کے لیے ایک چیلنج بن گئی تھی۔ کلپنا نے اپنی مخفی قوتیں بروئے کار لاکر اسے معذور و بے بس کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا وہاں سے منہ کالا کرگیا۔ ساتھ ہی وہ مہر و مروت کی دیوی بھی مجھے سراسیمہ چھوڑ کر یکایک نظروں سے اوجھل ہوگئی اور میں اس کی تلاش میں دیوانہ وار ممکنہ مقامات کی خاک چھاننے لگا۔ میں کلپنا کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ اچانک ویران قبرستان میں سادھو جگدیو کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر کسی جاپ میں مصروف تھا۔ اس کی مہربان شخصیت میرے لیے امن و عافیت کا گہوارہ تھی۔ اس لیے میں وہیں رک گیا۔ کرب و اضطراب کے عالم میں انتظار کرتے کرتے مجھے تین روز گزر گئے مگر اس کا جاپ ختم ہونے کے آثار نظر نہ آئے۔ چنانچہ میں نے سخت مجبوری اور بیزاری کی حالت میں چچا جان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور جب میں بوجھل قدموں اور پراگندہ خیالات کے ساتھ واپس جارہا تھا تو راستے میں پھر انکا نے بدری نرائن کے حکم سے مجھے آ دبوچا۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اسے کلپنا کی نامعلوم قوت کی اصلیت سے آگاہ نہ کیا تو وہ اپنے موجودہ آقا کی خوشنودی کے لیے میرا خون پینے سے بھی دریغ نہیں کرے گی مگر کلپنا کی ذات خود میرے لیے معمہ تھی۔ انکا دھمکیاں دے کر ناکام واپس چلی گئی۔ جب میں چچا جان کے گھر پہنچا تو میری ہیئت کذائی اور خستہ حالی کے باوجود وہ لوگ مجھے دوبارہ دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہوگئے اور میں تمام مصائب بھلا کر اپنی مالا کی آغوش میں پناہ گزیں ہوگیا۔ تزئین کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ انکا ہوتی تو میں تزئین کی تلاش کا کام آگے بڑھاتا۔ اگلے روز میں مالا کے مشورے پر اپنے عزیزوں سے رخصت ہوکر میسور کے لیے روانہ ہوگیا۔ جہاں میری جاں نثار محبوبہ کلدیپ دنیا بھر کی رنگینیوں سے دست بردار ہوکر تیاگ اور تپسیا کے کڑے دن گزار رہی تھی۔ وہ میری خاطر پریتم لال کی داسی بن گئی تھی۔ مجھے اس کا استھان تلاش کرنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ میں ایک دن میسور کی پہاڑیوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ وہاں مجھے اچانک ایک لڑکی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر خود مجھے یقین نہیں آیا کہ میں جاگ رہا ہوں اور جو کچھ میرے سامنے ہے وہ سچ ہے۔ وہ تزئین تھی۔ اسے اس طرح اچانک اور خلافِ توقع اپنے سامنے پاکر میں فرطِ مسرت سے پاگل ہوگیا۔ تزئین نے مجھے دیکھا تو سینے سے لگ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بالکل نامعلوم طور پر خواب کی سی حالت میں یہاں پہنچی تھی اور اب ایک جوگن اس کی رکھوالی کر رہی ہے۔ یہ جوگن کلدیپ کے سوا کون ہوسکتی تھی؟ میں تزئین کے ساتھ کلدیپ کی کٹیا میں پہنچا۔ کلدیپ کی خوبصورتی میں ایک تقدس اور جلال پیدا ہوگیا تھا لیکن میرے لیے اس میں وہی اپنائیت وہی سپردگی اور وہی کنیزی تھی۔ میں اس کے سامنے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا۔ اس نے مجھے نہایت باوقار لہجے میں صبر و اطمینان کا درس دیا۔ اس طرح میں کئی روز تک اپنی کلدیپ کا مہمان رہا۔ ایک دن تزئین کی غیر موجودگی میں کلدیپ کی قربت نے مجھے گزرے ہوئے دن یاد دلا دیے اور کلدیپ بھی تمام تر اتناع کے باوجود اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔ قریب تھا کہ ہم دونوں وارفتگی اور بے خودی کے عالم میں ایک دوسرے میں تحلیل ہوکر رہ جاتے کہ کلدیپ یکایک بجلی کی طرح تڑپ کر مجھ سے علیحدہ ہوگئی اور منہ ڈھانپ کر بری طرح سسکنے لگی۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے روتے ہوئے مجھے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ بدری نرائن نے موقع پاکر مالا کا کام تمام کردیا ہے۔ اس سانحے پر کلدیپ اس طرح شرمسار تھی جیسے یہ سب کچھ اسی کی غفلت ـــــــ سے ہوا ہے۔ مالا کی بے وقت موت کا غم مجھ پر بجلی بن کر گرا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں اسی حالت میں کیوں اور کیسے چچا جان کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں مسلسل ایک ہفتے تک مجھ پر مدہوشی اور غفلت طاری رہی۔ جب مجھ میں کچھ جان آئی تو چچا جان نے مجھے

مالا کی قبر پر گئے۔ یہاں میری زندگی دفن تھی۔ یہیں دفن تھا۔ وہاں سے مجھے چچا جان ایک لاش کی طرح بمشکل گھر واپس لے گئے۔ آخر چند روز تک ناقابلِ یقین اور ناگفتہ بہ کیفیات میں زندگی گزارنے کے بعد میں نے زبردستی سب سے رخصت ہو کر دوبارہ میسور جانے کے لیے رختِ سفر باندھا لیکن اس سے پہلے کہ میں ٹرین میں سوار ہوتا، سادھو جگدیو نے مجھے آلیا۔ وہ بھی افسردہ اور مضمحل تھا اور بدری نرائن سے مالا کا انتقام لینا چاہتا تھا مگر بدری نرائن دو موسموں کے لیے کالی کی حفاظت میں تھا۔ ایسے آڑے وقت میں وہی کام آیا اور اس نے میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ اس نے مجھے غم غلط کرنے کے لیے سمندر پار کے لمبے سفر پر جانے کا مشورہ دیا۔ مالا کے بعد میرے لیے دنیا میں کیا رہ گیا تھا۔ ہر جگہ یکساں تھی۔ میں نے بے دلی سے جگدیو کا مشورہ قبول کیا اور اس نے خوش ہو کر مجھے ایک ایسی چیز دان کی کہ میں دنگ رہ گیا۔ وہ انکا تھی۔



سادھو جگدیو میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، مجھے حیرت تھی کہ اس نے چالیس روز تک ایک کٹھن جاپ کرکے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی اور پھر انکا جیسی پراسرار طاقت کو یوں میری جھولی میں ڈال دیا جیسے وہ اس کے لیے کوئی معمولی چیز ہو۔ یہ اتنا بڑا احسان تھا جس کی توقع میں نے کبھی سادھو جگدیو سے نہیں کی تھی۔ میں نے جب انکا کو اپنے سر پر محسوس کیا تو میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ میرے محسن نے مجھے شکریے کا موقع بھی نہیں دیا اور بڑی بے نیازی سے کہیں روپوش ہو گیا۔ زمانے کے جبر اور ستم کے اتنے مشکل دن گزارنے کے بعد انکا پھر میرے سر پر آگئی تھی۔ اس سے اس وقت باتیں کرتے ہوئے کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ شکووں شکایتوں کا ایک دفتر تھا لیکن یہ پرانی بات ہو گئی تھی۔ انکا کے چہرے پر سنجیدگی مسلط تھی۔ میں نے نگاہ اوپر اٹھا کر دیکھا تو اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ شرمندگی اور ندامت کا احساس اس کے چہرے سے نمایاں تھا۔ کچھ دیر یوں ہی خاموشی رہی پھر میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سکوت توڑا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"انکا کیسی ہو؟"

وہ کسمسا کر بولی "ٹھیک ہوں۔"

"اس قدر خاموش کیوں ہو؟ کیا تمھیں دوبارہ میرے پاس آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟"

"جمیل!" انکا نے نظریں اُٹھائیں۔ اس کی دراز پلکوں کے گوشے نم تھے، اس کے نرم و نازک ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کپکپا رہے تھے۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔

میں نے اس کی مجبوری سمجھتے ہوئے آزردہ لہجے میں کہا۔ "نہیں نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ تم کتنی مجبور تھیں۔ تم حالات کی غلام ہو لیکن تمھاری جدائی نے مجھ پر کیا ستم توڑے، کیا ظلم ڈھائے، یہ داستان بہت دردناک اور طویل ہے۔"

"مجھے معلوم ہے جمیل! مجھے مت بتاؤ۔" انکا نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "کاش دوسروں کے سر پر جانے کے بعد میرے بس میں کچھ ہوتا۔"

"کتنے بڑے انقلابات آئے ہیں میری زندگی میں۔ مالا رانی کی موت نے تو میری کمر توڑ دی ہے۔ وہ معصوم لڑکی خواہ مخواہ قربان ہو گئی اس کا خون میری گردن پر ہے۔ آخر یہ ظالم بدری نرائن میرے گھر کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔" میں نے کرب سے کہا۔

"بدری نرائن نے نرگس کو اس لیے ختم کیا تھا کہ تم نے وعدے کے مطابق مجھے اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا اور مالا رانی کو اس وجہ سے ختم کیا ہے کہ وہ سمجھتا تھا پریتم لال کی شکتی کی امان میں تم اسی وقت تک رہ سکتے ہو جب تک مالا زندہ ہے۔ پریتم لال کی شکتی

کا مضحکہ اڑانے اور اسے خوف زدہ کرنے کا اس سے بہتر اور کون سا موقع مل سکتا تھا مگر جمیل! میرا وعدہ ہے کہ تم بدری نرائن کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ اس کا حشر تمھاری توقعات سے کہیں زیادہ بھیانک ہوگا۔ کچھ دن کی بات اور ہے۔"

انکا کی ہمدردی نے دل کا غبار کسی حد تک دور کر دیا۔ میں نے اس سے اپنے دل کا احوال ایک بچّے کی طرح بیان کیا اور انکا مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ جگدیو کا خیال درست تھا کہ انکا مالارانی کا غم بڑی حد تک دور کر دے گی۔ میں اسٹیشن کے قریب کھڑا دیر تک انکا سے باتیں کرتا رہا۔ ہم دونوں اس طرح ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے عزیز ہوں۔ گفتگو نہ جانے کہاں سے کہاں تک ہوئی۔ جب میں سب کچھ کہہ سن چکا تو انکا نے پوچھا۔ "اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟ اس وقت تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کہاں جاتا۔ لکھنؤ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس شہر نے بڑے دُکھ درد دیے ہیں۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "یہاں کے گلی کوچوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس شہر کو آگ لگا دیتا۔ اب یہاں کے در و بام کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ ہر طرف مالارانی کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ہوائیں قریب سے گزرتی ہیں تو مالارانی کی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مجھے جگدیو مہاراج نے مشورہ دیا ہے کہ میں اس شہر سے دور چلا جاؤں اس ملک سے دور، سمندر پار۔"

"تمھارے دل پر جو گزر رہی ہے اس کا مجھے احساس ہے مگر میں تمھارے پاس آ چکی ہوں۔ تمھاری کنیز انکا، تمھاری غلام انکا، تمھاری محبوبہ انکا۔ میری جان اپنے دل سے تکدّر دور کر دو۔ میری طرف دیکھو۔" انکا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "تمھیں ابھی لکھنؤ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ نہ معلوم کہ پھر کبھی یہاں آنا ہو یا نہ ہو۔ پھر اس شہر رنگ و بو کو تم یاد کیا کرو گے اس وقت تم اپنے گھر میں اپنے عزیزوں کے درمیان رہو گے تو خوش رہو گے۔ گھر سے زیادہ سکون تمھیں کہیں نہیں مل سکتا۔"

"مگر وہاں ہر وقت مالارانی کی یاد آتی ہے۔" میں نے بے تابی سے کہا

"مالارانی جمیل اب ایسی جگہ جا چکی ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ تمھیں اسے بھولنا ہوگا۔ اس کی عمر اتنی ہی تھی۔ تقدیر کا لکھا پورا ہوا۔ تم اسے یاد کر کے اس کی روح کو مضطرب کرو گے۔ چلو گھر چلو۔" انکا نے اصرار کیا۔

"گھر؟ کس کا گھر انکا؟ اب وہاں وحشت برستی ہے۔ میں جتنے دنوں وہاں رہا، کانٹوں پر لوٹتا رہا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"تم نہیں مانتے تو نہ مانو۔ لیکن جمیل اس شہر نامراد کو اس طرح چھوڑ کر نہ جاؤ، تم اپنے وعدے بھی بھول گئے؟ تم اپنے اگلے پچھلے حساب بے باق کرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہو تو تم کہیں بھی سکون سے رہ سکو گے۔ جب تمھیں یہاں کے لوگ اور ان کے ستم یاد آئیں گے تو تمھارا کیا حال ہوگا۔ یہاں کے زخم تمھارے ساتھ رہے تو تم پھر بے چینی محسوس کرو گے۔"

میں انکا کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کا جائزہ لے رہا تھا اُس کی سُرخ آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ اس وقت شدید غصّے اور رنج کی کیفیت سے دوچار ہے۔ میں اتنا مُرجھایا ہوا تھا کہ اس کی باتوں کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔ وضاحت کی خاطر دریافت کیا۔ "تمھارے کیا ارادے ہیں؟ کُھل کر بات کرو۔"

"جمیل! میرے ارادے تمھارے ارادوں کے تابع ہیں، لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ اس بار تم بالکل ٹوٹ چکے ہو۔ مالارانی کی اچانک موت کے صدمے نے تمھارے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ تمھاری توانائی شوخی اور شرارت۔ سب کچھ رخصت ہو گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس طرح اُداس نہ رہو۔ تم اشرفی بیگم جیسی بدکردار عورت کو کس پر چھوڑے جا رہے ہو؟ تم نواب ببّن علی کو کس طرح بھول گئے؟ تم نے اس کے سامنے کچھ وعدے کیے تھے۔ ببّن علی کے شب و روز وہی ہیں۔ وہ اب بھی اپنی حویلی میں حسن و نشاط کا بازار گرم کیے ہوئے ہے۔ کیا تم لکھنؤ سے یوں ہی چلے جاؤ گے؟ اپنے ان دشمنوں کو کُھلی چھٹی دے کر۔ ناظم علی بھی اسی شہر میں موجود ہے۔ یاد ہے تمھیں اُس نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ یہاں لکھنؤ میں تمھارے چچا اور بھائی بہن بھی رہتے ہیں۔ تم انھیں کس کے پاس چھوڑ کر جا رہے ہو؟ یہاں سے جانا ہی ہے، تو دل ٹھنڈا کر کے جاؤ۔ ببّن علی کا سرخ و سپید چہرہ دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔" انکا نے سفّاکی سے کہا۔

"انکا! میں ان سب کا خون پینے کے لیے تڑپتا ہوں، لیکن پھر سوچتا ہوں کہ ان باتوں سے کیا حاصل ہوگا؟ میرا سب سے بڑا دشمن بدری نرائن زندہ ہے۔ اب میں تھک چکا ہوں۔ مجھے سکون چاہیے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"یہ بات میں تمھارے سکون ہی کے لیے کہہ رہی ہوں۔ سب کا حساب

سب رنگ

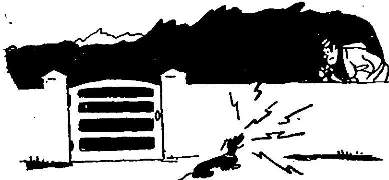
صاف کرتے جاؤ۔ یہ قرض اتار دوگے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اپنے آپ کو ہنگاموں کا عادی بناؤ۔ زندگی اس طرح نہیں گزرتی جس طرح تم سوچ رہے ہو۔ میری مانو تو گھر چلو — وہاں بہت سے لوگ تمھارے منتظر ہیں۔"

انکا نے کچھ اس انداز سے میری غیرت کو جھنجوڑا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میں گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہوں۔ ماضی کی تلخ یادوں کے زخم پر انکا کی باتوں کا نشتر اتنا کاری ثابت ہوا کہ میرا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ مالا کے مرنے کے بعد ایک بے مقصدیت سی طاری ہو گئی تھی۔ انکا نے انتقام کا شعلہ بھڑکا کر میرے سرد جذبات میں گرمی پیدا کر دی۔ میرے سینے میں جلن سی ہونے لگی۔ وہ مجھے پرانی باتیں یاد دلا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا۔ جمیل احمد خاں! زندگی کا کیا بھروسا، کل بہت بے اعتبار چیز ہے۔ جو آج ہے وہ کل نہیں۔ — جو کل ہوگا ضروری نہیں کہ اس کا تعلق آج سے ہو۔ اب انکا موجود ہے اس لیے ان لوگوں کو ٹھکانے لگاتے چلو جنھوں نے کبھی تمھارا جینا حرام کر دیا تھا۔ جنھوں نے تمھاری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اصولاً مجھے جگدیو کے مشورے کے مطابق یہاں سے چلا جانا چاہیے تھا لیکن کچھ دنوں کے قیام کے بعد بھی کہیں جایا جا سکتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بیرونِ ملک روانگی سے پہلے تزئین اور کلدیپ سے مل لوں۔ میرے پاس جو کچھ سرمایہ تھا وہ کب تک رہتا؟ ختم ہو چکا تھا۔ چچا جان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ کلدیپ — کی کٹیا پر زر و دولت کی حیثیت بے معنی تھی۔ لیکن انکا کی آمد کے بعد سارے مسئلے خود بخود حل ہو گئے تھے۔ انکا سونے کی کوئی کان نہیں جس میں ہاتھ ڈال کر جتنا چاہیں سونا نکال لیں۔

روپے حاصل کرنے کے لیے انکا کو فعّال ہونا پڑتا تھا۔ میں نے ایک فیصلہ کیا اور جذبات انگیز لہجے میں انکا سے بولا۔ "انکا! تمھارا خیال صحیح ہے کہ مجھے یہاں سے اس طرح نہیں جانا چاہیے۔ اب تم نے اس آگ کو ہوا دی ہے تو پھر یہ قصّے نمٹا کر ہی کہیں چلیں گے۔"

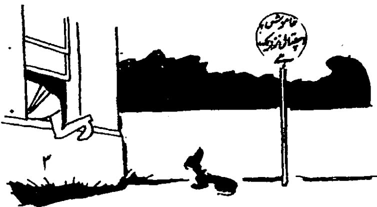
"مجھے یقین تھا جمیل! تم میری بات رد نہیں کرو گے۔" انکا میرا جواب پاکر خوشی سے بولی۔ "میرے علاوہ جگدیو کا آشیرواد بھی تمھارے ساتھ ہے۔ جہاں جہاں تمھارے قدم پڑیں گے وہاں کی زمین خوف و دہشت سے تھرا جائے گی۔"

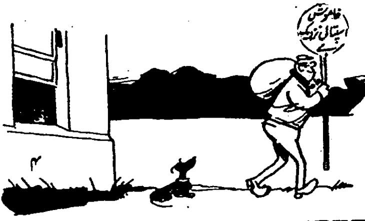
"جگدیو مہاراج نے بڑا کرم کیا جو تمھیں حاصل کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں اس کا یہ احسان تا زندگی نہیں بھول سکتا۔ البتہ اس بات سے جی ڈرتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے روٹھ کر ......"











"اب ایسا ناممکن ہے میرے آقا!" انکا نے میرا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ "جگدیو کی شکتی کا کیا ٹھکانا۔ اس نے جاپ کر کے مجھے پنڈت بدری نرائن سے حاصل کیا اور پھر تمھیں دان کر دیا۔ ایک بات یاد رکھو کہ میرا ماہر منترالا پجاری جاپ کرنے سے پہلے یہ اطمینان ضرور حاصل کر لیتا ہے کہ میں کس شکتی کے پاس ہوں، اگر وہ شکتی اس سے بڑھ کر ہے تو وہ ایسی حماقت نہیں کرتا۔ تربینی داس کوئی بڑا پنڈت نہیں تھا اس نے جب مجھے تمھارے پاس دیکھا تو آسانی سے جاپ شروع کر دیا اور مجھے حاصل کر لیا۔ بدری نرائن نے بھی یہی کیا۔ بدری نرائن سے سادھو جگدیو یا اس کے برابر کی کوئی شکتی ہی مجھے حاصل کر سکتی تھی اب سادھو جگدیو نے مجھے حاصل کر لیا ہے تو یہ بات آسان نہیں رہی، اس سے بڑی یا کم سے کم اس کے برابر کی شکتی ہی میرے بارے میں سوچ سکتی ہے اور اسے میرے حصول کی کیا ضرورت پڑی ہے اس لیے کہ اس کے پاس خود اپنی شکتی کیا کم ہوتی ہے۔ سمجھے!"

"سمجھا" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "لیکن انکا اب آرام سے گزر بسر ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ تقدیر کی ان گردشوں کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے ــــ کسی جگہ جا کر تو ہمیں ٹھیرنا پڑے گا؟ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟"

"اطمینان رکھو۔ میں اب تمھارے ساتھ ہوں، تمھارے لیے یہی احساس کافی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں۔

نہ تمھیں میرے بغیر چین آتا ہے نہ مجھے تمھارے بغیر، تمھاری ذات میری عدم موجودگی میں ادھوری ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میری تخلیق تمھاری وجہ سے ہوئی تھی۔"

"انکا کی باتیں اتنی جاں افزا اور پُراسرار تھیں کہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں گھر کی طرف واپس چل پڑا اس ارادے میں بھی انکا کے مشورے کو دخل تھا ورنہ میں اسی لمحے نواب تبن علی کی حویلی کا رُخ کرتا۔ میرے چچا اور بھائی، بہن میری واپسی پر بے حد خوش ہوئے اور اسی لمحے آؤ بھگت میں مصروف ہو گئے جیسے میں بہت دنوں بعد آیا ہوں۔ میں نے پھر اپنے لیے وہی کمرہ منتخب کیا جس میں مالا اور میں نے اپنی زندگی کے سب سے دلکش دن گزارے تھے۔ در و دیوار میں مالا کے جسم کی مہک اور اس کے قہقہے رچے بسے تھے۔ میں نے الماری کھولی اور اس کے کپڑوں پر نظر ڈالی تو بے اختیار دل بھر آیا اور میں ہچکیوں میں رونے لگا۔ اس کے کپڑے سونگھے تو میری حالت غیر ہو گئی۔ انکا مجھے تسلی اور دلاسے دیتی رہی۔ جب میری حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تو رخسانہ اور دوسرے بھائی، بہن کمرے میں آ گئے۔ انھوں نے مجھے سنبھالا دیا۔ سارا دن اسی اُداسی میں گزر گیا، رات آ گئی، مالا کی یاد دل سے نہ گئی۔ انکا نے بہت باتوں میں لگایا۔ جھجکتے جھجکتے بازارِ حُسن چلنے کی ترغیب دی۔ مجھے اپنا ہوش کہاں تھا؟ جب میں نے انکا سے دریافت کیا کہ بدری نرائن نے میری امنگیں کس طرح روندی تھیں تو انکا ٹال گئی۔ میرا اصرار حد سے بڑھا تو اس نے مجھے اُداس لہجے میں بتایا۔ "جمیل شاید میں نے تمھیں یہاں لا کر غلطی کی ہے۔ تم اتنی آسانی سے مالا کو نہیں بھول سکتے۔ مجھ سے مت پوچھو کہ بدری نرائن نے کس طرح تمھاری خوشیوں کا گلا گھونٹا تھا۔ اب یہ ذکر چھوڑ دو۔"

"نہیں مجھے بتاؤ انکا! کیا تم اس میں شریک تھیں؟" میں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"میں اس وقت محض مجبور و بے بس تھی میرے آقا! بدری نرائن کسی چالاک چیتے کی طرح مالا رانی کی گھات میں لگا بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنی شکتی کے زور سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ کچھ پُراسرار قوتوں نے مالا رانی کے گرد حفاظتی جال بُن دیا ہے جسے توڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا۔ جس روز مالا کو اس نے ظلم کا نشانہ بنایا، اس روز وہ صبح ہی سے بے چین تھا۔ وہ بار بار منتر پڑھتا اور پراسرار طاقتوں کو آواز دیتا تھا۔ پھر اُس کے بیروں نے اُسے ایک لمحے یہ اطلاع دی کہ مالا رانی کے گرد وہ پُراسرار دھند چھٹ چکی ہے۔ اس نے فوراً اپنی کالی طاقتوں کی مدد سے ایسا بھرپور وار کیا کہ تمھاری خوشیوں کا چراغ پل بھر میں بُجھ گیا۔"

انکا کی زبانی ان حالات کی تفصیل سن کر میرا دل تڑپ اُٹھا، آنکھوں سے ساون بھادوں کی ــــ جھڑی لگ گئی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس عالم میں، میں نے انکا کو مخاطب کیا۔ "انکا! مجھے اندازہ ہے کہ تمھاری حیثیت کیا تھی لیکن کیا مالا کو اپنے جور و ستم کا نشانہ بناتے وقت تمھارے دل کو دھچکا نہیں لگا؟"

"جمیل!" انکا بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ کمینہ پنڈت بڑا چالاک اور عیار واقع ہوا ہے۔ مالا رانی کے سلسلے میں اس نے میرے بجائے اپنے بیروں کی شکتی سے کام لیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ

شاید میں اس کے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں۔ حالانکہ یہ اس کا وہم تھا، وہ مجھے جو حکم بھی دیتا، میرے لیے اس سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

"یعنی تم مالا کو مار ڈالتیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مجھے ایسا کرنا پڑتا۔" انکا نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"اُف۔ تم اپنے محبوب کی امانت ختم کر دیتیں؟" میں نے رُندھی آواز میں کہا۔

"میں اور کیا کرتی؟ مگر اب ان باتوں سے کیا حاصل؟ جمیل! میری خاطر صبر کرو۔" انکا نے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔



ممکن ہے میری سرگزشت کے یہ حصے مضبوط اعصاب کے لوگوں کو گراں گزریں لیکن جنھوں نے مصیبتیں جھیلی ہیں اور دکھ درد اٹھائے ہیں، انھیں میرے کرب کا احساس ہوگا، میرا کرب، میری ذات کا درد، میری گردشیں، میرے گناہ اور میرے مصائب ایسے نہیں ہیں کہ عام انسان ان کا تصور کر سکیں۔ ایک کے بعد ایک حادثہ، پے بعد دیگرے امتحان اور آزمائش کا سلسلہ، عجیب و غریب واقعات ــــــ انسان کے اندر شکست اور ریخت کے یہ مرحلے۔ اہلِ دل انھیں محسوس کریں گے۔ حادثات نے جنھیں گھیرے رکھا ہے، ان کا دل اس میں دھڑکتا ہوگا۔ میں انکا کے مشورے پر دوبارہ اپنے چچا جان کے گھر چلا آیا۔ وہاں پہنچ کر میں سکون کا ایک پل بھی نہیں گزار سکا۔ دن بھر خالی خالی سا اپنی بہنوں کے درمیان رہتا۔ انکا نے لاکھ اصرار کیا کہ میں باہر نکلوں لیکن مالا رانی کے چالیسویں کے بعد ہی میں نے کہیں باہر جانے کے لیے سوچا اس عرصے میں انکا بھی مضمحل سی رہی۔ بار بار مجھے سمجھاتی رہی، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میرے پاس روپے کی کمی تھی۔ جب تک گھر میں رہا، خاموش پڑا رہا۔ چچا جان کا کاروبار خاصا چل رہا تھا۔ چالیسویں کے بعد میں باہر نکلا، میں یہ قصہ مختصر کر رہا ہوں۔ انکا نے دو تین ہی دن میں میرے لیے ایسے ایسے اسباب پیدا کر دیے کہ روپے کی کمی نہ رہی۔ انکا کے لیے کوئی بات مشکل نہ تھی۔ وہ مجھے آسودہ رکھنے کے لیے ایسے علاقوں میں لے گئی جہاں روپے کا الٹ پھیر ہوتا تھا۔ میں ہر بازی جیت گیا۔ جب میں رات کو لدا پھندا گھر واپس آتا تو مجھے روپے گننے میں زحمت ہوتی تھی۔ میں انھیں بے نیازی سے الماری میں ڈال دیتا۔ کسی بھی قمار خانے میں انکا میرے سر سے اُتر جاتی اور میں بازیاں لگاتا۔ لوگ مجھے رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھتے اور میں مسکراتا ہوا وہاں سے چلا آتا۔ اتنے حادثات کے بعد مجھے اپنے چہرے پر درشتی محسوس ہوتی تھی۔ میں بہت چڑچڑا اور بدمزاج ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اُلجھ پڑتا۔ نرمی اور حلاوت مجھے متاثر نہیں کرتی تھی۔ سارے انسان

ایک لڑکا سیب کے درخت پر چڑھا نہایت اطمینان اور آزادی سے سیب توڑنے میں مصروف تھا۔ اتنے میں باغ کا مالی آ گیا۔ مالی نے آواز دی اور ڈانٹ کر کہا۔ "فوراً نیچے اُتر آؤ، ورنہ میں بلاتا ہوں تمھارے باپ کو!"

لڑکا بدستور سیب توڑتا رہا اور مالی کو جواب دیا "میرے باپ کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ بھی یہیں موجود ہیں اور برابر والے درخت سے سیب توڑنے میں مصروف ہیں!"

مجھے ایک جیسے نظر آتے تھے۔ ظالم، بے رحم اور درندے، صرف گھر کے لوگ اچھے لگتے تھے اور ان سے اکثر رسمی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ روپے کی اتنی افراط کے بعد میں نے ایک ہفتے کے اندر اندر چچا جان کا مکان بیچ کر ان کے لیے ایک خوبصورت علاقے میں جدید طرز کی ایک کوٹھی خرید دی۔ گھر پر چند ملازم بھی رکھے۔ مالی، باورچی، دربان، چھوٹے موٹے کام کرنے والے دو لڑکے، ایک نوکرانی ـــــ نوکرانی کا ذکر بطورِ خاص کروں گا کہ اس کے ہاں صرف اچھے لباس کی کمی تھی۔ ناک نقشے میں خوب، عادات و اطوار میں یکتا اور زبان کی بڑی شیریں تھی۔ نام نفیس تھا۔ اسم بامسمّیٰ تھی۔ میں اس ہفتے بہت مصروف رہا نئے مکان کی خرید ـــــ، فرنیچر کی ترتیب، ملازمین کا تقرر، ایک ہفتے بعد کوٹھی کا رنگ بدل گیا۔ بہنوں کا مسرت سے بُرا حال تھا۔ چچا جان خوشی سے پھُولے نہ سماتے تھے اور حیرت سے یہ انقلاب دیکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے چچا جان کو ایک خاصی معقول رقم کاروبار میں اضافے کے لیے دے دی تاکہ وہ اس بڑی کوٹھی کا بار پوری طرح اُٹھا سکیں۔ ان کاموں کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد کہ میری زندگی کا کیا بھروسا، میرے بعد یہ لوگ خوش رہیں اور پھلیں پھولیں، میں نے ایک صبح نبن علی کی حویلی کی طرف جانے کا ارادہ کیا لیکن انکا نے یہ مشورہ دیا کہ مجھے اپنے انتقام کی ابتدا ناظم علی سے کرنی چاہیے، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ پہلے ناظم علی کو بھگتا یا جائے یا نبن علی کو۔ انکا ایک منصوبے کے تحت ایسا سوچ رہی تھی۔ گھر والوں کے اصرار پر میں نے تھوڑا سا ناشتہ کیا اور کپڑے تبدیل کر کے مکان سے باہر آ گیا۔

جس وقت میں ناظم علی کے دفتر پہنچا، اس وقت وہ کسی فائل کے مطالعے میں غرق تھا۔ اس کے دفتر کے سنتری نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن انکا نے اُسے بے بس کر دیا۔ میں کسی مزاحمت کے بغیر اندر چلا گیا۔ ناظم علی خواب میں بھی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ میں اس انداز میں سینہ تانے اس کے سامنے پہنچ سکوں گا۔ چنانچہ خلافِ توقع مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ مجھے نفرت بھری نظروں سے سرتاپا گھور کر رعونت سے بولا "تم یہاں کس لیے آئے ہو؟"

"ناظم علی! مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے جلد شناخت کر لیا، مجھے اپنا تعارف کرانے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔" میں زہرخند سے بولا۔

ناظم علی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی، کرخت آواز میں بولا "تمھیں میرے کمرے میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ دفع ہو جاؤ۔ گٹ آؤٹ۔"

"وقت وقت کا کھیل ہے ناظم علی! وہ وقت گزر گیا۔ اب تمھاری گردش کا وقت ہے۔ میں تمھارے لیے قہر بن کر آیا ہوں۔ میں نے معاف کرنا نہیں سیکھا ہے۔ تمھاری بدقسمتی سے میری یادداشت بہت تیز ہے" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تم نے میرے آنے کا مقصد پوچھا ہے، سنو، تم نے اپنی طاقت اور عہدے کے نشے میں میری عزت و ناموس پر نگاہ اٹھائی تھی۔ میں قید و بند کی مشقتیں جھیل کر اب پھر تمھارے روبرو ہوں۔ اس زعم میں نہ رہنا کہ تم اُس وقت مجھ پر حاوی ہو گئے تھے، تم نے مجھے بے بس دیکھ کر ظلم و ستم توڑے تھے۔ میں لکھنؤ سے جا رہا تھا مگر پھر خیال آیا کہ اگر تمھارا حساب بے باق کیے بغیر لکھنؤ سے چلا جاؤں گا تو تمھیں شکایت ہوگی۔"

ناظم علی نے میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر خطرے کی اہمیت کا اندازہ لگا لیا۔ ایک پل کے لیے اس نے مجھے گھورا پھر بڑی پھرتی سے اپنا سروس ریوالور نکال کر میرے سینے کا نشانہ لے کر بولا "تم نے اچھا کیا کہ خود ہی میرے پاس آ گئے۔ تمھیں تلاش کرنے کی زحمت مجھے نہیں اٹھانا پڑی۔ میرا خیال تھا تمھیں جیل کی آب و ہوا راس آ گئی ہے۔ یوں بھی تم جیسے خطرناک مجرموں اور شورہ پشت غنڈوں کو باہر کھلی ہوا میں زیادہ دن نہیں رہنا چاہیے۔"

میرے چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی۔ انکا اسی لمحے تیزی سے رینگ کر میرے سر سے اتر گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اب ناظم علی کا بُرا وقت

آگیا ہے۔ میں ناظم علی کے اور قریب گیا اور زور سے اس کے ہاتھ پر اپنا واحد ہاتھ مارا، ریوالور اُچھل کر دور جا گرا۔ ناظم علی کو کونے میں پڑا ہوا ریوالور اُٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ میرے بُلا دے پر دوسرے ہی لمحے انکا میرے سر پر آگئی۔ میں نے اسے دل ہی دل میں سمجھایا کہ میں کچھ دیر کے لیے خود ہی ناظم علی سے زور آزمائی کرنا چاہتا ہوں انکا جز بز ہو کر خاموش ہو گئی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک زنّاٹے دار تھپّڑ ناظم علی کے گال پر رسید کر دیا۔ ناظم علی کو اس اچانک حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چلانے سے پہلے میں نے ایک اور زور دار طمانچہ رسید کیا جس سے خون کی ایک باریک لکیر اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی "کرسی پر بیٹھ جاؤ ناظم علی! زیادہ تیزی دکھانے کی کوشش مت کرو۔" میں نے رعونت سے کہا: "تمھارا بُرا وقت آچکا ہے۔"

ناظم علی فوراً کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا منہ رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی میں بھی اس کے سامنے والی کرسی پر دراز ہو گیا۔ میں نے اپنے لہجے کی کاٹ قائم رکھی۔ "ناظم علی! ایک بار تم نے مجھ پر ظلم کی انتہا کر دی تھی۔ مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا تھا مگر میں اتنا ظالم نہیں ہوں۔ میں تمھیں وقت دیتا ہوں، اگر تم اپنے عزیز و اقارب کے لیے کوئی آخری پیغام دینا چاہو تو دے سکتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارا پیغام مطلوبہ شخص کو پہنچا دیا جائے گا۔ مگر جلدی کرو۔ مجھے لکھنؤ سے جلدی جانا ہے۔ ابھی مجھے تمھاری والدہ اشرفی بیگم اور تمھارے باپ تبن علی سے بھی ملنا ہے۔"

ناظم علی جو چند لمحے پہلے بڑا خونخوار نظر آ رہا تھا، اچانک ٹھنڈا پڑ گیا اس کی آنکھوں سے خوف و دہشت کے آثار جھلک رہے تھے۔ اُس کے چہرے کی رنگت پل بھر میں ہلدی کے مانند زرد پڑ گئی۔ اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور گھگیاتی ہوئی لرزدہ آواز میں بولا۔

"خاں صاحب! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تم پر ظلم کیا ہے لیکن خدا گواہ ہے اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اوپر سے مجھے احکام ہی ایسے ملے تھے۔"

"اوپر کے احکام؟ فضول باتوں سے پرہیز کرو ناظم علی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم اپنی آخری خواہش کا اظہار کرو۔" میں نے حقارت سے جواب دیا۔ ناظم علی کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس کے چہرے پر موت کے سائے لرزنے لگے اس نے ایک نظر ریوالور کی طرف دیکھا اُسے اُٹھانے کی اس میں جرأت نہیں تھی، اس نے دروازے کی طرف نگاہ ڈالی تو میں نے ہنس کر کہا: "اب کوئی تمھارے کام نہیں آسکتا۔"

"مجھے معاف کر دو خاں صاحب!" اچانک وہ گڑگڑانے لگا۔ "میں تمھارا گناہ گار ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔"

"رحم اور آپ پر ناظم علی صاحب! آپ جیسے بڑے عہدے دار پر؟" میں نے نفرت سے کہا: "وہ عیاری کے دن یاد ہیں؟ وہ ظلم یاد ہیں جو تم نے مظلوم اور معصوم لوگوں کے ساتھ روا رکھے تھے؟"

ناظم علی کے چہرے کا رنگ ہر لمحے بدل رہا تھا۔ میں اس کی حالت سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اس وقت میرے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے اس ظالم و جابر شخص کی رحم طلب نظروں کا پیغام سختی سے ٹھکرا دیا۔ ایک اٹل ارادے سے اٹھا اور فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"میں جا رہا ہوں ناظم علی! زیادہ باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ میرا دوسرا حکم تمھیں میرے جانے کے بعد ملے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری خودکشی کے گواہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں۔ حالات نے مجھے محتاط رہنے کا درس دیا ہے۔"

میں اتنا کہہ کر تیزی سے نکل گیا۔ مجھے قوی امید تھی کہ انکا کے پراسرار وجود نے میرے دل میں اُبھرنے والا ارادہ سمجھ لیا ہو گا۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا، انکا میرے سر سے اُتر گئی تھی۔ میں تھانے سے نکل کر سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا اور ہجوم میں گم ہو گیا! ابھی مجھے وہاں کھڑے ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ میں نے ناظم علی کو تھانے کی عمارت سے پریشان، گریباں چاک، حواس باختہ باہر نکلتے دیکھا

ایک شخص نہایت پابندی سے پانچوں وقت کی نماز کے لیے مسجد میں حاضری دیا کرتا تھا۔ لوگ اُس کے تقوے سے بہت متاثر تھے۔ ایک صاحب نے جب اس شخص کو نہایت انہماک سے ــــ نماز ادا کرتے دیکھا تو اپنے کسی ساتھی سے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "یہ شخص جو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہا ہے، نہایت متقی اور پرہیزگار ہے۔"

وہ شخص نماز توڑ کر کہنے لگا: "اور جناب حاجی بھی ہوں۔"

سروس ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے پیچھے دو پولیس والے بھی تھے، جو غالباً اس کی مجنونانہ حالت سمجھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے آگئے تھے۔ سڑک پر ناظم علی نے حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنا چلّانا شروع کر دیا وہ اپنے جرائم کا اعتراف اپنے اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کے سامنے کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"لوگو۔ میں خود کو ختم کر رہا ہوں۔ میں نے متعدد بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ میں ایک مجرم ہوں۔ میرا نامۂ اعمال سیاہ ہے۔ لاوارث بچوں کی کراہوں، معصوم لڑکیوں کی آہوں اور بے سہارا عورتوں کی فریادوں نے آج مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ میں تمھارے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے اپنے لیے سزا تجویز کر لی ہے میں نے اپنے لیے سزا تجویز کر لی ہے۔ میں نے اپنے لیے سزا تجویز کر لی ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ دیکھو — یارو میں مر رہا ہوں۔ تم گواہ رہنا دوستو! میں اپنے ضمیر کا فیصلہ تسلیم کرتا ہوں۔"

راہ گیروں کی اچھی خاصی تعداد ہکا بکا کھڑی سراسیمہ نظروں سے ناظم علی کو گھور رہی تھی۔ دونوں پولیس والے بھی دم بخود کھڑے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی حالات کا اندازہ کر سکتا، ناظم علی نے ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھی اور لبلبی دبا دی۔ فضا میں ایک دھماکے کی آواز گونجی اور ناظم علی خون میں لت پت ہو کر سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی لاش تڑپتی رہی۔ ناظم کیفرِ کردار کو پہنچ گیا تھا۔ مجھے اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہوا بلکہ ایک سکون سا محسوس ہوا۔ مجھے بے حس کہہ کر یاد کرنے والے حضرات سے صرف اتنی گزارش ہے کہ میں نے اپنے واقعات بے کم و کاست بیان کر دیے ہیں۔ میرا خیال ہے شدید ظلم و تشدّد سہنے کے بعد ایک ایسی منزل بھی آتی ہے جب انسان اتنا بے حس ہو جاتا ہے۔ چند لمحوں میں انسکا میرے سر پر آگئی۔ "مجھے خوشی ہے جمیل کہ تم نے اس بار دُوراندیشی سے کام لیا۔" انسکا نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر تم تھانے کے اندر کوئی جذباتی قدم اٹھاتے تو حالات مختلف ہوتے۔ اب ناظم علی کے سلسلے میں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر انسکا کو دیکھا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ اب میرا رُخ نواب ہبّن علی کی حویلی کی طرف تھا۔ راستے میں، میں نے انسکا سے کہا۔ "انسکا! ناظم علی کی موت سے کچھ لُطف نہیں آیا۔"

"کیا مطلب؟" انسکا نے دیدے پھاڑ کر کہا "پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں جو چاہتا تھا وہی ہوا لیکن موت ہی تو انتقام نہیں ہے یہ تو بہت آسان اور ہلکا سا نسخہ ہے۔ لمحوں میں اذیت ختم ہو جاتی ہے۔ موت تو آدمی کی اُس وقت ہوتی ہے جب وہ خود اپنی نظروں سے گر جائے، جب اس سماج میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ رہے، وہ اپنی زندگی میں رسوائیوں کا مزہ چکھے۔ میرا خیال ہے ناظم علی کو ہم نے سستا چھوڑ دیا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"تم بہت دلچسپ باتیں کر رہے ہو۔ چلو تمھیں بولنا تو آیا۔ اسی لیے میں کہتی تھی کہ گھر سے نکل کر دیکھو۔ بہر حال ہبّن علی کے سلسلے میں اس کا خیال رکھا جائے گا۔" انسکا نے چہک کر کہا۔

ہم نے راستے میں ہبّن علی سے اس وقت مڈبھیڑ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دن دہاڑے ہبّن علی کے گھر پر جانا مناسب نہیں تھا۔ یہ کام رات ہی میں ہو سکتا تھا۔ رات تک کا وقفہ گزارنا مشکل ہو گیا' سر پر خون سوار تھا۔ جیسے تیسے رات آئی اور میں ہبن علی کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہبّن علی، اس مردود نے رُخسانہ کو اغوا کرایا تھا۔ اشرفی بیگم سے ساز باز کر کے مجھے مروانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اس کی بہنوں درخشاں اور زرافشاں کو کوٹھے کی زینت بنا کر اپنی بہن کا انتقام لوں گا مگر اس کے بعد مجھے اتنی فرصت نہیں مل سکی تھی کہ انتقام لے سکتا۔ البتہ ہبّن علی کی موت کا سامان میں نے پیدا کر لیا تھا۔ اُس نے زمرّد کے قتل کا اقبالِ جرم بھی کر لیا تھا مگر پھر حالات میرے قابو میں نہ رہے۔ وہ نواب کا بچہ اپنے اثر و رسوخ سے قتل جیسے سنگین الزام سے بچ گیا اور آج پھر لکھنؤ کی طرب گاہوں میں اس کا چرچا ہے۔ جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا، میں ہبّن علی سے اتنا ہی متنفر ہوتا جا رہا تھا۔ ہبّن علی کی حویلی قریب آتی گئی اور میری رفتار تیز ہوتی گئی۔ میری نفرت کا جذبہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بار پہلے بھی میں ایک خفیہ راستے سے اس کی خوابگاہ تک پہنچ گیا تھا۔ حویلی روشن تھی اور مجھے انسکا نے بتا دیا تھا کہ ہبن علی اندر مستِ مئے ناب ہے اور عیش و نشاط میں مصروف ہے اسی طرح ہر روز اس کے ہاں یا کسی اور نواب کے ہاں بزمِ طرب سجتی تھی یا پھر نواب کسی طوائف کے ہاں شب گزارتے تھے۔ سرِ شام نوابوں کے دل

ڈولنے لگتے تھے اور نازنینیں گھنگھرو باندھے انھیں دادِ عیش دیتی رہتی تھیں۔ میں نے پرانا راستہ اختیار کیا۔ بتن علی کے ایوانِ خاص تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں دیر کر کے اس لیے آیا تھا کہ سازندوں اور مہمانوں کی موجودگی کا امکان نہ رہے اور میں بتن علی سے اس کی خواب گاہ ہی میں ملاقات کروں، میرے ذہن میں گزرے ہوئے لمحات ابھر رہے تھے۔ اندر اندر سلگنے والی چنگاریاں جذبات مشتعل کر رہی تھیں۔ خوابگاہ کا دروازہ بند تھا لیکن وہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ راستے میں ایک خاص ملازم نے مجھے دیکھ کر شور مچانا شروع کیا لیکن اسکا نے بر وقت میرے سر سے اتر کر اُسے دوسری جانب روانہ کر دیا۔ میں جب اس روشن کمرے میں داخل ہوا تو بتن علی کی آغوش میں ایک بجلی تڑپ رہی تھی اور ناز و ادا کے نشتر آزما رہی تھی، بتن علی کا بھاری بھر کم تن و توش اس گل بدن کے غمزوں سے اِدھر اُدھر تھرک رہا تھا۔ سامنے صراحی رکھی تھی، وہ مدہوش سا تھا۔ نیم عریاں لڑکی کا آدھا بدن بتن علی کی گود میں سما سما جاتا اور نکل نکل جاتا۔ ان دونوں میں دلچسپ نوک جھونک جاری تھی۔ میں اسے بیان نہیں کر رہا، بس وہی نوک جھونک جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہے۔ بتن علی کو اس طرح مدہوش دیکھ کر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اسے للکارا تو وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ بتن علی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ کسی زہریلے ناگ کی طرح بل کھا کر اٹھ کھڑا ہوا اور کرخت لہجے میں بولا "تم ۔۔۔ تم جمیل احمد خاں! تم ابھی تک یہاں موجود ہو؟"

"ہاں نواب صاحب! جمیل احمد خاں۔ آپ کا خادم ابھی تک یہیں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔" میں نے نیاز مندی سے کہا "طبع شاہانہ پر میری آمد گراں تو نہیں گزری؟"

"بدبخت ۔۔۔ اب یہاں کیا لینے آیا ہے؟" نواب نے تمکنت سے کہا۔

"ناراض نہ ہوں نواب صاحب قبلہ! میں مبارکباد دینے کی غرض سے آیا ہوں کہ آپ زمرد کے قتل کے الزام سے صاف بری ہو گئے بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ آپ کا اقبال بلند رہے۔" میں نے عجز سے کہا۔ "یہ لڑکی یقیناً زمرد سے زیادہ حسین اور جاندار ہے۔ میں آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیتا ہوں۔"

"جمیل احمد خاں ۔۔۔ تم جس راستے سے آئے ہو اسی سے واپس چلے جاؤ۔" نواب کے لہجے میں خوف کا عنصر شامل تھا "تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔"

"ورنہ پھر نواب صاحب کیا سزا تجویز کریں گے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا

"پھر ۔ پھر ۔ ہم تو تم جیسے حرام زادوں کو کتے کے آگے ڈال دیتے ہیں۔" نواب نے اس لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا جو سہمی ہوئی کھڑی تھی

"میں بھی اس وقت اسی مقصد سے یہاں آیا ہوں۔" میں نے بہت نرمی سے کہا۔

"میں کہتا ہوں یہاں سے نکل جاؤ۔" نواب کا سانس اکھڑ گیا تھا۔

"تم مجھے جانتے ہو۔ پھر ایسے لہجے میں کیوں باتیں کر رہے ہو؟" میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا "تم نے زمرد کو میرے سامنے قتل کیا اور پھر تھانے میں اقبالِ جرم بھی کیا۔ تمھاری زندگی کے دن باقی تھے، اس لیے تم یہاں نظر آ رہے ہو۔"

"تم کوئی جادوگر ہو۔ یا بہت بڑے حرام زادے۔ زمرد کا قتل تم نے مجھ سے کرایا تھا۔ تم نے مجھے اتنا پاگل کر دیا تھا کہ میں تھانے میں اول فول بکنے لگا۔ اشرفی بیگم کے ہاں بھی تم نے اپنے شعبدے دکھائے تھے، تزئین کو تمھی نے غائب کرا دیا تھا۔" نواب کی وضاحت میں خوف بری طرح شامل تھا۔

"تم نے مجھے پہچاننے میں کسی قدر ہوش مندی کا ثبوت دیا ہے نواب! مگر میں اس وقت اپنی تعریف سننے نہیں آیا ہوں۔ نہ میں تمھیں مارنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ اشرفی بیگم کے بالا خانے کی رونقیں تزئین کی گمشدگی کے بعد سے ماند پڑ گئی ہیں۔ تم اگر چاہو تو درخشاں، ذرافشاں اشرفی بیگم کی بگڑی ہوئی ساکھ بحال کر سکتی ہیں۔ تم نے جب میری بہن کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہا تھا، اسی وقت سے میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ ایسا کیا جائے تو کتنا دلچسپ رہے گا کہ ایک بڑے نواب کی ناموس کے پیروں میں گھنگھرو بندھیں۔ نواب بتن علی! یہ لڑکیاں جو تمھارے نشاط کدے میں آتی ہیں، یہ بھی کسی نہ کسی بھائی کی بہنیں ہوتی ہیں؟ پھر بھلا تمھیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"جمیل احمد خاں! ہم تیرا خون پی جائیں گے۔ اپنی زبان کو لگام دو یہاں تیری کوئی شعبدہ بازی نہیں چلے گی۔ ہم تجھے اسی وقت جہنم رسید کریں گے۔" نواب بتن علی غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اس کے منہ

سے مغلظات کا طوفان جاری ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں جو چیز آئی، مجھ پر اٹھا کر پھینکنے لگا۔ اس کے پاگل پن کا یہ تماشا میری دلچسپی کا باعث تھا۔ وہ لڑکی جس کا نام نوشابہ تھا، ایک طرف کھڑی تھی۔

ببّن علی کا قہر و غضب قابلِ دید تھا۔ جب وہ حد سے بڑھنے لگا تو نوشابہ ببّن علی کا ہاتھ روکنے لگی لیکن ببن علی نے اس کے سر پر بھی ایک شمع دان اٹھا کر دے ماری۔ نوشابہ وہیں لہرا گئی۔ پھر ببن علی میری طرف بڑھا اور میں نے اس لحیم شحیم آدمی کو ہاتھ بڑھا کر بڑے اعتماد سے روک لیا "ببن علی!" میں نے کہا "میں تو تمھیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں یہاں آگیا ہوں، پہلے میرا ارادہ تمھارے قدموں سے یہ زمین پاک کرنے کا تھا لیکن میں نے سوچا کہ تمھیں اپنے اعمال کی سزا ابھی بھگت لینی چاہیے۔ درخشاں اور زرافشاں کو میرے حوالے کر دو۔ فی الحال ان میں سے کوئی بھی مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔ نواب کے گھر میں آکر کوئی واپس نہیں جاتا۔"

"جمیل احمد خاں!" ببن علی نے دانت پیس کر کہا اور بڑھ کر اپنی بندوق اٹھا لی۔ اس نے تیزی سے نشانہ باندھنا چاہا لیکن ظاہر ہے انکا کی موجودگی میں وہ جمیل احمد خاں پر یہ کاری وار کس طرح کر سکتا تھا۔ انکا میرے سر سے چھلاوے کی طرح غائب ہوگئی اور میں نے آگے بڑھ کر ببّن علی کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔

ببّن علی حیرت زدہ نظروں سے میرا اطمینان اور اعتماد دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے ایک بھرپور ضرب بندوق کے کندے کی ببّن علی کے سر پر ماری اور یہ کہتا ہوا رخصت ہوگیا۔ "ببّن علی! میں تمھاری بہنوں کے پاس جا رہا ہوں۔" اس کے سر سے خون جاری ہوگیا تھا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ سخت جان اتنی آسانی سے نہیں مر سکتا۔ اسے بے ہوش چھوڑ کر میں اس کی خوابگاہ سے باہر آگیا۔ انکا پھرتی سے میرے سر پہ آگئی اور میرے باہر نکلتے ہی اس نے مجھ سے سوال کیا۔ "جمیل کیا ارادہ ہے؟"

"میں ببّن علی کی دونوں بہنوں کو یا فی الحال ایک کو یہاں سے لے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"میں تمھارے ہر حکم کی تعمیل کی پابند ہوں لیکن....."

"لیکن کیا" میں نے انکا کو جملہ ادھورا چھوڑنے پر کرید تے ہوئے پوچھا۔ "تم نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا۔ کیوں انکا۔ ہم آخر یہاں کس لیے آئے تھے۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میری درخواست ہے جمیل! تم لڑکیوں کے سلسلے میں اپنا ارادہ بدل دو۔" انکا نے دبی آواز میں کہا۔ "میں سمجھتی ہوں اس میں تمھارے لیے کچھ خطرے موجود ہیں، یوں بھی وہ بے چاریاں بے قصور ہیں۔"

"تعجب ہے۔ یہ بات تم کہہ رہی ہو؟ حالانکہ تمھی نے مجھے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اکسایا تھا۔ کیا تم بھول گئیں کہ میری بہن رخسانہ کو کس نے اغوا کرایا تھا؟ کیا رخسانہ بے گناہ نہیں تھی؟"

"میں تمھارے احساسات سے واقف ہوں جمیل! مگر مجھے اس کام میں کچھ اچھے آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔ اگر ہم انھیں معاف کرتے ہیں تو بھی ببّن علی سے انتقام لینے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"مگر میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسی ہیں؟ انکا! کیا ببّن علی کے لیے اس سے بڑی سزا کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بہنیں کوٹھے پر بیٹھیں؟"

"تم انھیں دیکھ سکتے ہو، وہ اوپر کی منزل پر رہتی ہیں لیکن ببن علی کو اس سے زیادہ بھیانک سزا مل سکتی ہے۔ ابھی تو ابتدا ہوئی ہے۔" انکا مصر رہی۔

"ٹھیک ہے ــــ آؤ اوپری منزل پر چلتے ہیں۔ یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔ تم ان میں سے ایک لڑکی کے سر پر چلی جانا اس طرح ہم اسے آسانی سے یہاں سے لے جائیں گے۔"

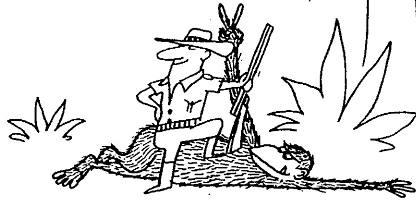
"مگر ــ مگر جمیل!" انکا نے جھجک کا اظہار کیا۔

"مگر کیا؟ انکا ـــــ مجھے وہاں لے چلو۔ میں ان حسیناؤں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اوپری منزل کی طرف چلنے لگا۔ انکا کے انکار پر میرا جنون اور بڑھ گیا تھا۔ مجھے انھیں دیکھنے کا اشتیاق تھا اور میرا عہد مجھے اکسا رہا تھا کہ میں اس کی تکمیل کر دوں۔ ابھی میں نے چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ انکا کے پنجوں کی چبھن مجھے اپنے سر پر محسوس ہوئی۔ وہ مجھے روک رہی تھی۔ "ٹھہر جاؤ جمیل! آگے راستہ بند ہے۔"

"راستہ کہاں بند ہے انکا؟ سامنے نظر آرہا ہے۔ کیا تمھیں کچھ نظر نہیں آرہا۔" میں نے برہمی سے کہا اور ایک دو سیڑھیاں اور پار کر لیں۔

"رک جاؤ۔" ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز مجھے سنائی دی۔ میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ "کون ہے انکا! یہ آواز کس کی ہے۔" میں نے جز بز ہو کر کہا۔





"چلو جمیل واپس چلتے ہیں۔" انکا نے مجھے پچکارتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟ تم مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں ہو؟"

"راستہ بند ہے۔ راستہ کھل سکتا ہے مگر تمھارے لیے یہ بہتر نہ ہوگا۔" انکا نے پہلو بدل کر کہا۔

"تم کیسی بھول بھلیّوں والی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"پھر اچانک اوپر کی سیڑھیوں پر مجھے ایک سایہ نظر آیا، ایک مرد کا سایہ —— جو ایک لمحے میں ایک شکیل و وجیہہ مرد کی صورت میں واضح ہوگیا۔ اس کے انداز میں شاہانہ جلال تھا اور وہ کوئی قدیم لباس زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ اتنا پر وقار اور خوبصورت تھا کہ اس پر کسی شہزادے کا گمان ہوتا تھا۔ جیسے کتابوں میں کسی مسلمان شہزادے کا حلیہ ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ لیکن —— دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا ضدی آدمی جاگ اٹھا۔ میں نے اوپر کی ایک اور سیڑھی پھلانگ لی۔

"رک جائیے۔" اس نے نہایت مہذب لہجے میں کہا۔

"میں اوپر جانا چاہتا ہوں۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"آپ اوپر نہیں جاسکتے۔ اُدھر زنان خانہ ہے۔" اس کی شیریں زبانی نے مجھے متاثر کیا۔

"میں زنان خانے ہی میں جانا چاہتا ہوں۔ میرے راستے سے ہٹ جائیے۔" میں نے سختی سے کہا۔

"ہم یہاں کی نگہبانی کرتے ہیں۔ آپ میری موجودگی میں اندر نہیں جاسکتے۔" اس نے کہا۔

"آپ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ میں ایک ذلیل شخص کو اُس کے کرتوت کا مزہ چکھلانے آیا ہوں۔" نیچے بنّن علی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ "اس کا انجام دیکھ لیجیے اور میرے راستے سے ہٹ جائیے۔"

"بنّن علی سے آپ جو چاہیں انتقام لے سکتے ہیں مگر اس کی بہنیں بے قصور ہیں اور پھر ہم ان کے نگہبان ہیں، ہم ایک عرصے سے یہاں رہتے ہیں۔"

"آپ کون ہیں؟" میں نے اس سے متاثر ہو کر پوچھا۔

"ہم درخشاں اور زرافشاں کے امین ہیں۔ ہمارا سایہ ان پر موجود ہے۔ ہم آپ کے کسی معاملے میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے لیکن یہاں ہم آپ کے راستے میں حارج ہوں گے۔ بہتر ہے آپ چلے جائیں۔"

"ورنہ پھر آپ کیا کریں گے؟" میں نے درشتی سے پوچھا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ آپ بھی تنہا نہیں ہیں مگر ہم مزاحمت کریں گے ممکن ہے آپ کو اس سے نقصان پہنچے۔ ممکن ہے ہمیں اپنے رفیقوں کو بلانا پڑے۔" اس نے بے جھجک ہو کر کہا۔

"یہ کون ہے۔" میں نے انکا سے پوچھا تو وہ ایک ثانیے کے لیے خاموش ہوگئی پھر کہنے لگی "جمیل! یہاں سے چلے چلو۔ بنّن علی کی حویلی ایک قدیم حویلی ہے۔ زنان خانے کے اس حصے پر جہاں درخشاں اور زرافشاں رہتی ہیں وہاں اس مسلمان جن کا تسلط ہے۔ تم اس کی موجودگی میں وہاں نہیں جاسکتے۔"

"جن؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا واقعی یہ نوجوان شخص کوئی جن ہے؟ مگر تم کس مرض کی دوا ہو؟ کیا تم اسے زیر نہیں کرسکتیں؟"

"تمہیں چاہیے کہ مجھے ایسے حالات میں نہ ڈالو جہاں خود مجھے کسی آزمائش میں پڑنے کا احتمال ہو۔

ماورائی قوتیں آپس میں اس طرح کی چپقلش سے گریز کرتی ہیں۔ پھر ہوسکتا ہے کہ اس جن کا ایک پرا یہاں موجود ہو۔ ہمیں کچھ اور کرنا پڑے گا۔ کوئی اور ترکیب سوچنی ہوگی۔ یہ جن پورے طور پر اپنے قدموں پر جما ہوا ہے۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔" انکا نے اضطراب سے کہا۔

"آپ جانتے ہیں ببّن علی نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟" میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا جو مسکرا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ درخشاں اور زرافشاں بالکل سادہ و معصوم ہیں۔"

"میری بہن بھی سادہ و معصوم تھی۔ ببّن علی نے اسے اغوا کرایا تھا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"لیکن ہم وہاں موجود نہیں تھے۔ ہمارا مسکن یہاں ہے۔"

"کیا آپ یہ نکتہ سمجھ رہے ہیں کہ میں عام لوگوں سے مختلف شخص ہوں۔"

"ہمیں معلوم ہے، اسی لیے ہم آپ سے درخواست کر رہے ہیں۔"

"مگر میں آپ سے ایک بات کہہ دوں۔ اس وقت تو میں چلا جاتا ہوں لیکن میں اپنے عہد کی تکمیل کے لیے بے قرار رہوں گا۔"

"جب تک ہم حویلی کے اس حصے میں موجود ہیں۔ ہم مزاحم ہوتے رہیں گے۔"

"بہتر ہے کہ آپ راستے سے ہٹ جائیں، جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میرے پاس اس سے زیادہ ہے۔"

"بخدا جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، وہ بھی کم ہے۔ ہمیں اپنی برتری کا اظہار نہیں آتا، تاہم آپ خود محسوس کر سکتے ہیں۔"

"شاید آپ غلطی کر رہے ہیں۔ آپ اس شخص سے مخاطب ہیں جو برسوں سے ایسے ہنگاموں کا عادی ہے۔ یقین کیجیے کہ آپ کے مخاطب نے ان ہنگاموں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"لیکن آپ کی آنکھوں پر ایک غلاف چڑھا ہوا ہے۔"

"جمیل! بات نہ بڑھاؤ۔ یہاں سے چلے چلو۔ نیچے ببّن علی کی خواب گاہ میں ایک ہجوم جمع ہو چکا ہے۔" انکا نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"آپ کو صحیح مشورہ دیا جا رہا ہے۔" شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ ایک چیلنج ہے، یہ ایک دھمکی ہے، مجھے دھمکیاں پسند نہیں ہیں۔ میں دوبارہ آؤں گا۔" میں نے تلملا کر کہا۔

"ہم آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے غائب ہو گیا۔ میں نے پھر اوپر چڑھنا چاہا لیکن انکا نے بڑی سختی سے روک دیا۔ بہت بے بسی کی حالت میں مجھے نیچے آنا پڑا۔ یہاں شور ہو رہا تھا۔ میں خواب گاہ سے بچتا بچاتا، انکا پر پیچ و تاب کھاتا حویلی سے باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ راستے میں انکا خاموش رہی۔ میں نے بھی اس سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ رات خاصی گزر گئی تھی میں گھر جا کر بستر پر دراز ہو گیا اور جب مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تو انکا نے سرگوشی کی۔

"جمیل! تم نے اچھا کیا جو وہاں سے چلے آئے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کہنے لگی "تمھارے بے قرار دل کو سکون پہنچانے کے لیے ابھی ببّن علی باقی ہے۔ ہمارے لیے کسی طور یہ مناسب نہیں تھا کہ ہم ایسے وقت میں جنّات سے کوئی جھگڑا مول لیتے۔ ان جنّات میں بعض بہت پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ جہاں رہتے ہیں وہاں کے مکینوں کے محافظ بھی ہوتے ہیں اور ان کے لیے آفتِ جاں بھی۔ یہ جن ببّن علی کی بہنوں سے شدید وابستگی رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی ہر طاقت بروئے کار لاتا۔ ہم ایک معمولی کام کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔"

"مگر میں ہر حالت میں اپنے عہد کی تکمیل چاہتا ہوں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"میں نے اس پر خوب سوچا ہے۔ ببّن علی کا زوال قریب ہے۔ تم اُسے لکھنؤ کی سڑکوں پر رسوا ہوتے ہوئے دیکھ لینا۔ کل رات میں تمھیں اشرفی بیگم کے ہاں لے چلوں گی۔ وہاں تزئین کی جگہ پُر کرنے کے لیے دل نشیں نامی ایک قتالہ آئی ہوئی ہے۔ تم دل نشیں کو دیکھو گے تو تمھارا بُرا حال ہو جائے گا۔ ہر حسین لڑکی نوابین کو مطلوب ہے، جس طرح تزئین کے لیے خون خرابہ ہوا تھا۔ اسی طرح دل نشیں کے لیے ہو سکتا ہے۔" انکا نے کہا۔

"انکا کیا ہم ببّن علی کی حویلی خرید نہیں سکتے؟" اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا۔

"حویلی؟ ہم ببّن علی کو خرید سکتے ہیں مگر یہ کام چٹکی بجاتے نہیں

ہوسکتا اس کے لیے ہمیں ایک طویل راستے سے چلنا ہوگا۔ ہمیں بازارِ حسن کی حرافہ اشرفی بیگم کو اعتماد میں لے کر بتن علی کی تباہی کے اسباب پیدا کرنے ہوں گے۔"

"انکا نے مجھے تفصیل سے بتن علی کی عادتوں کے متعلق بتانا شروع کیا لیکن اس جن کی موجودگی سے سارا منصوبہ بگڑ گیا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ جب بتن علی کو ہوش آیا ہوگا تو اس نے اپنی چوٹ کے متعلق یقیناً میرا نام لیا ہوگا۔ وہاں ایک گواہ نوشابہ بھی موجود تھی جس نے زمرد کے قتل کا پورا واقعہ سُن لیا تھا۔ مجھے احساس ہوا جیسے آنے والی صبح پولیس میرے دروازے پر موجود ہوسکتی ہے۔ میں نے انکا سے اپنے اس خدشے کا ذکر کیا تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ بتن علی میرے حویلی میں اس طرح دیدہ دلیری سے دندناتے ہوئے گھس جانے کے باعث اب محتاط ہو گیا ہوگا۔ وہ خوامخواہ جھگڑے کو طول دینے سے گریز کرے گا۔ دوسرے اس نے نوشابہ کے سامنے اقبالِ جرم کیا تھا۔ اس لیے وہ سب سے پہلے اس کا منہ بند کرنے کے لیے اسے قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔ بتن علی اس بات سے واقف ہے کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔ وہ تمھیں عمر قید نہیں کرا سکتا۔ جیل میں بھیجے گا تو بہت سی باتیں کھُل کر سامنے آئیں گی اور پھر رہا ہونے کے بعد تم پہلے سے زیادہ مشتعل ہو گے۔" میں انکا کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا لیکن ایک عجیب الجھن سی ذہن و دل پر طاری تھی۔ اس برخود غلط جن کی تادیب کی خواہش بھی دل میں ابھر رہی تھی۔ ہم دونوں آدھی رات تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور جب کسی ایک نتیجے پر پہنچ گئے تو مجھے نیند آگئی۔

صبح میں دیر سے اٹھا اور وہ بھی اس وقت جب میری بہن رخسانہ نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ برآمدے میں سارا گھر چائے کی میز پر موجود تھا۔ ملازمین کی چہل پہل تھی۔ نفیس آڑا پاجامہ پہنے، دوپٹا سر پر اوڑھے ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ منہ دھویا اور میز پر آکر بیٹھ گیا۔ چھوٹی بہن نے چائے بنائی۔ چچا جان نے جھجکتے ہوئے پھر وہی بات چھیڑ دی جس کا تذکرہ وہ کئی بار کر چکے تھے۔ رخسانہ بھی میرے کولھے سے لگ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "ابا جان اگر آپ اجازت دیں تو میں جمیل بھائی سے بات کرلوں؟"

میں نے یہ تذکرہ درمیان سے ختم کر دیا، میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔" رخسانہ ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ ابھی یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

"نہیں اتنی جلدی نہیں ہے بیٹے لیکن ....."

"میں بتاتی ہوں جمیل بھائی!" رخسانہ نے چچا جان کی بات درمیان میں اُچک لی۔" بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے پڑوس میں بنارس کا ایک خاندان آباد ہے۔ ابھی ابھی ہم لوگوں سے اس خاندان کے تعلقات قائم ہوئے ہیں۔ کل فرزانہ وہاں ملنے کی غرض سے گئی تھیں۔ اور آپ کے لیے ایک دُلھن، چاند سی دُلھن پسند کر آئیں۔ سچ جمیل بھائی! لڑکی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ نام بھی بڑا خوبصورت ہے۔ روحی۔"

"رخسانہ تم کتنی سنگدل ہو، ابھی تمھاری بھابی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔ کوئی اور بات کرو۔" میں نے رخسانہ سے براہِ راست بات کہی۔ وہ ہونٹ چبا کر خاموش ہوگئی۔

چچا جان نے میرے چہرے پر غم کی پرچھائیاں دیکھیں تو موضوع بدل دیا اور کاروبار کی بات کرنے لگے، بڑی مشکل سے ان لوگوں سے چھٹکارا ملا۔ چائے جلدی جلدی ختم کرکے میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے۔ انکا بیدار ہو چکی تھی اور سر پر چہل قدمی کرنے میں مصروف تھی۔ خاصی چاق و چوبند نظر آ

رہی تھی۔ میں باہر جانے کے ارادے سے نکلا تو رخسانہ میری منتظر تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کی نمی محسوس کرلی۔ وہ مجھ سے معافی مانگ رہی تھی۔ اس کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی میں نے اسے خوش کرنے کے لیے مسکرا کر کہا "تمھیں اس شرارت کی سزا ضرور ملے گی۔ میں کل ہی کسی وقت چچا جان سے بات کروں گا کہ اب تمھاری ڈولی اٹھانے کا بندوبست کریں۔"

"بھائی جان!" رخسانہ نے شرمیلی نظروں سے مجھے گھورا، پھر چہرے پر ہاتھ رکھ کر بھاگ گئی۔ میں ایک دل کش موڈ میں گھر سے باہر نکلا اور حضرت گنج کے ایک کافی ہاؤس میں تنہائی کا ایک کونا ڈھونڈ کر انکا سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے آج ترزینن اور کلدیپ یاد آرہی تھیں۔ انکا کو ابھی تک میں نے ان کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ میرا ارادہ جلد سے جلد یہاں سے جانے کا تھا لیکن درمیان میں یہ تثلیث، ناظم علی، ابنّ علی اور اشرفی بیگم کی تثلیث آگئی۔ دوپہر کو میں نے ہوٹل ہی میں کھانا کھایا اور انکا نے مجھے اس جگہ پہنچا دیا جہاں بازارِ حسن کے نامی گرامی دلال رہتے تھے۔ مجھے ان کی زبانی عجیب عجیب باتیں معلوم ہوئیں اور یہ بھی پتہ چلا کہ دل نشیں کو اشرفی بیگم نے ایک بڑی رقم کے عوض کسی کشمیری خاندان سے خریدا ہے۔ بہر حال میں نے ان کی جیب خاصی گرم کردی۔ شام کو میں گھر چلا آیا مجھے رات کا انتظار تھا۔ آفتاب غروب ہوا تو میں نے ایک شیروانی نکالی، عطر لگایا اور نوابوں کی طرح سج بن کر اس کوچہ دلبراں کا رخ کیا جہاں سرِ شام حسن کے جابجا جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ بالاخانوں سے رقص و موسیقی چھن چھن کر باہر آرہی تھی خوشبوئیں بکھر رہی تھیں۔ پان کی دکانوں پر بانکے سجیلے نوجوان کھڑے گلوریاں چبا رہے تھے۔ غرض ہر سمت زندگی شباب پر تھی۔ انکا ایک ایک چیز کو آنکھیں مٹکا مٹکا کر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ہم دونوں کا موڈ خوش گوار تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی "جمیل یہاں ان من چلوں کو کیا لطف آتا ہے؟ یہاں تو ایک انار سو بیمار والا حساب ہوتا ہے۔"

"یہ سب اس وجہ سے ہے کہ عورت نایاب ہے۔ عورت اگر عام ہو جائے تو اس بازار کی یہ رونق نہ رہے۔" میں نے جواب دیا "بہر حال تم پر بہت کچھ انحصار ہے۔"

"تم مستعد رہنا۔"

"میں آج بہت تر و تازہ ہوں۔"

"تمھیں خون کی ضرورت تو محسوس ہوتی ہوگی؟"

"ہاں، کل ناظم علی کا کچھ خون میرے حلق میں منتقل ہوگیا تھا۔"

"اوہ، تو یہ وجہ ہے تمھاری شادابی کی؟"

"مگر میرے لیے تمھیں کوئی انتظام کرنا پڑے گا جمیل!" انکا اٹھلا کر بولی۔

"جب تک دنیا میں برے لوگوں کی بہتات ہے، اس وقت تک تمھاری غذا کی بھی بہتات ہے۔ ابنّ علی کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"وہ ـــ" انکا نے مزے لے کر کہا "مگر اس میں ابھی بہت دیر ہے۔"

لوگوں کی بھیڑ سے گزرتا ہوا میں اشرفی بیگم کے بالاخانے پر پہنچ گیا۔ اوپر سے کسی مغنّیہ کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اوپر پہنچا تو محفل گرم تھی۔ اشرفی بیگم سازندوں کے قریب بڑے ٹھسے سے بیٹھی اس نوخیز مغنّیہ کو دیکھ رہی تھی جس کے گلے میں سوز تھا۔ وہ بلاشبہ ایک حسین لڑکی تھی۔ کمرے میں آٹھ دس افراد گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے تھے اور مغنّیہ کو ہوس ناک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں چونکہ دروازے کی اوٹ میں تھا اس لیے اشرفی بیگم اور سازندوں کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکی۔ چند ایک تماش بینوں نے دیکھا لیکن وہ مغنّیہ میں اتنے الجھے ہوئے تھے کہ مجھ پر اچٹتی نظر ڈال کر پھر ادھر مصروف ہوگئے۔ انکا نے مجھے اس نوخیز مغنّیہ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ "جمیل! اشرفی بیگم نے اپنی دکان سجانے کے لیے بڑے انمول موتی کا انتخاب کیا ہے۔ یہی دل نشیں ہے۔ تین چار دن پہلے یہ اس کوچے میں جے پور سے آئی ہے۔ کشمیری ہے۔ جے پور میں رقص و موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی تھی، اشرفی بیگم نے اسے بڑی معقول رقم دے کر خریدا ہے۔ یہ سودا پھر بھی سستا تھا۔ اب اس کا نیلام ہوگا اور لکھنؤ کے نوابین میں کھلبلی مچ جائے گی۔ لکھنؤ میں ابھی دل نشیں کے جلوے کی خوشبو نوابین کی حویلیوں تک نہیں پہنچی ہے۔ اشرفی بیگم نے اس کے حسن کے چرچے عام کرنے کے لیے چند دلال چھوڑ رکھے ہیں۔ لیکن یہ کام اب میرے اور تمھارے ذمے ہوگا۔ ہم اس کی قیمت بڑھا دیں گے۔ یہاں اگلے چند دنوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوگی۔ لاکھوں روپے اشرفی بیگم اس کی نتھ کے وصول کرسکتی ہے۔"

میں نے دل نشیں کو غور سے دیکھا اس میں لوگوں کو دیوانہ بنانے

کی تمام ادائیں موجود تھیں۔ دل نشیں تو کوئی قیامت تھی۔ میں دروازے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا پھر بے دھڑک اندر جا کر ایک گاؤ تکیے سے ٹک گیا۔ اشرفی بیگم کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ غصّے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ سازندوں نے مجھے دیکھا تو ان کے چہروں کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور روپے نچھاور کرنے شروع کر دیے۔ جب میں نے پہلا بڑا نوٹ نکالا تو محفل کے آداب کے مطابق دل نشیں اٹھ کر میرے پاس آ گئی اور میرے سامنے بیٹھ کر مصرع دُہرانے لگی۔ میں نے نوٹ اس کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ پھر دوسرا نوٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا، دل نشیں نے ایک دل نواز تبسّم کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔ اس کی یہ ادا دل کو بہت بھائی۔ نوٹ تمام کر وہ جانے کے ارادے سے اُٹھی تو میں نے دوسرا نوٹ نکال لیا، پھر یہ سلسلہ جاری رکھا تاکہ دل نشیں میرے سامنے بیٹھی رہے اور کسی اور کے سامنے نہ جا سکے۔ اشرفی بیگم کا نوٹوں پر لوٹ رہی تھی۔ دل نشیں ان باتوں سے بے نیاز میرے سامنے بیٹھی دل نشیں انداز سے نغمہ سرائی کر رہی تھی۔ میں اس سے فرمائش کرتا رہا اور روپے نکالتا رہا۔ حاضرینِ محفل کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ رنگ دیکھا تو بددل ہو کر اٹھنے لگے۔ میں ایک گھنٹے میں ہزاروں روپے لُٹا چکا تھا اور اب وہاں میرے سوا کوئی اور تماش بین نہیں رہ گیا تھا۔ میں اشرفی بیگم کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق بنی بیٹھی تھی، لیکن تابکے؟ جب دل نشیں نے غزل ختم کی اور دوسری غزل شروع کرنے سے پیشتر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گنگنانا شروع کیا تو اشرفی بیگم چپ نہ رہ سکی۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں سے بولی "بس کرو دل نشیں تمھاری طبیعت نصیبِ دشمناں پہلے سے ناساز ہے، اب خواب گاہ میں جا کر آرام کرو، خورشید تمھاری کمی پوری کرنے کی کوشش کرے گی۔"

دل نشیں نے تعجب سے اشرفی بیگم کو دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے، پھر وہ بڑے ادب سے اپنا حنائی ہاتھ پیشانی تک لے جا کر مجھے تسلیم کہتی ہوئی اُٹھنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اگر آپ کے مزاج ناساز ہیں تو میں نغمہ سرائی کی زحمت نہیں دوں گا۔ آپ کی گفتگو بھی تو شعرِ دل سے کم نہیں۔ آپ تو خود ایک غزل ہیں۔"

"آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ کنیز حکم کی تعمیل کرے گی۔" دل نشیں نے تیکھے انداز میں کہا پھر میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اشرفی بیگم ہاتھ مل رہی تھی۔ سازندے خاموش بیٹھے دزدیدہ نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے ان سب کو نظر انداز کر دیا اور دل نشیں کو والہانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "آپ غالباً اس کوچۂ عشرت میں نئی آئی ہیں؟"

"جی ہاں، کنیز کا یہ تیسرا دن ہے جو شرفا کے سامنے بیٹھنے کی جرأت کر رہی ہے۔" دل نشیں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"زہے نصیب۔ ہم بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہو گئے جنھوں نے آغازِ شباب میں آپ کا دیدار کر لیا۔"

دل نشیں کا چہرہ حیا سے گلنار ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "یقین کیجیے۔ جو عرض کیا گیا ہے وہ دل کی آواز ہے۔"

دل نشیں نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر لجا کر بولی "قدر افزائی کا شکریہ۔"

اشرفی بیگم جو ابھی تک دُور ہی دُور بیٹھی تھی۔ تیزی سے اپنا بھاری غرارہ سنبھالتی ہوئی میرے قریب آ گئی اور دل نشیں سے بولی۔ "دل نشیں جانِ من۔ تمھیں آرام کی ضرورت ہے، خواب گاہ تمھاری منتظر ہے۔"

دل نشیں نے سہم کر اشرفی بیگم کے چہرے پر نگاہ کی، پھر کنکھیوں

سے میری جانب دیکھ کر معذرت طلب کی۔ تسلیم کرتی ہوئی اٹھی اور اندر چلی گئی۔ اشرفی بیگم کھڑی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیے اشرفی بیگم! آپ کا قدیم نیاز مند بارگاہِ حسن میں حاضر ہے۔ کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

"جمیل میاں! اشرفی بیگم الفاظ چباتے ہوئے بولیں "میں ایک بار پہلے بھی آپ سے دست بستہ عرض کر چکی ہوں کہ آپ مجھ سے کوئی راہ و رسم نہ رکھیں۔ از راہِ کرم آپ یہاں آنے سے گریز کیا کریں۔ میرا کاروبار یہی ہے۔ آپ کیوں ہم لوگوں کو پریشان کرنے آجاتے ہیں؟"

"بہت خوب" میں نے اشرفی بیگم کی جھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "گویا آپ کو اب میرا یہاں آنا بھی گوارا نہیں۔ میں یہاں آتا ہوں تو خالی ہاتھ نہیں آتا۔ یہ دروازہ تو سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ ویسے میں عرض کر دوں کہ میں پہلے بھی آپ کو پریشان کرنے نہیں آیا تھا۔ حالانکہ آپ نے مجھے رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ باتیں تو خیر بعد میں ہوں گی۔ آپ مجھے دیکھ چکی ہیں، میں آپ کو برت چکا ہوں۔ میرا خیال ہے اب آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔ اپنے مہمانوں سے ایسا سلوک نہ کیجیے کہ وہ گستاخی کی جرأت کر سکیں۔"

"دیکھیے جمیل میاں! اب بہت ہو چکا۔ تزئین کا اب تک پتہ نہیں ہے۔ قید خانہ، قتل، گولیاں۔ ہم ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ آپ جب بھی آتے ہیں کوئی نہ کوئی قیامت آتی ہے۔ خدا کے لیے ہمیں معاف کیجیے۔"

"ارے رے آپ تو بہت خوفزدہ ہیں مجھ سے۔ میں تو حسن کا پجاری ہوں۔ سنا تھا آپ کے یہاں ایک نادر چیز موجود ہے۔ سودا کرنے چلا آیا۔"

"اگر آپ کا اشارہ دل نشیں کی طرف ہے تو میں معذرت چاہوں گی۔ تزئین کے بعد بڑی مشکل سے میں نے لکھنؤ کے امرا کے لیے یہ قیمتی لڑکی تلاش کی ہے۔"

"سچ، آپ کو حسن کا انتخاب آتا ہے۔ آپ کے کمالات کا میں دل سے قائل ہوں۔ سارا شہر آپ کی مٹھی میں ہے۔ عہدے دار آپ کے قدموں میں رہتے ہیں۔ نوابین آپ کی ایک نظرِ التفات کے متمنی ہیں۔ آپ حسین ہونے کے ساتھ سنگدل بھی ہیں۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بہرحال میں دل نشیں کی تعریف سن کر چلا آیا تھا اس کلی کو شگفتگی کی نوید دینے کے لیے آپ نے کیا نذرانہ مقرر کیا ہے؟"

"نذرانہ آدمی دیکھ کر مقرر کیا جاتا ہے۔"

"آپ پھر میری توہین کر رہی ہیں" میں نے طنز کیا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے" اشرفی بیگم سنبھل کر بولی "خاں صاحب! آپ اس نیلام میں بولی لگا سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے آپ کو مایوسی ہوگی۔"

"آپ موقع تو دیجیے۔ مجھ پر یہ ستم تو نہ کیجیے۔"

"آپ سے ڈر لگتا ہے" اشرفی بیگم نے اچانک کہا۔

"میں اتنا بدصورت تو نہیں ہوں۔ آپ کی نظر فریب خوردہ ہے" میں نے شوخی سے کہا۔

"آپ کوئی جن، دیو ہیں خاں صاحب۔ آپ نے پنڈت مرلی دھر کو زچ کیا، جیل سے صاف نکل آئے، پراسرار طور پر تزئین غائب ہو گئی۔ آپ نے پورے شہر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا، ناظم علی نے حیرت انگیز طور پر خودکشی کر لی۔ یہ سب اتنے تواتر اور تسلسل سے ہو رہا ہے کہ آپ سے دور رہنے ہی میں عافیت نظر آتی ہے" اشرفی بیگم کے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔

"میں ایک سیدھا سادا آدمی ہوں، حسن کا دلدادہ ہوں، غیرت مند ہوں۔ آپ نے شروع سے مجھے غلط سمجھا اور تکلیفیں اٹھائیں۔ آپ یکے بعد دیگرے غلطیاں کرتی رہیں یہاں تک کہ آپ نے مبّن علی کو میری بہن کو اغوا کرانے پر اکسایا۔ بہرحال میں یہ باتیں تفصیل سے دہرانا نہیں چاہتا۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ میں دل نشیں کی محبتِ رنگیں کا طلب گار ہوں۔ مجھے حکم دیجیے کہ کتنا نذرانہ پیش کر دیا جائے؟"

"خاں صاحب! میں فی الحال اس کا سودا کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ ابھی مجھے اس کی قیمت کا اندازہ کرنا ہے۔"

"وہ بھی کر لیجیے اور میری بھی سن لیجیے۔ میں ایک لاکھ روپے نذر کرنے پر آمادہ ہوں۔"

اشرفی بیگم نے حیرت سے مجھے دیکھا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔ "ایک لاکھ روپے! خاں صاحب! آپ کو ہیرے کی پہچان ہے پھر ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ نگینہ جب نوابین اودھ کی آغوش میں جگمگائے گا تو آپ کو اس کی صحیح قیمت کا اندازہ ہوگا۔"

"میں رقم بڑھا سکتا ہوں۔ سودے بازی مجھے اچھی نہیں لگتی۔

دو لاکھ روپے۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔" اشرفی بیگم نے دیدے پھاڑ کر کہا۔

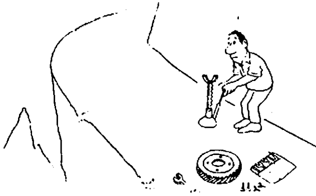
"میں یہاں آتا رہوں گا۔ آپ سوچ لیجیے اور کوئی اچھی سی غزل سنوا دیجیے۔ آپ خود بھی تو اچھا گاتی ہوں گی؟ اب بھی آپ کے تیوروں میں ان گنت حسیناؤں کا تیکھا پن ہے۔ کاٹ ہے۔" میں نے تفریحاً کہا۔

"جمیل صاحب! میں اب کہاں رہی؟ تزئین کے جانے کے بعد تو میری کمر ٹوٹ گئی۔ آپ میرا مذاق نہ اڑائیں۔"

"توبہ کیجیے۔ لیکن آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔"

"خدا کرے ایسا ہی رہے۔"

اشرفی بیگم فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ دبلے پتلے نقش و نگار کی ایک لڑکی خورشید وہاں آئی اور اس نے گانا شروع کر دیا۔ میں کچھ دیر وہاں رہا اور اپنے پہلے دن کا کام نمٹا کر چلا آیا۔ دوسرے دن صبح میں دلالوں کے اس ہوٹل میں گیا جہاں عموماً ان کی بھیڑ رہتی تھی۔ میں نے ان کے کانوں میں یہ بات ڈال دی کہ میں دل نشیں کے لیے دو لاکھ روپے کی پیش کش کر آیا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ رات تک یہ خبر تمام نوابین تک پہنچ جائے گی اور پھر رات کو اشرفی بیگم کے ہاں بہت ہجوم ہو گا اور یہی ہوا، دوسری رات جب میں وہاں پہنچا تو امرائے شہر خاصی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ اشرفی بیگم مسرت سے کھلی جا رہی تھی اور دل نشیں کی آواز پر شباب آ گیا تھا۔ میں نے اس دن بھی روپے لٹائے لیکن احتیاط کے ساتھ۔ اس رات مجھے تنہائی کا موقع نہیں ملا۔ رات گئے تک مختلف امرا اشرفی بیگم سے دل نشیں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ان کا بھدک کر ان کے سروں پر جاتی رہی۔ لُوہ لیتی رہی اور ان کا اشتیاق بڑھاتی رہی۔ بمبئی کے ایک من چلے سیٹھ داؤد بھائی نے اسی دن تین لاکھ روپے دل نشیں کے لیے طے کیے لیکن وہ مسکرا کر ٹال گئی۔ اس نے میری طرح اس سے بھی کچھ سوچنے کا وقت مانگا۔ گویا کشمیر کی ایک پری چہرہ لڑکی کی دوشیزگی کا نرخ ایک رات میں تین لاکھ روپے ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ حاسد نوابین ایک دوسرے کو زیر کرنے اور اپنی انا کا سکہ بٹھانے کے لیے کس قدر بڑھ چڑھ کر بولیاں لگائیں گے اور وہ کم بخت بنّن



علی — اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی مگر یہ کس طرح ممکن تھا کہ اس کے گرگے اُسے اشرفی بیگم کے ہاں بولی لگنے کی خبر نہ پہنچاتے اور وہ ملعون بوالہوس یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی حسین لڑکی لکھنؤ کے دوسرے نوابین کی آغوش میں چلی جاتی۔ میں جو چاہتا تھا وہ بہت خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا، ہر روز رات کو میں دیوانہ وار اشرفی بیگم کے کوٹھے پر جاتا۔ وہاں دل نشیں کا پُرشباب رقص ہوتا۔ یہاں میں بے شمار تفصیلات دانستہ حذف کر رہا ہوں حالانکہ جی یہی چاہتا ہے کہ ہر اس رات کا احوال لکھا جائے جو اشرفی بیگم کے بالاخانے پر گزری۔ ممکن ہے آپ حسن و جمال کا تذکرہ بیان کی طوالت پر محمول کریں۔ تاہم حسن کے ذکر میں بخل سے کام لینا میرے نزدیک گناہ ہے۔ اشرفی بیگم کے بالاخانے پر حسن کا اجتماع تھا، ایک سے ایک نادر لڑکی موجود تھی۔ ایک ہفتے بعد صورت یہ ہوئی کہ دل نشیں بہت سے لوگوں کے لیے چیلنج بن گئی، اشرفی بیگم دونوں ہاتھوں نقدی اور تحائف لوٹ رہی تھی اور دل نشیں کی قیمت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ دل نشیں کے شائقانِ دید کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا میرے لیے یہ سب سے دلچسپ اور انوکھا مشغلہ تھا۔ ان کا بھی بہت خوش خوش نظر آتی تھی ایک دن یہ بھی سنا کہ نواب بنّن علی نے دل نشیں کی یہ شہرت سن کر اپنا خاص نمایندہ اشرفی بیگم کے پاس تحائف سے مالا مال کر کے بھیجا تھا اور غالباً اشرفی بیگم کو قیمت بڑھانے کے لیے نواب بنّن علی جیسے صاحبِ ذوق ہی کا انتظار تھا۔ کوئی دس دن بعد، ایک رات وہ شوریدہ پشت، وہ کمینہ نواب سج دھج کر اپنے مصاحبین کی جلو میں اشرفی بیگم کے بالاخانے پر طلوع ہوا اس کے سر پر دستار بندھی ہوئی تھی اس نے مجھے دیکھا تو تلملا کر رہ گیا۔ میں نے حسبِ معمول اس رات پھر دل نشیں پر روپے کی برسات کی اور

دوسرے نوابین نے بھی اسے دل کھول کر نوازا۔ ببّن علی نے اپنے گلے کی مالا اتار کر دے دی۔ پھر میں نے اشرفی بیگم کو بلا کر پوچھا۔

"اب کیا ارادہ ہے اشرفی بیگم؟ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"دیکھیے ناخاں صاحب! بات چند دنوں میں لاکھوں روپے تک جا پہنچی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ بہرحال آپ کب تک تڑپاتی رہیں گی؟ ان لوگوں سے مجھے رقابت محسوس ہوتی ہے۔"

اشرفی نے ماہرانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ کما لینے دیجیے۔ آپ نے دیکھا بولی دس لاکھ سے اوپر پہنچ گئی ہے۔"

"جن لوگوں کے پاس پیسہ محنت کے بغیر آجاتا ہے، ان کے لیے دس لاکھ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔" میں نے چٹکی لی۔

"میری پیش کش کو اوّلیت حاصل ہے۔ میں نے سب سے پہلے بولی لگائی تھی۔ میں اس سے زیادہ دینے کو تیار ہوں۔"

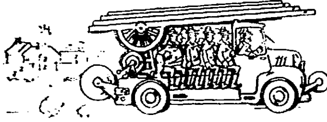
"آپ مجھے مہلت دیجیے۔" اشرفی بیگم نے درخواست کی۔

"آپ کی یہ مہلت تو میری حرکت قلب بند کر کے رہے گی۔"

ببّن علی نے اشرفی بیگم کو رازدارانہ انداز میں مجھ سے باتیں کرتے دیکھا تو منہ پھیر لیا۔ اشرفی بیگم میرے پاس سے اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ انکا بھی ببّن علی کے سر پر پہنچ گئی۔ ان کے درمیان دل نشیں کے سودے کی بات ہوئی اور ببّن علی نے اس سے زیادہ کی پیش کش کر دی۔

پھر یہی سلسلہ چلتا رہا اور ایک مہینے کی مدّت میں رقابت اور حسد کا ایسا زور بندھا کہ کئی چھوٹے موٹے نوابوں نے ادھر جانے سے توبہ کر لی۔ ببّن علی روز آتا اور روپے لٹا کر چلا جاتا۔ اس عرصے میں اسے اپنے چند گاؤں بیچنے پڑے، میں خاموش تماشائی بنا دلچسپ ترین تماشا دیکھ رہا تھا۔ یہ دنیا کا سب سے سنسنی خیز نیلام تھا۔ اشرفی بیگم لاکھوں میں کھیل رہی تھی۔ گاتے گاتے دل نشیں کا گلا بیٹھ جاتا تھا۔ وہ نوابین جو اپنے نام کی خاطر اپنی مونچھ اونچی رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے اور اپنے آپ کو داؤ پر لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے، وہ ایک خوبصورت دوشیزہ کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ کوئی تنگ دل بولی لگانے میں بخل سے کام لیتا تو میں انکا کو اس کے سر پر بھیج دیتا۔ اس میدان میں جیت اسی شخص کی ہونی تھی جو پیسے کے لحاظ سے سب سے طاقت ور ہو۔ مجھے دل نشیں کے حصول کی کوئی تمنا نہ تھی، میرا مقصد تو کچھ اور تھا۔ میں دن بھر انکا کے ذریعے روپے اکٹھا کرتا اور رات کو اشرفی بیگم کے بالا خانے پر برسا دیتا۔ اب اشرفی بیگم کے تیور بدل گئے تھے۔ وہ میری عزّت کرنے لگی تھی۔ اس کے ہاں کی دوسری لڑکیاں میرے سامنے بچھی بچھی جاتی تھیں۔ ایک لڑکی شمیم، جسے میں ایک رات گومتی کے کنارے لے گیا تھا مجھے بڑی حسرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی لیکن میں دانستہ دل نشیں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اشرفی بیگم کی ہوس روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور وہ جان بوجھ کر سودے کو طول دے رہی تھی۔ مجھے دو موسم گزارنے تھے تاکہ بدری نرائن کالی کے تحفّظ سے باہر نکل آئے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا اور دو ماہ گزر گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کتنی دولت صرف کی لیکن ببّن علی کو میں نے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اب اس کے پاس نقدی اور زیورات تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ پیسہ تیزی سے جا رہا تھا، کبھی وہ خود دیتا، کبھی انکا اس کے سر پر جا کر دولت لٹواتی۔ اس طرح وہ دوسرے امرا اور نوابین کے سامنے سرخ رُو ہوتا اور دوسرے دن اس کے گُن گے بڑھ چڑھ کر اس کے نام کے تذکرے کرتے، شہر میں ببّن علی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ دل نشیں ابھی تک اشرفی بیگم کے پاس تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ببّن علی سب کچھ لٹا بیٹھا۔ اب لے دے کے ایک حویلی رہ گئی تھی۔ وہ حویلی جس پر میری نظر تھی۔ آخر ایک دن میں منظر سے غائب ہو گیا اور دوسرے نوابین بھی رفتہ رفتہ رخصت ہو گئے۔ ببّن علی کو دل نشیں کی نتھ بہت مہنگی پڑی لیکن وہ ضد کا پکا اڑا رہا اور اشرفی بیگم نے اس کی حویلی کے عوض دل نشیں کا سودا کر دیا۔ اس کے سوا ببّن علی کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ ببّن علی کی حویلی اشرفی بیگم کے حوالے ہو گئی اور لوگوں نے دیکھا کہ ببّن علی نے آخری رات دل نشیں کے گداز جسم کی چھاؤں میں گزاری۔ دل نشیں کی یہ قیمت اسے سستی پڑی اس لیے کہ لوگوں نے بڑی بڑی بولیاں لگائی تھیں مگر وہ سب غائب ہو گئے تھے۔ اشرفی بیگم کی آنکھ میں پرانے تعلق کی وجہ سے بہرحال اتنی مروّت ضرور تھی کہ اس نے دل نشیں کو ببّن علی کے حوالے کر دیا۔ وہ رات آخری رات تھی۔ ایک ہفتے تک وہ اس مست ناز کے ساتھ سرمست رہا۔ پھر اگلے ہفتے اسے اشرفی بیگم کے غنڈوں نے حویلی سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک نواب کا حیرت انگیز زوال تھا۔ حویلی سے سامان نکلا جو بازاروں میں آیا اور ببّن علی نے اسے بیچ کر اپنے لیے کرائے





کا ایک مکان حاصل کیا۔ اُس کی دونوں بہنیں اور دو وفادار ملازم ساتھ تھے۔ وہ لکھنؤ کے ایک محلے میں منتقل ہو گئے۔ ببّن علی کی زندگی ہی میں اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں اشرفی بیگم کے ہاں جاتا اور اشرفی بیگم میرے سامنے اُس سے نظریں پھیر لیتی۔

میں ببّن علی کی داستانِ عبرت کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔ اس کی بہنیں درخشاں اور زرافشاں تو کوٹھے پر نہ بیٹھ سکیں لیکن میں نے ایسی صورت پیدا کر دی کہ خود ببّن علی اشرفی بیگم کے ہاں چلیں پھرنے لگا۔"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے تمام اعزا اس سے دور ہو گئے تھے۔ وہ ایک بدنام اور بے عزت شخص کی طرح سے ہر طرف مشہور ہو گیا تھا اور آخر اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ ببّن علی محض اشرفی بیگم کے بالاخانے کا ہو رہا۔ وہاں کسی مروّت اور قدیم تعلق کی رعایت کی امید میں جاتا تھا۔ وہ اپنے گھر واپس نہیں آنا چاہتا تھا۔ درخشاں اور زرافشاں کی حفاظت اس کے دونوں وفادار ملازم کر رہے تھے۔ ببّن علی مستقل طور پر اشرفی بیگم کی ڈیوڑھی پر ٹک گیا۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی تھی اسے اپنا ہوش نہیں رہتا تھا۔ مجرے کے دوران وہ ایک کم تر آدمی کی حیثیت سے الگ تھلگ بیٹھا رہتا اور ایک ایک کا منہ تکتا رہتا۔

زرافشاں اور درخشاں کو دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک دن میں ان کے مکان پر پہنچا۔ وہ ایک متوسط درجے کا مکان تھا۔ میں نے خود کو ببّن علی کا دوست ظاہر کیا لیکن مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ دروازے پر وہی شہزادہ نظر آیا جو ببّن علی کی حویلی میں ملا تھا۔ اس نے میرا راستہ روک دیا۔

"آپ یہاں بھی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ان لوگوں کو نگہبانی کی ضرورت تھی، ہم یہاں چلے آئے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"میں زرافشاں اور درخشاں کی مدد کرنا چاہتا ہوں مجھے اندر جانے دیجیے۔" میں نے کہا۔

"خوب! اب آپ ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں؟ بخدا اگر ہمیں روک نہ دیا جاتا تو ہم آپ کو دیکھ لیتے۔" اُس نے غصے میں کہا۔

"آپ کا مقصد کیا ہے؟" میں نے بھی تیور بدل لیا۔

"وقتی طور پر ہم مجبور ہو گئے تھے لیکن آپ اسے ہمیشہ کی مجبوری نہ سمجھیں۔" اس نے نخوت سے کہا۔

"شاید آپ کوئی معرکہ چاہتے ہیں۔" میں نے صاف گفتگو کی۔

"ہاں! لیکن اُس وقت جب ہمیں اس کی اجازت مل جائیگی آپ جا سکتے ہیں۔"

انکا نے پھر حسبِ سابق مجھے واپس چلنے کی تاکید کی۔ میں بھیر رہا تھا لیکن جب انکا ہی نے کچھ آگے کہنے سننے سے انکار کر دیا تو مجھے بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔ البتہ ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ شہزادہ جو مجھ سے سخت برافروختہ تھا اگر کوئی طاقت اسے روکے ہوئی تھی۔ وہ طاقت کون تھی؟ میں نے انکا سے دریافت کرنا چاہا۔ انکا نے موضوع بدلنے کی کوشش کی لیکن میرے دل میں اس کی یہ مزاحمت پھانس بن کر اٹک گئی۔ میں چلا آیا۔ یوں بھی ببّن علی کو اس عبرت ناک حالت میں دیکھ کر میری انتقامی شدّت میں خاصی کمی آگئی تھی بلکہ مجھے اس پر کسی قدر ترس آنے لگا تھا۔ ہاں زرافشاں اور درخشاں کو دیکھنے کی تمنا دل ہی میں رہ گئی۔ اب میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ اب مجھے صرف اشرفی بیگم سے نمٹنا تھا۔ اسے میں نے اب تک ڈھیل دے رکھی تھی۔ تین مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اسی طرح ایک موسم بھی گزر گیا اور سردیاں شروع ہو گئیں۔ دل نشیں سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آخر ایک رات اشرفی بیگم کے بالاخانے پر میں سارا حساب کتاب چکانے کی غرض سے پہنچا۔ رنگ جما ہوا تھا۔ ببّن علی ایک کونے میں وحشت زدہ سا بیٹھا تھا۔ میں نے اس پر حقارت کی ایک نظر ڈالی اور بیٹھ گیا۔ جب سب لوگ چھٹ گئے، دل نشیں گا چکی تو خورشید گا چکی تو فانوس ٹمٹمانے لگے۔ اشرفی بیگم کو یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ مجھ سے

اجازت مانگے۔ آخر میں نے اسے قریب بلایا اور سختی سے کہا: "اشرفی بیگم! اب تمھیں یہ پیشہ چھوڑ دینا چاہیے۔ گزشتہ دنوں تم نے بہت کما لیا۔ جانتی ہو یہ سب کچھ کس کی وجہ سے ہوا؟" میں نے رازداری سے پوچھا۔

"خاں صاحب! کمایا کیا خاک؟ ان لڑکیوں کی تربیت پر اتنا صرف ہو جاتا ہے کہ بچتا بچاتا کچھ نہیں ہے۔ مگر آپ یہ کیسے سمجھ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا؟ میں عرض کروں کہ یہ سب کچھ دل نشیں کے حسن کے سبب ممکن ہوا۔"

"بھول گئیں کہ ہم نے دل نشیں کی اوقات سے بڑھ کر اس کی بولی لگائی تھی؟ کیا گوشت پوست کے اس پنجر کی اتنی قیمت لگ سکتی تھی؟ لاکھ روپے، دس لاکھ روپے، لاکھوں روپے۔ اشرفی بیگم کبھی تم نے سنا ہے کہ دوشیزگی کی اتنی مہنگی قیمت ہوتی ہے؟ تمھیں نہیں معلوم یہ سب کچھ میں نے کیا تھا اور میں نے اپنے ایک بڑے مقصد سے کیا تھا۔ اب میں تم سے ایک چیز مانگ رہا ہوں، وہ مجھے دے دو۔ بتن علی کی حویلی کے کاغذات۔" میرے لہجے میں تندی و ترشی تھی۔

"مجھے معلوم تھا کہ اشرفی بیگم اب بے حد مغرور ہو گئی ہے۔ وہ اتنی دولت کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی! اس کا مزاج آسمان پر رہتا تھا پھر اس عرصے میں میری سادہ دلی سے اس کا وہ خوف بھی دور ہو گیا تھا جو شروع میں اسے مجھ سے تھا۔ وہ میرے متعلق مشہور ہونے والے افسانوں کو ایک وہم سمجھ رہی تھی اس لیے اس وقت میرے مطالبے پر وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ چیخ کر کہنے لگی: "ارے واہ آپ بھی کمال کرتے ہیں خانصاحب! آپ نے اپنا حق خوب جمایا خاں صاحب۔ آپ نشے میں تو نہیں ہیں؟"

"اشرفی بیگم! میں جس حالت میں ہوں اس کا اندازہ تمھیں ہو جائے گا تم میرا مطالبہ پورا کر دو ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔ اس سے قبل کہ میں تم سے کچھ اور مطالبہ کروں اور تم سے وہ تمام نقدی اور زیورات طلب کروں جو تم نے حاصل کیے ہیں، بہتر ہے کہ تم خود سمجھ جاؤ۔" میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ بہک رہے ہیں خاں صاحب۔ ایسے لوگوں سے بنّے خاں نمٹتا ہے۔ میں آپ سے کہتی ہوں کہ آپ از راہِ کرم یہاں سے چلے جائیں، اشرفی بیگم کا بالاخانہ کوئی چڑیا گھر نہیں ہے جہاں بھانت بھانت کے جانور اپنی بولیاں بولیں۔" اشرفی بیگم نے بھی سختی سے جواب دیا۔

"تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ میں تمھاری موت بن کر آیا ہوں۔" میں نے مشتعل ہو کر کہا۔

سازندے اٹھ گئے تھے۔ صرف بنّے خاں طبلچی موجود تھا۔ بتن علی بھی ایک کونے میں سمٹا بیٹھا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ جب بات زیادہ گرم ہوئی اور تو تڑاخ تک نوبت پہنچی تو اشرفی بیگم نے سختی کے ساتھ مجھے بالا خانے سے نکل جانے کا حکم دیا۔

"اشرفی بیگم! میں آج کے بعد یہاں نہیں آؤں گا مگر آج میں تمھیں تمھارے گناہوں اور کمینگیوں کی سزا دینے آیا ہوں۔ آج میرے آنے کا مقصد وہ نہیں ہے جو روز ہوتا تھا۔"

"بنّے خاں!" اشرفی بیگم نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "جمیل احمد خاں شاید زیادہ بہک گئے ہیں۔ تمھیں انھیں راستہ دکھانے کی ضرورت پڑے گی۔"

بنّے خاں اشرفی بیگم کا پرانا نمک خوار تھا۔ بازارِ حسن میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ آدمی جسامت اور خصلت دونوں اعتبار سے خطرناک تھا۔ اشرفی بیگم کا حکم سنتے ہی وہ آستین چڑھاتا ہوا اٹھا اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بولا: "جمیل میاں عزت عزیز ہے تو چلتے پھرتے نظر آؤ بنّے خاں کی دشمنی مول لی تو لکھنؤ کی زمین تم پر تنگ ہو جائے گی۔ پھر یہاں کا آسمان بھی تم کو پناہ نہ دے سکے گا۔"

بنّے خاں کا تضحیک آمیز جملہ سن کر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ بنّے خاں کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس عرصے میں بتن علی کمرے سے کھسک گیا تھا۔ اشرفی بیگم نے کھکھار کر تھوکا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ میں ڈر کر جا رہا ہوں لیکن جب میں نے دروازہ بند کیا اور پلٹ کر ان دونوں پر نظر ڈالی تو اشرفی بیگم کو جھرجھری آگئی۔ البتہ بنّے خاں اس وقت بھی بگڑے ہوئے تیوروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے کہا: "تم نے دروازہ بند کر کے خود اپنے لیے راہِ فرار مسدود کر لی ہے جمیل احمد خاں۔" بنّے خاں نے کہا: "یہ آج تم پر منکشف ہو جائے گا۔"

بنّے خاں آگے بڑھنے لگا۔ وہاں اب تین نفر تھے۔ اشرفی بیگم اپنی جگہ کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ میرے لیے حالات پر قابو پانا کچھ مشکل نہ تھا۔ چناں چہ میں نے انگلی کو اشارہ کیا کہ وہ بنّے خاں کے سر پر پہنچے جب

حُسن کے نِکھار کے لیے

سَناکا

لیکوئڈ ٹائیلٹ سوپ

پاکستان میں پہلی بار



صِرف چند قطرے ......

نفیس، خوشبودار، سیال صابن کے صرف
چند قطرے نہانے کا لُطف دوبالا کر دیتے ہیں
تازگی، رعنائی، دِلکشی ———
خوُبیاں ہی خوُبیاں۔
سَناکا لکوئڈ ٹائیلٹ سوپ گِرتے ہوئے
بالوں کو روک دیتا ہے۔ جسم کی خشکی دُور کرنے
میں لاثانی ہے۔ بالوں کو نرم اور ملائم رکھتا ہے

تیار کردہ:

سَنا

کیمیکل کمپنی۔ کراچی

انکا میرے سر سے اتر گئی تو میں نے بنّے خاں کو مخاطب کر کے سرد آواز میں کہا۔ "بنّے خاں! مجھے معلوم ہے کہ تم کون ہو لیکن آج تمھارا واسطہ کسی اور سے پڑا ہے۔ میرے سلسلے میں تمھیں زحمت اٹھانی پڑے گی۔ بہتر ہے جہاں ہو وہیں رک جاؤ اور اپنی اوقات نہ بھولو۔"

بنّے خاں جو اس وقت انکا کی پُراسرار قوت کے زیر اثر تھا، میرا حکم پاتے ہی رک گیا اور اس کا رویہ اچانک بدل گیا۔ اشرفی بیگم نے اسے رکتے دیکھا تو چلا کر بولی "نمک حرام۔ تو ایک ٹھنٹے کی گیدڑ بھپکی سے رک گیا۔ آگے بڑھ اور اس کی انتڑیاں پیٹ سے نکال دے۔"

مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا چنانچہ میں نے دل ہی دل میں انکا سے رابطہ قائم کر کے اسے ضروری ہدایتیں دیں اور اس تماشے کا انتظار کرنے لگا جو کچھ دیر بعد شروع ہونے والا تھا۔

"ذلیل، نطفۂ ناتحقیق! کیا تو نے میرا حکم نہیں سنا؟" اشرفی بیگم نے جھلا کر بنّے خاں کو دوبارہ مخاطب کیا۔

بنّے خاں نے پلٹ کر کہا "خانم! تمھارے حکم پر میں پورے لکھنؤ کی انتڑیاں باہر نکال سکتا ہوں لیکن اس کے عوض تمھیں میرا منہ مانگا انعام دینا ہوگا۔"

"دوں گی حرام زادے دوں گی۔ تو ایک لاکھ بھی مانگے گا تو دوں گی لیکن شرط یہ ہے کہ آج تو اس ٹھنٹے کا صفایا کر دے۔" اشرفی بیگم غصّے سے سرتاپا لرز کر بولی۔

"اگر تم جان بھی مانگو گی تو بنّے خاں انکار نہیں کرے گا۔ خانم میں مدت سے تمھارا آرزو مند ہوں، بس وصال کا شربت درکار ہے۔ اپنے اس خادم خاص سے وعدہ کر لو۔"

"کمینے تیری یہ مجال؟" اشرفی بیگم آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے فرش پر رکھا ہوا اُگال دان اٹھا کر بنّے خاں کو مارنا چاہا لیکن اتنی مہلت نہ مل سکی۔ بنّے خاں نے ٹھوکر ماری اور اُگال دان اچھل کر دور جا پڑا۔ اشرفی بیگم نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن بنّے خاں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا اور تھپڑوں اور لاتوں سے اس کی تواضع کرنے لگا۔

بنّے خاں اشرفی بیگم کو فرش پر گرا کر رگید رہا تھا اور اشرفی بیگم اسے مغلظات سنا رہی تھی لیکن بنّے خاں گویا بہرا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے میں اشرفی بیگم کا جمپر درمیان سے چاک کر دیا اور اشرفی بیگم کا سینہ عریاں کر کے اس پر دانت جما دیے۔ اشرفی بیگم کی کربناک چیخیں آہن پوش کے بالاخانوں سے آنے والی موسیقی کی تیز آواز تلے دب کر رہ گئیں۔ بنّے خاں نے جب سر اٹھایا تو مجھے جھرجھری آگئی۔ وہ بڑا خونیں اور دہشت ناک منظر تھا۔ اشرفی بیگم کا سینہ لہولہان تھا۔ بنّے خاں نے بڑی بے دردی کے ساتھ اسے جگہ جگہ سے کاٹا تھا۔ بنّے خاں درندہ بن گیا تھا۔ وہ اسے نوچ رہا تھا بھنبھوڑ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر درندگی کا راج تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں اندر سے کوئی آ نہ جائے، میں تیزی سے لپک کر اندر گیا۔ اندر کے تمام کمرے دیکھ ڈالے لیکن سارے کمرے سنسان پڑے تھے۔ معاً مجھے پچھلے راستے کا خیال آیا۔ میں دوڑتا ہوا اس طرف گیا تو میرے شبہے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ لوگ بیرونی کمرے میں کھیلے جانے والا خونیں ڈراما دیکھ کر چپکے سے فرار ہو چکے تھے۔ بنّن علی بھی کہیں موجود نہ تھا۔ زیورات کی الماری کھلی پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے پچھلا دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی پھر باہر آگیا۔ اشرفی بیگم کے جسم پر نظر پڑی تو ایک لمحے کے لیے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اشرفی بیگم نیم عریاں حالت میں فرش پر بے دم پڑی تھی، اس کے سینے کے دونوں طرف کا گوشت غائب ہو چکا تھا۔ پیٹ درمیان سے چاک تھا۔ چہرہ لہولہان تھا۔ آنکھوں کے دونوں حلقوں سے خون ابل رہا تھا۔ گال پر جگہ جگہ خراشیں موجود تھیں۔ بنّے خاں اشرفی بیگم کے برابر چت پڑا تھا اور ایک خنجر دستے تک اس کے دل کے مقام پر پیوست نظر آرہا تھا۔ ابھی میں لرزہ خیز منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ انکا میرے سر پر آگئی اور پریشان کُن لہجے میں بولی "جمیل! گھر کے تمام افراد فرار ہو گئے ہیں۔ بنّن علی بھی حویلی کے کاغذات، نقدی اور زیورات لے کر فرار ہو گیا ہے۔ اب میرا اس کے سر پر جانا ضروری ہے۔ سازندے اس وقت قریبی پولیس چوکی پر اپنا بیان لکھوا رہے ہیں۔ پولیس چند منٹوں میں یہاں پہنچنے والی ہے۔ بنّن علی ابھی دور نہیں گیا ہو گا۔ میں اسے لے کر آتی ہوں۔"

"بنّن علی کو فوراً پکڑو ۔ وہ پچھلے راستے سے فرار ہو گیا ہے۔" میں انکا سے پریشانی سے کہا۔

"ہاں مجھے فوراً جانا چاہیے۔ میں بنّن علی کو واپس لاتی ہوں، ابھی لمحوں میں آجاؤں گی۔ تمھیں اسی وقت کسی طرح یہاں سے نکلنا ہے۔" انکا نے دوبارہ پریشانی کا احساس دلایا۔

میں نے کہا "تمھیں دیر نہیں لگنی چاہیے۔ فوراً آنا ہو گا۔"

"حالات سمجھنے کی کوشش کرو جمیل! کھیل یہاں شروع ہوا تھا،

اس کی اطلاع نیچے پہنچ گئی ہے۔ بتن علی پھر خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ میں جارہی ہوں۔ تم یہاں سے نکلنے اور فرار ہونے کی کوشش کرو۔"

انکا فوراً چلی گئی۔ میں نے جھری سے جھانک کر باہر کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر مجھے پسینہ آگیا کہ باہر ایک ہجوم جمع ہورہا تھا۔ لوگ دروازے پر جمع تھے۔ گویا ابھی ابھی پولیس پہنچنے والی ہوگی باہر نکلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا کہ اس وقت انکا کیوں چلی گئی لیکن بتن علی کا تعاقب بھی ضروری تھا۔ اب میرے لیے سارے راستے بند ہوچکے تھے۔ ہر چند کہ اشرفی بیگم کا قتل اور بنّے خاں کی خودکشی کے واقعات مجھے پھانسی کے تختے سے دور رکھنے کے لیے کافی تھے لیکن لڑکیوں اور سازندوں کا بیان مجھے پھنسوا سکتا تھا۔ بتن علی کا فرار بھی کام میں ڈال سکتا تھا۔ وہ موقع غنیمت سمجھ کر اپنا کام کر گیا تھا۔ میں عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔ میرے اردگرد خطرے کے دائرے تنگ ہوتے جارہے تھے۔

میں نے سوچا۔ فرار کے لیے کیوں نہ پچھلا راستہ آزمایا جائے۔ میں تیزی سے پلٹ کر پچھلے دروازے پر پہنچا تو وہاں بھی نیچے سے لوگوں کی چیخ پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ اشرفی بیگم کا بالاخانہ اب میرے لیے چوہے دان کی حیثیت رکھتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ میں دوبارہ اس کمرے میں پہنچا جہاں اشرفی بیگم اور بنّے خاں کی لاشیں ایک بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں۔ اس وقت نیچے ہزاروں کا مجمع موجود تھا۔ اگر میں انکا کے ذریعے نکل بھی جاتا تو بھی انصاف اور قانون کی ساری مشینری حرکت میں آجاتی۔ حالات نے بہت تیزی سے سنگین صورت حال اختیار کرلی تھی۔ انکا تو چلی گئی تھی لیکن مجھے اس عذاب میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہوتی تو میں کیا کرتا؟ کیا اتنے بڑے ہجوم میں دروازہ کھول کر باہر نکلنا آسان ہوتا۔ مجمع میں سے کس طرح میرا جسم نکلتا؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں؟ ابھی میں کسی آخری فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا کہ بیرونی سیڑھیوں پر متعدد قدموں کی آہٹیں ابھریں اور پھر کسی نے زور شور سے دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہوگئیں۔

"جمیل احمد خاں دروازہ کھول دو۔ ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔ پولیس چاروں طرف سے تمہیں گھیر چکی ہے۔" باہر سے کسی نے کرخت آواز میں کہا۔

میں پلٹ کر پچھلے دروازے پر پہنچا۔ جھری سے جھانک کر دیکھا تو اس طرف بھی مسلح پولیس کا ہجوم میری گھات میں تھا۔ نیچے تپتی گلی میں لاتعداد افراد اکٹھا تھے۔ کیا میں دروازہ کھول دوں؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ مگر اس طرح پولیس اور بیانات اور سزا کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ تو پھر میں کیا کروں؟ کیا میں خاموش رہوں یہاں مجھے خاموش رہنا چاہیے۔ انکا کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں پھر بیرونی کمرے میں آگیا۔ سامنے والے دروازے پر پھر ایک کرخت آواز ابھری۔ "جمیل احمد خاں! میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ دروازہ کھول دو، اور خود کو ہمارے حوالے کردو۔ اگر تم نے مقابلے کی کوشش کی تو بھون کر رکھ دیے جاؤ گے۔ میں تمہیں پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔"

میں نے انکا کو یاد کیا، کلدیپ کو یاد کیا، جگ دیو کو یاد کیا۔ پولیس کی ایک اور وارننگ مجھے مل گئی تھی اور پھر یکے بعد دیگرے اعلانات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ انکا ابھی تک غائب تھی۔ میں بہت پریشان تھا۔ سخت پریشان میں نے انکا کو آواز دی کہ وہ جہاں بھی ہو فوراً آجائے۔

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ بیرونی دروازہ چرچرانے لگا اور میری وحشت حد سے سوا ہوگئی۔ میں دوسرے کمرے میں چلا آیا اور میں نے اندر سے دروازہ بند کرلیا اور زور سے پھر انکا کو آواز دی۔ وہ بیرونی دروازہ توڑ کر اندر آگئے تھے۔ میں دوسرے کمرے میں بند ہوگیا تھا۔



جمیل احمد خاں پر آگے کیا گزری... کیا وہ اس طوفانِ بلاخیز سے بچ گئے؟ ۔ ان کی دلچسپ عبرت انگیز سرگزشت کے بقیہ واقعات آپ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ایک ہی دن میں رونما ہونے والے چند واقعات پر مبنی ایک کہانی ہے۔ یہ واقعات ٹیڈ برو نامی ایک صنعتی شہر میں پیش آئے تھے اور چونکہ یہ کہانی ادب کے مروجہ اور مسلمہ اصولوں سے ہٹ کر ہے اس لیے تمام جذباتی قارئین سے میری درخواست ہے کہ اسے نہ پڑھیں

جو اعلیٰ درجے کی کہانیاں پڑھنے کا فن جانتے ہیں، ان کے لیے ایک منفرد کہانی

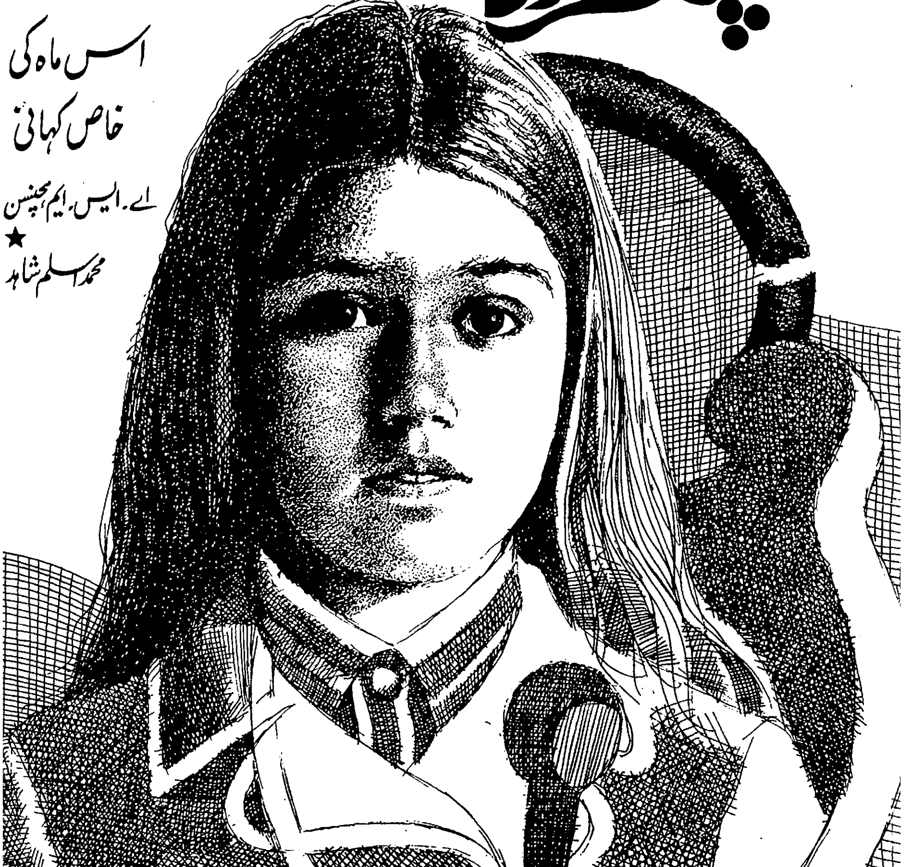
مصنف نے اس کہانی کا نام "ہڑتال توڑ" رکھا تھا

پتھگداز

۳ جنوری کی سہ پہر چار بج کر پانچ منٹ۔ ٹیڈ برو کے اسٹیشن پر ایک ہجوم لندن سے آنے والی ایکسپریس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس ہجوم میں عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے اور جوان سبھی شامل تھے اور ان کے بگڑے ہوتے تیوروں سے بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا تھا

اس ماہ کی
خاص کہانی

اے۔ ایس۔ ایم ہچنسن
★
محمد اسلم شاہد



کہ وہ سخت مشتعل ہیں ہجوم میں شامل لوگوں کا تعلق بیسٹ پیپر ملز سے تھا اور وہ لوگ آپس میں کسی مسئلے پر بڑے زور زور سے باتیں کر رہے تھے، پندرہ روز قبل بھی یہ لوگ اسی طرح یہاں اکٹھا ہوتے تھے مگر اس وقت ان کے چہروں پر اتنی تلخی نہیں تھی حتیٰ کہ ایک ہفتے قبل بھی ان کا موڈ اس قدر بگڑا ہوا نہیں تھا مگر آج تو ان کے تیور کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔

یہ تمام لوگ ہڑتالی مزدور تھے اور کئی دنوں کی مسلسل ہڑتال کی بنا پر اپنی اپنی جمع پونجی خرچ کر چکے تھے اور اب بالکل بھوکے پیٹ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ جب ہڑتال شروع ہوئی تھی تو وہ بڑے خوشگوار انداز میں ایک دوسرے سے اپنے مطالبات کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے مگر رفتہ رفتہ ان کے لہجے تبدیل ہوتے چلے گئے۔

آج جس وقت وہ اسٹیشن کے قریب مختلف دکانوں کے سامنے سے گزر رہے تھے تو دکان داروں نے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی جس کی وجہ سے وہ لوگ دکانیں بند کر کے ایک ڈیڑھ فرلانگ کی صورت میں مقامی پولیس اسٹیشن کی طرف جاتے ہوتے دیکھے گئے تھے۔

ہڑتالی مزدور پہلے کچھ کچھ خوش دکھائی دے رہے تھے پھر فکرمند ہوتے اور پھر مشتعل نظر آنے لگے۔ ان کے اشتعال کا سبب وہ ٹرین تھی جو چار بج کر پانچ منٹ پر پہنچنے والی تھی، اس میں مشہور و معروف ہڑتال توڑ شخص سینڈرس آ رہا تھا۔

امریکہ میں صنعت کاروں نے ایک صوبے کی ہڑتال کا زور توڑنے کے لیے دوسرے صوبوں کے مزدوروں کو کام پر لگانے کا کامیاب تجربہ کیا تھا مگر انگلستان میں یہ کوشش ناکام رہی تھی پھر بھی سینڈرس کا خیال تھا کہ انگلستان میں بھی یہ تجربہ کامیاب بنایا جا سکتا ہے اس کا یہ دعوا اخبارات نے خاصا اچھالا تھا۔ پھر بیسٹ پیپر ملز میں ہونے والی طویل ہڑتال کی خبر پڑھ کر سینڈرس نے مل کے مالک ہنری بیسٹ سے رابطہ قائم کیا تھا اور انھیں اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

بیسٹ ایک ضدی اور خود غرض آدمی تھا وہ کسی کی رائے یا مشورہ سننے کا عادی نہیں تھا، ہمیشہ اپنی باتیں منوانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عموماً لوگ اور خاص طور پر اس کے ملازمین اس سے ہمیشہ ناراض رہتے تھے، اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ چند رشتے دار ضرور تھے لیکن انھوں نے اس سے قطع تعلق کر رکھا تھا۔ بیسٹ کو اپنے متعلق لوگوں کی ناراضی اور مخالفت کا بخوبی اندازہ تھا اور وہ انھیں نیچا دکھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسی لیے اس نے سینڈرس کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے دی تھی۔

سینڈرس نے اخبارات میں اپنی روانگی اور مقاصد کا فخریہ طور پر اعلان کیا تھا۔ اسٹیشن مشتعل لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ سینڈرس کی ٹانگیں، ہاتھ اور کھوپڑی توڑنے کی فکر میں تھے، ان کے ہاتھوں میں پتھر تھے اور لاٹھیاں تھیں اور وہ بار بار اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔ ... اچانک دور سے ریل گاڑی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر چند لمحوں میں ٹرین پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ سہمے ہوئے مسافروں نے ایک زبردست مشتعل ہجوم دیکھ کر اپنی اپنی کھڑکیاں بند کر لیں، ہڑتالی رہنماؤں نے ایک ایک ڈبے کی تلاشی لی ... پہلے درجے کے ڈبے دیکھے گئے اور پھر دوسرے درجے کے ڈبے، مگر ان کے شکار کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

"سینڈرس کو ہمارے حوالے کرو! سینڈرس ہمارا دشمن ہے۔"

پورا اسٹیشن اشتعال انگیز نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اس ہنگامے میں کئی لوگ آپس میں گتھم گتھا بھی ہو گئے مگر سینڈرس کا کسی کو پتہ نہ چل سکا۔

"کہاں ہے وہ؟ اسے باہر پھینکو، جانے نہ پائے۔"

ان زوردار نعروں کی آواز سینڈرس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی اور جب ٹرین اسٹیشن میں داخل ہونے والی تھی تو اس نے ہجوم کی جنونی کیفیت دیکھ بھی لی تھی چنانچہ وہ خاموشی کے ساتھ سب سے آخری ڈبے کی طرف چل دیا تھا اور اپنی روایتی چالاکی کام میں لاتے ہوتے وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر وہاں کھڑی ہوئی دوسری ٹرینوں کی آڑ لیتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا تھا ویسے بھی اسے اس ہنگامے کی اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی، ٹیڈ برو سے چالیس میل دور جب گاڑی ایک جنکشن پر کھڑی تھی تو کسی شخص نے اسے ایک ضروری تار لا کر دیا تھا۔ یہ تار ٹیڈبرو کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بھیجا تھا کہ "اسٹیشن پر مشتعل ہجوم تمھارا منتظر ہے۔ تمھیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ آخری ڈبے سے دوسری طرف نکل جانا۔"

سینڈرس کا کام ہی خطرات سے کھیلنا تھا اور وہ عام آدمی کی نسبت خطرہ سب سے پہلے بھانپ بھی لیتا تھا چنانچہ ٹرین رکنے سے پہلے ہی وہ بحفاظت کہیں کا کہیں نکل چکا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں چلتی رہیں اور ہجوم مایوسی اور اضطراب کے

عالم میں بکھرنے لگا۔

"بیسٹ کے گھر چلو، بیسٹ کے گھر چلو۔"

چند لوگوں نے نعرے بلند کیے اور پھر ہجوم جلوس کی شکل میں بیسٹ کے گھر کی طرف جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ بیسٹ چھ بجے شام کو مزدوروں کے ایک وفد سے ملاقات کرنے والا تھا مگر یہ سن کر مزدوروں کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا کہ مسٹر بیسٹ اس وفد کی ملاقات سے پہلے سینڈرس سے ملاقات کریں گے۔ چنانچہ بہت جلد لوگوں میں یہ خبر گرم ہو گئی کہ سینڈرس شہر میں پہنچ چکا ہے گویا وہ پہلے ہی وار میں مزدوروں کو چل دیتے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جلوس نے طے کیا کہ چھ بجے کے مذاکرات کا نتیجہ فوری طور پر سننے کے لیے ضروری ہے کہ تمام مزدور مسٹر بیسٹ کی کوٹھی کے قریب ہی جمع رہیں۔ چنانچہ جلوس اس طرف روانہ ہو گیا اور اسٹیشن تقریباً ویران ہو گیا۔ اب اسٹیشن پر صرف ایک چھوٹی سی معصوم اور خوبصورت لڑکی رہ گئی تھی۔ لڑکی ایک بکس اور بڑا سا بستر لیے بڑے اعتماد سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک قلی کی نظر اس پر پڑی تو وہ آگے بڑھا۔ "کہیے میں کیا آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

"شام بخیر قلی!" لڑکی نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "براہِ مہربانی مجھے کوئی اچھی سی ٹیکسی دلوا دو۔"

"قلی لڑکی کے بے باکانہ انداز پر مسکرا رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ "ٹیکسی بہت اچھی ہونی چاہیے کیونکہ میں لندن سے آ رہی ہوں۔۔۔ وہاں لاکھوں کی تعداد میں ایک سے ایک اچھی ٹیکسیاں چلتی ہیں۔"

"کیا واقعی؟" قلی نے اُسے خوش کرنے کے لیے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بھئی لاکھوں۔" لڑکی نے کہا۔ "کیا تم کبھی لندن گئے ہو؟"

قلی نے نفی میں سر ہلایا!

"پھر تو تمہیں ضرور اپنے اسٹیشن ماسٹر سے چھٹی لے کر لندن کی سیر کرنی چاہیے۔ وہ بہت اچھی جگہ ہے۔ خالہ وکٹوریا کہتی ہیں کہ لندن انگلستان کا تاج ہے!"

"کیا واقعی؟" قلی کو ننھی لڑکی کی گفتگو کا انداز بہت بھلا لگا۔

"ہاں۔۔۔۔ اور وہاں اتنا شور ہوتا ہے کہ بس۔"

قد میں وہ مشکل قلی کی کمر تک پہنچتی ہو گی مگر اپنی پُراعتماد شخصیت کی بنا پر وہ اس پر حاوی تھی۔ لڑکی نے کچھ اس انداز سے باہر جانے والے راستے کی طرف دیکھا جیسے جلد از جلد اپنی خواہش کی تکمیل چاہتی ہو۔ قلی نے پہلے اس کا بکس اُٹھایا اور پھر اس کا نازک سا ہاتھ بڑھا ہوا دیکھ کر اسے تھام لیا۔ لڑکی نے گویا اپنے اس عمل کی وضاحت ضروری سمجھی۔

"دراصل میری عمر صرف آٹھ برس ہے۔" اس نے کہا۔ "اور ریلوے اسٹیشن وغیرہ پر میں ہمیشہ اپنی والدہ کا ہاتھ پکڑ کر چلا کرتی تھی۔"

"تو کیا آج آپ کی والدہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں؟"

"اوہو۔۔۔ نہیں۔ میری پیاری والدہ تو فوت ہو چکی ہیں!"

قلی نے لڑکی کے چہرے پر بلا کا ضبط دیکھا لیکن خود اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"ہاں وہ خدا کے پاس چلی گئی ہیں!" لڑکی نے جیسے قلی کے تاثرات سمجھ لیے تھے اور اُسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا واقعی؟" قلی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر اُسے فوراً احساس ہوا کہ لڑکی کہیں اس کی حیرت کو چیلنج نہ سمجھ لے۔ چنانچہ اس نے مزید کسی بحث میں اُلجھنے سے بچنے کے لیے پوچھا۔ "آپ کہاں جائیں گی؟"

"میں اپنے پیارے ماموں ہنری سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"کیا آپ ان کا پورا نام بتا سکتی ہیں؟"

"ان کا پورا نام ہنری بیسٹ ہے اور وہ ہینی گرین کے قریب کورٹ ہاؤس میں رہتے ہیں۔"

قلی کے منہ سے بے اختیار سیٹی سی نکل گئی۔ وہ اپنی حیرت کے اظہار کے لیے فوری طور پر کوئی لفظ تلاش نہیں کر سکا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹیکسیوں کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک خوبصورت سی ٹیکسی کو اشارہ کیا اور لڑکی کا بکس ٹیکسی میں رکھتے ہوئے ڈرائیور کو پتہ بتایا۔ "کیوں مذاق کر رہے ہو یار؟" ڈرائیور نے ناگواری سے کہا۔

"ہاں بھئی عجیب اتفاق ہے۔ یہ لڑکی خود کو بیسٹ کی بھانجی قرار دے رہی ہے۔۔۔" قلی نے مذاقاً کہا۔ "تم نے دیکھا تھا اسٹیشن پر اس ہڑتال توڑ شخص سینڈرس کے لیے کتنا بڑا ہجوم جمع تھا۔۔۔" اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "کہیں بیسٹ نے اسی ہڑتال توڑ کو تو نہیں بُلایا ہے؟"

کورٹ ہاؤس کے گرد لوہے کی اونچی اونچی سلاخوں کا جنگلا بنا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی دروازے کے سامنے روکی اور پھر بکس اُتار کر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اس دوران میں لڑکی نے اپنے بستے میں سے پیسے نکال کر ڈرائیور کے حوالے کر دیے۔ کچھ دیر بعد ایک طویل قامت شخص باہر نکلا اور لڑکی کی طرف توجہ دیے بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لڑکی

اخلاقاً کھنکھاری۔ وہ شخص اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "میں اپنے پیارے ماموں کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوں۔"

"کیا آپ کی مراد مسٹر بیسٹ سے ہے؟"

"جی ہاں!" اس دوران میں وہ دہلیز کے پائدان سے اپنے جوتے صاف کرتی رہی۔

"میرا مطلب ہے.... کیا پیارے ماموں سے آپ کی مراد مسٹر بیسٹ سے ہے؟" اس شخص نے دوبارہ پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا؟ پیارے ماموں سے مراد ماموں ہارنس یا ماموں ولیم نہیں ہو سکتے کیونکہ لوگوں کی ماموں بیسٹ سے بول چال بند ہے اس لیے یہاں ان کی موجودگی تو ممکن ہی نہیں ہے۔"

"خیر مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں.... ویسے میں مسٹر بیسٹ کو آپ کا نام کیا بتاؤں؟"

"لوسی!" لڑکی نے کہا اور فوراً پوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟"

"کلگس، محترمہ" اس شخص نے لڑکی کے برجستہ سوال کے جواب میں حیرت سے کہا اور پھر لڑکی کو مطمئن دیکھ کر وہ ایک راہداری سے گزرتا ہوا ایک بند دروازے پر پہنچا اور مخصوص انداز میں ہلکی سی دستک دی۔ غالباً یہ مسٹر بیسٹ کا کمرہ تھا۔

مسٹر بیسٹ ایک بڑی سی میز کے پیچھے رکھی ہوئی آرام دہ کرسی پر بیٹھے تھے اور چند کاغذات پر نظرِ ثانی کر رہے تھے۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں دنیا کے سبھی انسانوں سے سخت نفرت ہے۔ ان کی آنکھیں کسی سرد سنگِ مرمر کی طرح تھیں اور ان کے ہونٹ کچھ اس طرح بھنچے ہوئے تھے جیسے ان کی زبان پر کوئی چیز رکھی ہوئی ہو۔ انھوں نے کلگس کی طرف ایک نظر دیکھا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا، انھوں نے کہا "اگر وفد ملنے آیا ہے تو اس سے....."

"معاف کیجیے گا جناب" کلگس نے درمیان ہی میں کہا "دراصل وہ......"

اس سے قبل کہ اس کا جملہ مکمل ہوتا دفعتاً اسے پیچھے کی طرف پلٹنا پڑا کیونکہ کوئی چیز اس کی ٹانگوں کے درمیان سے اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "پیچھے ہٹیے بھئی.... میں اندر نہیں آ سکتی" لڑکی نے راستہ بناتے ہوئے کہا "شکریہ! کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ میں آپ کے بالکل پیچھے کھڑی ہوئی ہوں" اس نے مسٹر بیسٹ کی طرف دیکھا "کیا آپ ہی میرے پیارے ماموں بیسٹ ہیں؟"

"تم کون ہو؟" مسٹر بیسٹ نے اس انداز میں پوچھا جیسے وہ کسی چور اچکے سے مخاطب ہوں۔

"میں آپ کی ننھی بھانجی لوسی ہوں!"

"یعنی لوسی کی بیٹی...." مسٹر بیسٹ نے بظاہر بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا اور پھر کلگس کو باہر جانے کا اشارہ کیا "یہ کیا فضول حرکت ہے؟ تم کہاں سے آ رہی ہو اس وقت؟"

"لندن سے" میں آپ کے ساتھ رہنے کے لیے آئی ہوں" پھر بڑی معصومیت سے اس نے پوچھا "کیا آپ کے منہ میں کوئی کڑوی چیز ہے؟"

"تمھیں مناسب اور اچھے سوالات پوچھنے کی مکمل اجازت ہوگی مگر پہلے میرے سوال کا جواب دے دو۔"

"شکریہ، لیکن میں نے صرف اس لیے پوچھا تھا کہ میں بھی جب کوئی کڑوی دوا پیتی ہوں تو میری شکل بھی بالکل اسی طرح کی ہو جاتی ہے۔" لڑکی نے برجستہ کہا "آپ کا سوال کیا ہے؟"

"میرا سوال یہ تھا کہ یہ کیا فضول حرکت ہے؟ تم اکیلی کیوں آ گئیں؟ تمھاری امی کہاں ہیں؟"

"پیارے ماموں" لڑکی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "براہِ مہربانی آپ روئیے گا مت.... ہمت کریں میری پیاری امی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"لوسی مر گئی؟" بیسٹ نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"ہاں وہ خدا کے پاس چلی گئی ہیں" یہ کہہ کر اس نے ایک سرد آہ بھری "مجھے رونا نہیں چاہیے.....اور میں واقعی روئی نہیں ہوں، دیکھیے آپ میرا رومال چھو کر دیکھ سکتے ہیں، بالکل خشک ہے۔"

"وہ کب مریں؟" مسٹر بیسٹ نے لڑکی کی معصوم سی درخواست نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"منگل کو۔"

"وہاں کون کون موجود تھا؟"

"صرف میں!"

"انھیں کہاں دفن کیا گیا؟"

"کینسال گرین میں!"

"وہاں کون کون موجود تھا؟"

"صرف میں" یہ کہہ کر اس نے آنسو روکنے کی کوشش کی "میں نے محسوس کیا ہے کہ اگر میں ناک بند کر لیتی ہوں تو میرے آنسو رک

جانتے ہیں؟" یہ کہہ کر وہ اپنی ناک دبانے لگی۔

یہ موقع بلاشبہ بڑا ہی المناک اور جذباتی تھا مگر یہیں اس کہانی نے روایات توڑ ڈالی ہیں۔ بیسٹ کے رخساروں پر کوئی موٹا سا آنسو نہ بہا وہ بالکل چپ رہا۔ لوسی اس کی پسندیدہ اور محبوب بہن تھی کوئی اور ہوتا تو اس وقت شدتِ غم سے پگھل جاتا مگر نہیں بیسٹ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اس نے پلکیں تک نہیں جھپکائیں۔ بچپن ہی وہ لوسی سے بہت محبت رکھتا تھا۔ نوجوانی کے عالم میں بھی لوسی ہی اس کے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی مگر یہ تعلقات چالیس برس کے تلخ اور سخت وقفے کے نیچے دفن ہو کر رہ گئے تھے.... وہ تمام محبتیں خود غرضی کے دبیز آہنی پردوں کے پیچھے چھپ کر رہ گئی تھیں، لڑکی ابھی تک اپنی ناک دبا رہی تھی۔

"پیارے ماموں کیا میری آنکھوں میں ذرا سی بھی نمی ہے؟" لڑکی نے کہا۔ "اگر کچھ ہو گی تو وہ بھی صرف ناک دبانے سے پیدا ہو گئی ہو گی کیونکہ دیر تک ناک دبانے سے تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔"

"تم بالکل تنہا تھیں؟..... مگر تمہارے دوسرے ماموں کہاں تھے اور خالہ کہاں تھیں..... ان سے تو تم لوگوں کا رابطہ تھا..... وہ لوگ کہاں تھے؟"

"میری پیاری خالہ وکٹوریا اور دوسرے ماموں کے ہاں شادی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ انھیں بہت سخت افسوس ہے کہ وہ کسی معمولی وجہ کی بنا پر اپنے ہاں کی شادی ملتوی نہیں کر سکتے۔ امی ان دنوں بیمار تھیں، پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے کہا کہ شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اس لیے تقریب ملتوی ہونے کی گنجائش نہیں ہے....."

"بالکل، بالکل..... ان لوگوں سے یہی توقع کی جا سکتی ہے... میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں" مسٹر بیسٹ بڑبڑانے لگے۔ "میں انھیں اب بھی دیکھ سکتا ہوں اور ان کی ایک ایک بات سن سکتا ہوں!"

"کیا آپ واقعی انھیں دیکھ سکتے ہیں؟" لوسی بھی اسی طرف دیکھنے لگی جہاں اس کے ماموں دیکھ رہے تھے۔ مسٹر بیسٹ کو اپنی بھانجی کی اس حرکت پر بے ساختہ ہنسی آ گئی اور وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ ان قہقہوں کے نیچے کہیں ایک بہت اچھا انسان دبا ہوا تھا... وہ ہنستے رہے۔ "کاش..... ہاہاہا..... کاش میں بھی تم جیسا ہوتا، ہا ہا..."

ہی ہی ہی۔" پھر جیسے انھیں کوئی خیال آ گیا۔ "تم کہاں رہ رہی تھیں؟ اسی پرانی عمارت میں؟"

"جی ہاں اسی جگہ.... ہماری مکان مالکہ کی بیٹی نے پچھلے دنوں ایک رقص میں حصہ لیا تھا وہ چوتھی صف میں تھی، مکان مالکہ کا خیال تھا کہ اگر اس کی ٹانگیں اس کے ابا پر نہ گئی ہوتیں تو یقیناً وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح پہلی صف میں ہوتی!" لوسی نے اچانک کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "پیارے ماموں آپ کس پر گئے ہیں؟"

"بھئی تم اپنی والدہ پر گئی ہو..... اور میں بھی غالباً اپنی والدہ پر" اور یہ کہہ کر وہ دوبارہ زوردار قہقہے لگانے لگے لیکن اس وقت بھی وہ اپنی والدہ کے بارے میں نہیں بلکہ صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچ رہے تھے۔ انھوں نے لڑکی سے کہا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ ابھی ابھی جس وقت تم اس کمرے میں داخل ہوتی تھیں تو تمھارا یہاں ٹھیرنا اتنا ہی آسان اور ممکن تھا جتنا کلیگس کا سر کے بل کھڑے ہو جانا!"

"کیا وہ سر کے بل کھڑا ہو سکتا ہے؟" لوسی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تم اسی سے پوچھ لینا..... خیر..... لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تم یہاں ٹھیر رہی ہو تو پھر یقیناً بہت سی مشکلات بھی آڑے آئیں گی"

"ہاں یقیناً۔" لوسی کو جیسے پہلے ہی بہت سی مشکلات کا اندازہ ہو۔ "نہاتے ہوئے مجھے اپنی پیٹھ دھونے میں بڑی دقت پیش آتی ہے"

"ارے ہاں!" وہ پھر زور سے ہنسا۔ "مجھے اس خاص مشکل کا تو اندازہ تک نہیں تھا..... شاید ہم اس کا کوئی حل نکال سکیں۔"

"بس پیارے ماموں جان یہی ایک کام میں نہیں کر سکتی اس کے علاوہ میں اپنا ہر کام کر سکتی ہوں۔"

مسٹر بیسٹ عملی دشواریوں کے بارے میں نہیں سوچ رہے تھے کیونکہ بیسٹ پیپرز ملز کے مالک کی راہ میں کبھی عملی مشکلات حائل ہی نہیں ہوئی تھیں یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی آمدنی پر سپر ٹیکس ادا کرتے تھے۔ ان کی مشکلات کچھ اس شخص جیسی تھیں جو جانتا ہو کہ اسے صبح اٹھنا ہے اور صبح اٹھ کر اسے بے حد خوشی محسوس ہو گی مگر بس کیا کرے وہ خوش ہونے سے مجبور ہے۔ بلاشبہ بیسٹ کی خواہش تھی کہ وہ اس ننھی سی تر و تازہ کلی کو اپنے گھر میں رکھ لے..... مگر اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے اپنے روزمرہ کے معمولات سے دستبردار ہو کر روزانہ کچھ نہ کچھ وقت اس کے لیے

بھی نکالنا پڑتا۔۔۔ گزشتہ چالیس برس سے لوگ اس کے بارے میں ایک مخصوص انداز میں سوچنے لگے تھے اور بیسٹ کے اندر اس سوچ میں تغیر پیدا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

"تمہارے سبق تمھیں کون یاد کرائے گا؟" مسٹر بیسٹ اب بھی عملی دشواریوں کی نشان دہی میں مصروف تھے۔

"میری پیاری والدہ مجھے سبق پڑھایا کرتی تھیں" لڑکی نے کہا۔ "میں آپ کو دکھا سکتی ہوں۔۔۔۔ آپ مجھے سبق پڑھا سکتے ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرے پاس وہی کتابیں ہیں جن سے کبھی آپ میری امّی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ان کتابوں میں آپ کے ہاتھ سے لگے ہوئے نشانات بھی موجود ہیں۔۔۔۔ یہ دیکھیے" اس نے کتابیں نکال کر میز پر رکھ دیں "بکس میں جگہ نہیں تھی اس لیے مجھے بستہ باہر ہی رکھنا پڑا تھا۔۔۔۔ یہ دیکھیے یہ ہیں وہ کتابیں کچھ یاد آیا آپ کو؟"

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"یہ دیکھیے" لڑکی نے ایک کتاب اٹھا کر چند اوراق الٹے۔ "ان صفحات پر آپ نے اور امّی جان نے نشانات اور تاریخیں درج کی ہیں۔"

مسٹر بیسٹ کو فوراً یاد آ گیا کہ ان کی والدہ انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر پڑھایا کرتی تھیں، وہ بڑی دلچسپی سے اس بظاہر مضحکہ خیز کتاب کو دیکھ رہے تھے حالانکہ اب ان کا مطالعہ محض "ٹائمز" اور "فنانشل ٹائمز" تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

"امّی کہا کرتی تھیں کہ آپ دونوں کو کہانی کی یہ کتاب بہت پسند تھی مگر اس میں ایک نظم ہے جو آپ کو سخت ناپسند تھی اور کوشش کے باوجود آپ اسے یاد نہیں کر سکے تھے۔" اس نے کتاب کا وہ مخصوص صفحہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

اس صفحے پر نظم کے آگے تین تصویریں بنی ہوئی تھیں، پہلی تصویر میں ایک بچہ تتلی کے پیچھے دوڑ رہا تھا، دوسری میں ایک نوجوان راہگیر درخت پر بیٹھی ہوئی کسی چڑیا کو دیکھ رہا تھا اور تیسری تصویر میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص ایک بنچ پر کسی گہری سوچ میں غرق بیٹھا ہوا تھا۔ بیسٹ کو یہ تصویریں اچھی طرح یاد تھیں، اس نے نظم پر نظریں دوڑائیں۔

"اس نوعمر لڑکے پر جیل خانے کا اثر واضح ہوتا چلا گیا۔
مگر اسے اب بھی امید ہے اور وہ اسی کے سہارے زندہ ہے۔
نوجوانی کا سفر جاری ہے۔
اور راہ میں بہترین نظارے ہیں۔
مگر پھر اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیزیں مر رہی ہیں۔
اور دن رات میں بدل رہا ہے۔۔۔۔
اب وہ روشنیوں کے نظارے کہاں ہیں؟
کہاں ہیں اب وہ حسین خواب اور کامرانیاں؟"

مسٹر بیسٹ نے اپنے دل پر کوئی شدید سی چوٹ محسوس کی، اب اگر ہم یہاں ان کی اذیت کا ذکر تحریر کریں تو یہ کسی کے داخلی معاملات میں مداخلت کے مترادف ہوگا، وہ چالیس برس سے اس قفس میں بند ہیں تو کیوں نہ انھیں تنہا ان کے غم سے کھیلنے دیا جائے۔ ہم ان کے دکھ محض اس لیے کیوں لکھیں کہ قارئین اس سے محظوظ ہوں۔ مسٹر بیسٹ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

ننھی لڑکی بڑی دیر تک خاموشی سے انتظار کرتی رہی کہ وہ کوئی بات کریں، اس دوران میں وہ خود بھی خیالات کی دنیا میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہی۔

"کیا اب یہ نظم آپ کی سمجھ میں آ گئی ہے؟" اچانک اس نے پوچھا۔

"ہاں اچھی طرح" وہ لڑکی کی طرف مڑے "اب تم یہیں رہو گی میرے ساتھ، یہ بتاؤ کہ اس وقت سب سے پہلے تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ خوب جی بھر کے رونا چاہتی ہوں!"

مسٹر بیسٹ نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔۔ کہیں امّی جان تو برا نہیں مانیں گی؟"

"نہیں انھیں پتہ چل جائے گا کہ میں نے تمھیں رونے کی اجازت دے دی تھی!"

لڑکی کے چہرے کے تاثرات میں اچانک تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ جیسے زمین کا کوئی ساکت وجامد خطہ کسی آتش فشاں کے پھٹنے سے قبل حرکت میں آتا ہے۔۔۔۔ وہ لپک کر اپنے ماموں کے سینے سے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ بڑی دیر تک اسی طرح روتی رہی حتیٰ کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، مسٹر بیسٹ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے بخود انھوں نے اپنے آنسو بڑی دقت سے روکے ہوئے تھے۔۔۔۔ اور اس ضبط کی حالت میں خود ان میں کوئی زبردست تبدیلی رونما

ہورہی تھی.... یہ تبدیلی غالباً اسی وقت سے رونما ہونی شروع ہوگئی تھی جب وہ اس بچّی کی باتوں پر دل کھول کر ہنسے تھے، اب انھیں ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس بچّی نے ان کی آغوش میں پناہ نہیں لی تھی بلکہ وہ خود اس معصوم بچّی کی آغوش میں چھپنے کی کوشش کر رہے تھے.... ان کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات گردش کر رہے تھے، مگر خصوصیت سے وہ اس ہڑتال کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

"اب میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں!" انھوں نے سوچا۔ "مجھے اب یہ ادارہ کمپنی میں تبدیل کردینا چاہیے۔ اب مزدوروں کے نت نئے تقاضے اور مطالبات میری سمجھ میں نہیں آرہے ہیں.... میں تنگ آگیا ہوں ان ہڑتالوں سے!"

انھوں نے لڑکی کو اٹھا کر گود میں بٹھالیا اور اپنا رومال نکال کر اس کی آنکھیں خشک کیں۔ "اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟ ٹھیک ہونا؟؟"

اس نے بڑی سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

"اب میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ایک کام کردو.... کروگی نا؟"

اس نے دوبارہ اثبات میں سر ہلادیا۔

"باہر کمرے میں چند لوگ مجھ سے ملنے کے منتظر ہیں، وہ بڑی دیر سے بیٹھے ہیں، کیونکہ جب سے تم رو رہی ہو کلگیس دو تین بار اندر جھانک کر جاچکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ان لوگوں سے جاکر کچھ باتیں کہہ دو۔"

مسٹر بیسٹ نے اسے چند جملے رٹادیے۔

"کیا وہ میری بات سمجھ جائیں گے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اچھا تو پھر میں یہ باتیں ایک پرچے پر بھی لکھ دیتا ہوں۔"

بچّی پرچہ لے کر باہر نکلی تو وہاں دو عورتوں اور چار مردوں کو بڑے غیظ و غضب کے عالم میں دیکھا، وہ کھا جانے والی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے مگر ایک بچّی کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"میرے پیارے ماموں نے کہا ہے کہ آپ کے تمام مطالبات منظور ہوگئے ہیں!"

وفد کے اراکین اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں بھئی، یقین نہیں آتا تو یہ پرچہ پڑھ لیجیے!"

"آپ کے مطالبات منظور کیے جاتے ہیں، سب لوگ کل صبح چھ بجے فیکٹری میں پہنچ جائیں، کام شروع ہوجائے گا! تنخواہوں کا نیا اسکیل کل ہی سے نافذ ہوجائے گا۔" نیچے ہنری بیسٹ کے دستخط تھے۔

پرچہ پڑھنے والے مزدور نے اٹھ کر خوشی سے ایک زوردار نعرہ لگایا اور ایک عورت نے اٹھ کر بچّی کو سینے سے لگالیا اور بڑی دعائیں دینے لگی "خدا تمھیں سلامت رکھے! خدا تمھیں خوش رکھے۔"

